تاریخ نظم و نثر اردو

X

M

M. Azim.

تاریخِ نظم و نثرِ اُردو

یعنی

زبانِ اُردو کی مفصّل تاریخ اور اس کی عہد بعہد کی ترقیوں پر مفصّل بحث زمانۂ ماضی و
حال کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح عمری اور اُن کے کلام نظم و نثر پر
سیر حاصل ریویو

مؤلّفہ

آغا محمد باقر ایم۔اے، ایم۔او۔ایل، بی۔ٹی

ناشر

شیخ مُبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

سنہ ۱۹۴۴ء

پنجم تعداد ایک ہزار قیمت سے۳ر

تاریخ نظم اُردو

تاریخ نثر اُردو

(۲۰)

زبان اُردو کی خاص خوبیاں اور اس کے متعلق آراء

مُقدّمہ

میرے محترم شیخ مُبارک علی صاحب شمالی ہندوستان میں علوم مشرقی کی کتابوں کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے تاجر ہیں۔ وہ کتابوں کی تجارت محض تجارت کی غرض سے نہیں کرتے۔ بلکہ ان کو اچھی اچھی اور مفید کتابیں تصنیف و تالیف کرانے اور چھپوانے کا دلی شوق ہے۔ اور یقیناً ان کی تجارتی کامیابی کا راز اسی نیک نیّتی میں مضمر ہے۔ ان کا خاص احسان ادب اُردو پر یہ بھی ہے کہ انہوں نے خوبصورت لکھائی اور چھپائی کا عام مذاق پیدا کر دیا ہے۔

جب سے تاریخ ادب اُردو علوم مشرقیہ کے امتحانات کے نصاب میں داخل ہوئی تھی۔ شیخ صاحب اِس فکر میں تھے۔ کہ اس گراں قیمت اور ضخیم کتاب کی تلخیص کا کام کسی کے سپرد کر دیں۔ اتفاق سے انہی دنوں مَیں تعلیم سے فارغ ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ کام میرے سپرد کر دیا۔ شیخ صاحب موصوف کے احسانات مجھ پر اس قدر ہیں۔ کہ مَیں ان کے کام کو بجا لانا باعثِ سعادت سمجھتا ہوں، ورنہ شاید مَیں اتنی ضخیم کتاب کو اختصار سے لکھنے کے لئے کبھی تیار نہ ہوتا۔ پھر انہوں نے یہ سمجھا کر میری اور بھی ہمّت بندھائی کہ یہ کام کوئی ادنےٰ درجے کا کام نہیں ہے۔ بلکہ دُنیا کی مشہور اور ضخیم کتابوں کو بڑے بڑے مصنّفین نے اختصار سے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مُدّت سے مجھے یہ بھی خیال تھا کہ آبحیات پر جس بیدردی سے اعتراضات کئے جا رہے ہیں اُن کا تسلّی بخش جواب دینا مجھ پر فرض ہے۔ مَیں نے سوچا کہ اس کام میں مجھے ایک حد تک ان اعتراضات کے جواب دینے کا نہایت عمدہ موقع مِلجائیگا بہرحال مَیں نے شیخ صاحب سے وعدہ کر لیا کہ مَیں اس کام کو جلد کر دونگا۔

اتنی بڑی تاریخ کو تقریباً چوتھائی حصّے میں اس طرح قلمبند کرنا کہ کوئی ضروری تو کیا غیر ضروری چیز بھی چھُوٹنے نہ پائے اور اندازِ بیان بھی اِس قدر آسان رہے کہ ہر مشکل مسئلہ آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لئے اس کی تکمیل میں اندازے سے زیادہ تاخیر ہو گئی۔ میری لگاتار کوششوں سے آج

یہ کتاب ختم ہو گئی ہے۔ اور اب مَیں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں۔ کہ جس ارادے سے اِس کام کو شروع کیا گیا تھا وہ اُس سے بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا،

ہسٹری آف اُردو لٹریچر

یہ کتاب انگریزی میں ہے اور رام بابو سکسینا صاحب کی تصنیف ہے سکسینا صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی یوپی میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر سرفراز ہیں۔ سب سے پہلے تو یہی تعجب کی بات ہے کہ سکسینا صاحب کو اپنے منصبی فرائض کی بجا آوری اور دُنیاداری کے دھندوں سے اتنی فرصت کس طرح مل گئی کہ انہوں نے ایسی معرکۃ الآرا کتاب لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا۔ ان کی یہ تصنیف صاف ظاہر کرتی ہے کہ وہ ادب اُردو کے سچے دلدادہ ہیں اور اس کے حقیقی محسن کہلانے کے مستحق ہیں۔ تاریخ اُردو انگریزی میں نہ ہونے سے اُردو زبان کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔ اگرچہ ساری دُنیا اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ہندوستان میں اُردو ایک ایسی زبان ہے جس سے ہندوستان کے ہر گوشے میں کام چلایا جا سکتا ہے لیکن اُردو زبان کی تاریخ انگریزی میں نہ ہونے سے انگریزی جاننے والوں میں یہ خیال کسی قدر مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔ کہ اُردو کی نہ کوئی خاص تاریخ ہے اور نہ وہ علمی ادبی زبان ہے۔ الحمدللہ کہ سکسینا صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اس خیال کی تردید کی، اور زبان اُردو کے دامن پر سے یہ بدنما دھبہ دھو ڈالا۔ ایک ہندو بھائی کے اُردو کی تاریخ لکھنے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو سے ہندوؤں کو کس قدر لگاؤ ہے۔ تاریخ اُردو کو انگریزی میں لکھنے کا ایک مقصد یہ تھا۔ کہ آئی۔ سی۔ ایس وغیرہ کے طلبہ کو زبان انگریزی کی تاریخ انگریزی میں نئے اصولوں کے مطابق لکھی ہوئی مل جائے۔ اُردو زبان کے جاننے والوں کو سکسینا صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ اُنہوں نے اس ضرورت کو نہایت خوش اسلوبی اور کامیابی سے پورا کر دیا۔

سکسینا کی تاریخ اُردو اور دُوسرے تذکرے

۱۔ قدیم تذکروں میں محض انہی شعرا کے حالات ملتے ہیں۔ جو مصنفین کو آسانی سے میسّر آ گئے تھے۔ ان میں کچھ زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا گیا۔ مختصر حالات قلمبند کرنیکے بعد کلام کا نمونہ لکھ کر ان پر سطحی طور پر رائے زنی کر دی گئی ہے۔

۲۔ دُوسرے دَور کے تذکرہ نویسوں میں سب سے پہلے مولٰنا آزاد نے زبان اُردو کی عہد بعہد کی ترقیوں اور تبدیلیوں کو آبحیات میں زمانۂ حال کی طرز پر لکھا۔ اور گہری نظروں سے شاعروں کے کلام پر تنقیدیں کیں۔ مرزا محمد عسکری کے خیال کے مطابق "مولانا کی رنگین عبارت سے کتاب تو ایسی دلچسپ ہو گئی، کہ ایک دفعہ شروع کر کے بند کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن اِس اندازِ بیان سے کتاب کی مؤرخانہ حیثیت میں

فرق آگیا۔ بالفعل آبحیات سے بڑی بیدردی پر اعتراضات کئے جارہے ہیں۔ جو لازمی نتیجہ یا خمیازہ اس غلطی کا ہے۔ جو مُصنف مبرور نے رنگین عبارت اختیار کرنے میں کی تھی"

الحمد للہ کہ پنجاب یونیورسٹی نے تذکرہ میر قاسم مولانا آزاد کی لائبریری سے نکال کر اُردو کے قابل فخر محقق پروفیسر شیرانی صاحب کی نگرانی میں طبع کرادیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ مہتم بالشان تذکرہ ایسے فاسد خیالات کو حرفِ غلط کی طرح محو کردیگا۔ اور ایک دفعہ پھر آبحیات پہلی سی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ بلکہ اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے مولانا مرحوم کی صناعت کی اور بھی داد دینگے۔ کہ باوجود اتنی رنگین عبارت کے تاریخی واقعات میں کسی قسم کی کمی بیشی واقع نہیں ہوئی۔

آبحیات کے بعد عام طور پر جس قدر بھی تذکرے لکھے گئے ہیں۔ ان کا مُدّعا اصل میں آبحیات کی مخالفت تھا۔ اس کی وجہ چاہے کچھ ہی ہو۔ لیکن اِس قدر مخالفت کے باوجود آبحیات کا ہر شخص مدّاح رہا ہے ہم مختصراً اُن اعتراضات کا سطور ذیل میں اعادہ کرتے ہیں۔ جو عام طور پر آبحیات پر کئے جاتے ہیں:۔

(۱) نظم و نثر اُردو کی ابتدا بجائے دکن کے پنجاب میں ہوئی۔ (سیکسینا صاحب مولانا آزاد کے ہم خیال ہیں)۔

(۲) میر تقی پر غیر معمولی طور پر بددماغی کا الزام لگایا۔ اور ان کے تذکرۃ الشعرا پر بہت سخت تنقید کی۔

(۳) انشا کی آخری تین حالتوں کا جو نقشہ مولانا مرحوم نے کھینچا ہے۔ اس سے جزوی طور پر اختلاف ہے۔

(۴) اپنے اُستاد ذوق کو مرزا غالب پر ترجیح دی ہے۔

(۵) عبارت کو رنگین اور دلچسپ بنانے کے لئے واقعات میں بہت کچھ رنگ آمیزی کی گئی ہے۔

۳۔ تذکرہ نویسوں کے تیسرے دور میں لالہ سری رام دہلوی کا خمخانۂ جاوید چار ضخیم جلدوں میں محض نین منقولہ تک پہنچا ہے[۱]۔ فاضل مُصنّف نے اِس میں یہ التزام رکھا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ شاعر کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ کسی کے کلام پر گہری نظروں سے تنقید نہیں کی اچھے تو اچھے ہی ہیں۔ اُنھوں نے بُروں کو بھی بُرا نہیں کہا۔ بہرحال بعد کے تذکرہ نویس اس سے بہت کچھ حاصل کر چکے ہیں۔ اور کرتے رہیں گے۔ اس تذکرہ کو اگر شعرا کا قاموس اعظم یعنی انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

خمخانۂ جاوید کے ساتھ ہی تذکرہ گلِ رعنا۔ شعر الہند اور سیر المصنفین بھی قابل ذکر ہیں۔ گلِ رعنا میں

---

[۱] پانچویں جلد علامہ دتاتریہ کیفی نے حال ہی میں ترتیب دے کر شائع کی ہے۔

مولانا آزاد کی نام نہاد غلط بیانیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے - اور ناپسندیدہ طرز بیان کی بدولت اسکی حیثیت معاندانہ بن گئی ہے - اسی طرح شعر الہند کی ژولیدہ بیانی نے اس کو حدود معیّنہ سے باہر نکال دیا ہے - سیر المصنفین میں محض نثاروں کے حالات درج ہیں - گویا یہ سب تذکرے انفرادی حیثیت رکھتے ہیں -

سیکسینا صاحب کی تصنیف کی بڑی تحفگی یہ ہے کہ وہ انفرادی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ وہ ادب اُردو کے پورے موضوع پر حاوی ہے - حق یہ ہے کہ مُصنف موصوف نے بڑے گہرے اور وسیع مُطالعہ کے بعد اس کتاب پر قلم اُٹھایا ہے - اور ان تمام ضرورتوں کو بہت کامرانی کے ساتھ پورا کر دیا ہے - جو پہلے مختلف تذکرے الگ الگ پُوری کرتے ہیں - سیکسینا صاحب نے اکثر مواقع پر اپنی منصفانہ رائے کا نہایت بیباکی سے اظہار کیا ہے - اور ہر فیصلہ طلب معاملے کو گہری نظروں سے جانچا ہے -

خمخانۂ جاوید کے بعد غالباً یہ دوسرا تذکرۃ الشعرا ہے - جو ایک ہندو بھائی کے قلم سے نکلا ہے - علاوہ اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے یہ گرانقدر تصنیف انگریزی دان دُنیا پر یہ ثابت کرتی ہے کہ ہندوستان کی زندہ زبانوں میں صرف اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہندو مُسلمانوں کو یکساں محبوب و مرغوب ہے - یہ تذکرہ بالکل انگریزی ادبی تاریخوں کے انداز پر لکھا گیا ہے - ہر مضمون کو مختلف پیراگرافوں میں الگ الگ بیان کیا ہے - اور حاشیہ پر ان کے موضوع کے عنوانات قائم کر دیئے ہیں تاکہ ڈھونڈھنے والے کو ہر مبحث بہ آسانی مل جائے -

| سیکسینا کی تاریخ اُردو کا اُردو ترجمہ |

سیکسینا صاحب کی تاریخ انگریزی دان طبقے میں بے حد مقبول ہوئی لیکن وہ اُردو خوان جو انگریزی نہیں جانتے ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ کوئی قابل شخص اس کتاب کا انگریزی سے اُردو ترجمہ کرے - تاکہ وہ بھی اس جامع اور مانع کتاب سے مستفید ہوں - آخر کار مرزا محمد عسکری صاحب سابق میر مترجم گورنمنٹ آف انڈیا نے اس مشکل اور اہم کام کا بیڑا اُٹھایا - اور بہ نہایت کامیابی کے ساتھ یہ کام اختتام کو پہنچایا - واقعی یہ کام ان جیسے تجربہ کار مترجم اور ادب اُردو سے کماحقہٗ واقف شخص کا تھا - اس کتاب کو ترجمہ کرنے میں انہیں بہت سی دقتوں کا سامنا ہوا جن کا مختصراً ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے -

۱ - فاضل مترجم نے ترجمہ کرتے وقت ایسے بیانات کو اصل تذکروں سے مقابلہ کر کے درست کر دیا جو بار بار ترجمہ ہونے سے مشکوک ہو گئے تھے -

۲- جہاں کہیں ایک مضمون کا بار بار حوالہ آیا ہے۔ فاضل مترجم نے ہر بار اس کو نئے الفاظ میں بیان کیا تاکہ کتاب کی دلچسپی میں فرق نہ آئے۔

۳- جن حوالوں کو انگریزی میں کنایتاً بیان کیا گیا تھا۔ ترجمہ میں اس کو پوری وضاحت سے بیان کر دیا۔

۴- انگریزی کتاب میں انتخاب کلام نظر انداز کر دیا تھا اُردو میں اس کمی کو پورا کر دیا گیا۔

۵- تنقید و تبصرہ میں مسامحت اور ملائمت کی بہت گنجائش ہے۔ مترجم موصوف نے ہر مقام پر نہایت عجز، اور ملائمت سے کام لیکر حق تنقید ادا کیا۔

۶- بعض جگہ مُترجم اور مُصنف میں اختلاف الرائے تھا۔ مترجم نے اس اختلاف کو کتاب کے حاشیہ پر نہایت آزادی سے ظاہر کر دیا۔

۷- عبارت اس قدر سادہ اور سلیس ہے کہ معمولی استعداد کا طالب علم بھی اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اور لُطف یہ ہے کہ انداز بیان سے کوئی شخص یہ محسوس نہیں کر سکتا۔ کہ مَیں کسی کتاب کا ترجمہ پڑھ رہا ہوں۔

۸- آخر میں انگریزی کتابوں کی طرح انڈکس بھی شامل ہے جس کی مدد سے مذکورات کا بہ آسانی پتہ چل سکتا ہے۔

۹- شاعروں اور نثاروں کی تصویریں فراہم کر کے کتاب پڑھنے والے کی دلچسپی اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوتا ہے۔

اصل اور ترجمہ پر اعتراضات

۱- واقعات اور حادثات کے سنین کہیں ہجری میں ہیں کہیں عیسوی میں اور ایک آدھ جگہ سمت کا سنہ بھی ملتا ہے۔ اس خرابی سے پڑھنے والا وقت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔ افسوس ہے فاضل مترجم نے اس کمی کو پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں کی[۱]

۲- بعض جگہ سیکسینا صاحب کے بیانات میں اختلاف ہے۔ مثال کے طور پر میر تقی اور سرشار کے حالات کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔

۳- سیکسینا صاحب نے خود زیادہ تحقیق سے کام نہیں لیا۔ اکثر دُوسروں کے بیانات

---

[۱] تاریخ نظم و نثر اس عیب سے پاک ہے ۱۲

اپنی طرف سے نقل کر دیئے ہیں۔ اور جہاں کہیں خود دست اندازی کی ہے۔ اکثر وہاں ٹھوکر کھائی ہے میں نے قابل اعتراضات بیانات خاص طور پر سیکسینا صاحب کا نام لے کر نقل کئے ہیں۔ اور اگر ضرورت سمجھی ہے۔ تو ان کے جوابات بھی لکھ دیئے ہیں۔

۴۔ الفاظ بدل بدل کر واقعات کا اعادہ بہت کثرت سے کیا گیا ہے۔ یہ عیب زیادہ تر ترجمے میں آکر بڑھا ہے۔

۵۔ مُصنف نے ثابت کیا ہے۔ کہ اُردو کا اصل گہوارہ دکن ہے۔ اس کے ثبوت میں اُنھوں نے ۷۹۵ھ تک کی دکنی تصانیف کا حوالہ دیا ہے۔ شاید مترجم اور مُصنف صاحبان کی نظر سے پروفیسر شیرانی صاحب کی معرکۃ الآرا تصنیف "پنجاب میں اُردو" نہیں گزری۔ جس میں پروفیسر صاحب نے ۶۰۰ھ تک کی تصانیف اُردو دریافت کی ہیں۔ اور ثابت کیا ہے۔ کہ اُردو کا اصل مرکز پنجاب ہے۔

۶۔ بعض بیانات کے بیجا اعادہ اور آزاد ترجمہ سے کتاب بے حد ضخیم ہو گئی ہے۔

۹ فروری ۱۹۳۳ء دہلی

محمد باقر

(۱)

اُردو اور اس کی اصل

اُردو اُردو کو فارسی کی شاخ اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد فارسی دان حملہ آوروں کے لشکروں اور دار الخلافوں میں پڑی ہے۔ نیز اس میں فارسی الفاظ بکثرت ہیں۔ اور اس کی شاعری کی بحریں اور رسم الخط بھی فارسی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زبانِ اُردو اس بھاشا کی شاخ ہے جو اطراف دہلی میں بولی جاتی تھی۔ اور اس کا تعلق براہ راست شورسینی پراکرت سے تھا۔

زبان اُردو کی صرف و نحو۔ محاورات اور بکثرت ہندی الفاظ اس بات کی روشن دلیل ہیں کہ یہ زبان ہندی سے بنی ہے۔ میر امن اور قدیم اُردو نثاروں کی طرح یہ سمجھنا کہ اُردو ایک مخلوط زبان ہے صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے دار السلطنت اور اُردو یا لشکر سے زبانِ اُردو کے نشو و نما کو اسی قدر تعلق تھا کہ اس کا نام اُردو ہو گیا۔

چونکہ اُردو میں ہنوز پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے نئی زبانوں کی طرح اس میں اجنبی الفاظ و محاورات کو قبول کر لینے کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ چنانچہ فارسی کے نرم و ملائم الفاظ کو اس نے بآسانی جذب کر لیا۔

ہندستانی انگریزوں کی تقلید میں اُردو کو ہندستانی کہنا صحیح نہیں۔ کیونکہ اس نام میں مشرقی اور مغربی ہندی اور راجستانی زبانیں وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح برج بھاشا کو مولنا آزاد[لہ] کے خیال کے مطابق اُردو کا ماخذ قرار دینا بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔ برج بھاشا مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے۔ جو متھرا کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ اتفاق سے وہ دہلی کی بھاشا سے بہت مشابہت رکھتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے یہ غلط فہمی ہوئی۔

اُردو ہندی کا تعلق اُردو کا اصلی ماخذ وہ زبان ہے جو دِلّی کے اطراف میں بولی جاتی تھی۔ اس کو مغربی ہندی کی شاخ سمجھنا چاہئے اور مغربی ہندی شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی۔ بنگارو۔ برج بھاشا قنوجی اور وہ زبان جو دہلی کے اطراف میں رائج تھی۔ اس کی شاخیں ہیں۔ زمانہ حال کی اعلیٰ ہندی اُردو سے

لہ مولانا آزاد کا نظریہ قدیم زمانہ کی تحقیق پر مبنی ہے اور سکسینا بابو کی قیاس آرائی ہے ۱۲

اِس طرح پیدا ہوئی کہ فارسی الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت الفاظ رکھ دیئے گئے۔ گویا اُردو اور ہندی اپنے ماخذ اور نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہے۔ ان دونوں میں اگر کچھ فرق ہے تو نشو و نما کے طریقہ میں ہے۔ یعنی اُردو کو مسلمانوں نے پرورش کیا۔ اس لئے اس میں فارسی عربی الفاظ کی کثرت ہے اور ہندی ہندوؤں کے ہاتھوں میں پلی بڑھی۔ چنانچہ اس میں سنسکرت الفاظ بکثرت ہیں۔

زبان و ادب اُردو پر فارسی کا احسان

جوں جوں اُردو ادبی زبان بنتی گئی۔ اس میں فارسی، عربی اور ترکی الفاظ شامل ہوتے گئے فارسی الفاظ کو ان کی شیرینی کی وجہ سے مصنفین نے اختیار کیا۔ اور اپنی کتابوں کو اُنکی آمیزش سے جدت بخشی۔ اس کے ساتھ ہی فارسی رسم الخط بھی رائج ہو گیا۔ کیونکہ فارسی الفاظ ہندی خط میں آسانی اور صحت کے ساتھ نہیں لکھے جا سکتے تھے۔ اُردو شاعری فارسی شاعری کے قدم بقدم چلنے لگی۔ فارسی بحریں۔ مضامین طرز بیان۔ تخیلات تلمیحات۔ محاورات اور تمثیلات فارسی سے لے لی گئیں۔ نثر پر بھی ایسا ہی انقلاب گزرا۔ فارسی نثر جیسی عبارت کی رنگینی۔ الفاظ کا توازن اور قافیہ بندی کی اُردو نثر میں نقل ہونے لگی۔ الغرض فارسی زبان اُردو پر اس قدر غالب آگئی کہ اُردو کی ابتدائی خصوصیات کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

اُردو میں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی کثرت کے اسباب

چونکہ مسلمان بحیثیت فاتح ہندوستان میں آئے تھے۔ اس لئے انکی زبان (فارسی) درباری اور کاروباری زبان بن گئی۔ اور دیسی زبان خادمہ کی طرح اس کے محاورات اور طرزِ ادا کا تتبع کرنے لگی۔ فارسی کو جدید چیز سمجھ کر لوگوں نے نہایت شوق سے فارسی الفاظ اور محاورات سیکھنے شروع کئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی زبان محض دیہات میں باقی رہ گئی۔ دیکھ لیجئے قدیم ہندی شاعروں کے کلام میں بھی فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔ نیز دیسی زبان کی کم مائگی بھی اُردو کی ترقی کا باعث ہوئی فارسی کے نئے الفاظ اور نئے خیالات کو لفظ بہ لفظ قبول کرنا پڑا کیونکہ اب مسلمان برخلاف سابق ہندوستان پر مستقل طور پر حکومت کرنے کے لئے آئے تھے۔

جب دہلی پائے تخت قرار پایا تو اصل باشندوں اور نو وارد سپاہیوں میں میل جول پیدا ہوا اُنہوں نے ایک دُوسرے کو سمجھنے کے لئے ایک دُوسرے کی زبان کے الفاظ سیکھے۔ فاتح کا مفتوح پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اس لئے دیسی زبان میں فارسی الفاظ اور ترکیبیں بکثرت شامل ہو گئیں اور مسلمانوں کے اثر و رسوخ کے ساتھ ساتھ دیسی زبان پر فارسی کا اثر بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اکبر کے عہد میں راجہ ٹوڈرمل

وزیر مال کی تجویز سے حکم ہوا۔ کہ ہر سرکاری مُلازم کا فارسی جاننا ضروری ہے۔ اس حکم سے فارسی کا اثر اور بھی بڑھ گیا۔ لوگ باگ فارسی، عربی اور ترکی الفاظ شوق سے بولنے لگے۔ کیونکہ وہ خوش آہنگ اور زوردار ہوتے تھے۔ اور بولنے والے کی علمیّت کا پتہ دیتے تھے۔ نیز فارسی دانی کی بدولت سرکاری ملازمتیں بھی آسانی سے مل جاتی تھیں۔ اور تقرّبِ شاہی کا بھی موقعہ ملتا تھا۔

فارسی الفاظ کی کثرت کے اسباب

۱۔ فاتح مسلمان اپنے ساتھ بہت سی نئی چیزوں کے نام لائے جن کے لئے سنسکرت اور دیسی زبان میں الفاظ موجود نہ تھے۔ اِس لئے بجنسہٖ وہی لفظ زبان میں داخل ہو گئے۔

۲۔ فارسی فاتح قوم کی زبان ہونے کی وجہ سے دیسی زبان پر غالب آگئی۔

۳۔ فارسی کے شاندار اور شیریں الفاظ رزم و بزم اور حُسن و عشق کے افسانوں کیلئے قدرتاً زیادہ موزوں تھے۔ اِس لئے دیسی زبان خود بخود پیچھے ہٹ گئی۔

۴۔ فاتح اور مفتوح کا میل جول بڑھنے سے ایک ایسی مخلوط زبان پیدا ہو گئی جس میں فاتح قوم کی زبان کے الفاظ زیادہ تھے۔ کیونکہ مفتوح فاتح قوم کے الفاظ بول کر ان کو خوش کرنا چاہتے تھے۔

۵۔ اظہارِ قابلیت کے لئے فارسی الفاظ زیادہ بولے جاتے تھے۔

۶۔ اُردو ادب کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ اور شعرا اکثر و بیشتر فارسی دان تھے۔ اِس لئے اُردو ادب کی نشو و نما بالکل فارسی شاعری کی طرز پر ہوئی۔ اس طرح فارسی الفاظ محاورات اور ترکیبوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اُردو میں آگیا۔ ان اثرات سے اگرچہ اُردو ایک مستقل زبان بن گئی۔ لیکن وہ خوبیاں جن سے اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ تقریباً فنا ہو گئیں۔

یورپ کی زبانوں کا اُردو پر اثر

فارسی کی طرح یورپ کی زبانیں بھی اُردو پر خوب اثر انداز ہوئیں۔ خاص طور پر پُرتگالی اور انگریزی کا اثر بہت کافی پڑا۔ ڈچ اور فرانسیسی کے اثرات اب بہت کم باقی رہ گئے ہیں۔ ۱۵۴۰ء میں ہندوستان کی مشہور بندرگاہوں پر پُرتگالی قابض تھے۔ وہ اندرونِ ہند میں تجارت اور تبلیغ بھی کرتے تھے چنانچہ مرہٹی۔ بنگلہ۔ آسامی۔ اُڑیا اور اُردو پران کا خُوب اثر پڑا۔ پُرتگالی الفاظ اپنے مشکل تلفظ کی وجہ سے دیسی زبانوں میں اپنی اصلی حالت میں نہیں رہے۔ لیکن ویسے بکثرت موجود ہیں مثلاً بسکٹ۔ پپیتا۔ تمباکو۔ ترنج۔ چابی۔ گوبھی۔ الماری۔ ارغنون۔ بالٹی۔ بوتل۔ میز۔ تولیہ۔ پستول۔ پادری۔ گرجا۔ قمیص۔ سایہ۔ کاج۔ آیا۔ چھاپہ۔ نیلام۔ کمرہ۔ روپیہ۔ مستری وغیرہ۔

اسی طرح انگریزی کے بہت سے ایسے الفاظ کا اُردو میں اضافہ ہوا۔ جن کے لئے کوئی دوسرا لفظ اُردو کے پاس نہیں تھا۔ مثلاً لالٹین۔ لیمپ۔ انجن وغیرہ۔

نکتہ | اُردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ داخل اور خارج کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اُردو میں وہ الفاظ ضرور داخل کرنے چاہئیں جن کے بغیر گذارہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال رکھنا چاہئے کہ وہ اس سے میل کھائیں۔

نثر اور نظم کی زبان | ہر زبان کی نظم و نثر کی زبان میں کچھ فرق ہوا کرتا ہے۔ نظم میں متانت شان اور سنجیدگی پیدا کرنے کے لئے عام طور پر ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے جو بول چال میں آیا کرتے ہیں یہی سبب تھا کہ فارسی الفاظ اُردو نظم میں بکثرت شامل کر دیئے گئے۔ اسی طرح نثر بھی مقفےٰ پسند کی گئی جس میں بیحد تصنع تھا۔ لیکن غالب اور سرسید کے زمانے سے اس طرز نے پلٹا کھایا۔ مغربی تعلیم کے اثر سے پُرانا رنگ بدل گیا۔ اور بجائے رنگین اور مقفیٰ عبارت کے سادہ نثر پسند کی جانے لگی۔ کیونکہ عملی دُنیا میں سادے اور زوردار الفاظ کی ضرورت تھی۔ آجکل پیچیدہ فارسی بندشوں سے گریز کیا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی فارسی الفاظ بکثرت استعمال میں آتے ہیں۔ اکثر شعرا ہندی الفاظ شوق سے استعمال کرتے ہیں۔ مگر اسی حد تک کہ وہ فارسی الفاظ کے ساتھ میل کھائیں اور اجنبی معلوم نہ ہوں۔

سکسینا صاحب لکھتے ہیں کہ آجکل نظم میں عام طور پر لفاظی کی جگہ سادگی، بے تکلفی اور صفائی پسند کیجاتی ہے۔ ان کا مشورہ ہے کہ اہلِ ادب کو فارسی ترکیبوں اور بندشوں کی آمیزش کم کر دینی چاہئے۔

ادبی اُردو | تقریری زبان تحریری زبان سے کسی قدر مختلف ہے۔ جدت اور شان دکھانے کے لیئے لکھتے وقت سادہ فقرے فارسی ترکیبوں سے بدل جاتے ہیں۔ قاعدہ ہے زبان کے ابتدائی دور میں دُوسری زبانوں کے الفاظ اور بندشوں کو جاذب کر لینے کا مادہ موجود ہوتا ہے۔ یہی حالت اُردو کی تھی۔ اس لئے ہر زبان کے الفاظ اُردو میں داخل ہوگئے۔ دورِ اوّل کے شعرا کا کلام دیکھئے آدھی اُردو اور آدھی فارسی ہے لیکن آہستہ آہستہ یہی غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اُردو میں اس طرح مل گئیں کہ اب وہ ہماری زبان کا جزو ہیں اور ان کو نکالنا ایک عبث کوشش ہے۔

زبان اُردو کے قدیم نام | قدیم انگریز مؤرخوں نے اُردو کو لفظ "اندوستان" سے تعبیر کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے مصنفوں نے لاطینی زبان میں اس کو "لنگوا اندوستانی کا" لکھا ہے۔ اس سے پہلے انگریز مؤرخ اس کو مورز

کہتے تھے۔ جان گلکرسٹ نے ۱۷۸۷ء میں اُردو کو سب سے پہلے ہندستانی کہا۔ اور اسی وقت سے یہ لفظ رائج ہوا۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۶۱۶ء تک بعض قدیم کتابوں میں ہندوستان کی عام زبان کے لئے ہندستانی کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے۔ شاہجہان نے اس کو اُردوئے معلّٰی کا خطاب اُس وقت دیا جب وہ ادبی خدمات اچھی طرح انجام دے سکتی تھی۔ "ریختہ" (جس میں فارسی الفاظ بکثرت ہوں) بعد کے مصنفین نے کہا کہ ادبی زبان اور عام زبان میں امتیاز ہو سکے۔ ابتدا میں نظم کے لئے یہی لفظ استعمال ہوتا تھا۔ مگر میر اور مصحفی کے زمانہ سے اُردو کی جگہ ہندی کہنے لگے۔

اُردو کا رسم الخط اُردو کے حروف تہجی فارسی اور عربی کی طرز پر ہیں۔ البتہ ہندوستان کی مخصوص آوازوں کا ان میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ٹھ۔ ڈھ۔ ڑھ۔ ٹ۔ ڑ۔ ڈ۔

نظم اُردو نظم اُردو کا عروض فارسی اور عربی عروض کے تابع ہے۔ قدیم یونانی اور رومی شاعری کی طرح اُردو میں بھی حروف علّت کی آوازیں کھینچ کر پڑھی جاتی ہیں۔ اور اشباع کہلاتی ہیں۔ نظم میں ردیف اور قافیہ لازمی ہے۔ اُنیس بحریں مروّج ہیں۔ جن میں سے بعض میں ایسی ترمیم ہوئی ہے کہ بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔ وزن شعر کے لئے جو خاص ارکان قدما نے مقرر کئے تھے۔ ان کے تغیّر و تبدّل سے مختلف بحریں ایجاد کر لی گئی ہیں۔ تقطیع کے خاص قاعدے ہیں۔ جو حروف تحریر میں آتے ہیں۔ لیکن پڑھے نہیں جاتے وہ تقطیع میں شمار نہیں ہوتے۔ الف ممدودہ جب لفظ کے شروع میں آتا ہے۔ تو دو حروف کے برابر ہوتا ہے۔ اور اضافت جب کھینچ کے پڑھی جاتی ہے۔ تو ایک حرف کے برابر ہوتی ہے۔ جن الفاظ سے تقطیع کی جاتی ہے رکن کہلاتے ہیں، پورے شعر کو بیت اور نصف کو مصرعہ کہتے ہیں۔

نظم کی قسمیں (۱ و ۲) غزل اور قصیدہ۔ ان دونوں میں فرق صرف مضمون اور طول کا ہے۔ بحور اور قافیہ ردیف کی پابندی دونوں میں یکساں ہے۔ غزل کا رنگ عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے اور تعداد اشعار پانچ سے بارہ تک۔ قصیدہ میں عام طور پر مدح کا مضمون ہوتا ہے کبھی نصیحت آمیز اور فلسفیانہ رنگ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ تعداد اشعار کم از کم پچیس اور زیادہ سے زیادہ ایک سو ستر ہے لیکن اس کی پابندی کوئی نہیں کرتا قصیدے اور غزل کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص نظم کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔

(۳) قطعہ۔ اس کے لغوی معنے "ٹکڑا" ہیں۔ اسے قصیدے یا غزل کا ایک حصہ سمجھنا چاہیئے

تعداد اشعار کم از کم دو۔ اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ پہلے دو مصرعے بھی ہم قافیہ ہونے ضروری نہیں، لیکن قافیہ کی پابندی ضروری ہے۔ اس میں اکثر پند و نصائح کے مضمون مسلسل باندھتے اور مطلب پورا ختم کر دیتے ہیں۔

(۴) رُباعی۔ اس میں دو شعر یا دو بیتیں ہوتی ہیں۔ اسی لئے دو بیتی بھی کہتے ہیں۔ پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ اس کے ۲۲ وزن مقرر ہیں۔ مضمون کی کوئی تخصیص نہیں لیکن چوتھا مصرعہ زیادہ مؤثر اور زوردار ہونا چاہئے۔

(۵) مثنوی۔ رزم و بزم اور حسن و عشق کی داستانیں بیان کرنے کے لئے مخصوص ہے۔ ردیف ہو یا نہ ہو ہر شعر کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ اشعار کی تعداد محدود نہیں۔ اس کے لئے پانچ یا سات بحریں مخصوص ہیں۔

(۶) مستزاد۔ ہر مصرعہ کے بعد کچھ زاید الفاظ بڑھا دیتے ہیں۔ لیکن وہ اصلی مصرعہ کے آخری دو رکنوں کے ہم وزن ہوتے ہیں۔ زاید الفاظ کا قافیہ مختلف بھی ہو سکتا ہے۔

(۷و۸) ترجیع بند و ترکیب بند۔ ان میں بہت سے بند ہوتے ہیں۔ اور ہر بند میں برابر یا بعض وقت مختلف تعداد ہم قافیہ اشعار کی ہوتی ہے۔ ہر بند کے آخر میں ایک شعر ہوتا ہے جو اوپر کے بند کو نیچے کے بند سے جُدا کرتا ہے۔ دُوسرے بند کا قافیہ پہلے بند سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر ہر بند کے بعد ایک ہی شعر بار بار آئے تو نظم ترجیع بند کہلاتی ہے اور اگر یہ شعر بدلتا جائے۔ تو ترکیب بند بن جاتا ہے۔ ان دونوں قسموں میں تمام اشعار ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔

(۹) مربع۔ چو مصرعہ نظم کو کہتے ہیں۔ اس میں سب مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

(۱۰) مخمس۔ بجائے چار کے پانچ مصرعے ہوتے ہیں لیکن پانچویں مصرعے کا قافیہ بدل جاتا ہے۔

(۱۱) مسدس۔ پہلے چار مصرعے ہم قافیہ۔ باقی دو مصرعہ علیحدہ۔ ان کے علاوہ مسبع وغیرہ بھی اسی طرز کے ہوتے ہیں۔

(۱۲) واسوخت۔ اس میں عاشق اپنے معشوق کی بیوفائی ظلم و ستم۔ رقیب کے ساتھ بیجا ارتباط فراق کی مشکلیں بیان کرتا اور بار بار جتلاتا ہے کہ اس طرز تغافل سے تنگ آ کر میں علیحدگی اختیار کر لوں گا۔

(۱۳) تاریخ۔ کسی واقع کے اعداد سنہ حروف ابجد کے حساب سے نکالتے ہیں۔

(۱۴) **فرد**۔ کسی تمام یا ناتمام غزل کے کسی شعر کو کہہ سکتے ہیں جو کبھی مثالاً پیش کیا جاتا ہے۔
(۱۵) **کلیات**۔ مجموعہ نظم کو کہتے ہیں۔ اس میں قصاید۔ غزلیات۔ قطعات۔ رُباعیات۔ مثنویات وغیرہ بالترتیب درج ہوتی ہیں۔
(۱۶) **نعت**۔ اُس نظم کو کہتے ہیں جس میں پیغمبر اسلام کی تعریف کی جائے۔

نثر کی قسمیں نثر کی تین قسمیں ہیں[1]:۔

(۱) **عاری**۔ بالکل سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے۔
(۲) **مرجز**۔ اس میں بحر ہوتی ہے۔ مگر قافیہ نہیں ہوتا۔
(۳) **مسجع**۔ بحر نہیں ہوتی۔ مگر قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔

نثر مسجع کی تین قسمیں:۔

(۱) **متوازی**۔ دو فقروں کے آخری الفاظ ہم وزن اور ہم قافیہ لاتے ہیں۔
(۲) **مطرف**۔ آخری الفاظ کے ہموزن اور ہم قافیہ ہونے کی ضرورت نہیں۔
(۳) **متوازن**۔ الفاظ ہم وزن ہوتے ہیں۔ مگر ہم قافیہ نہیں ہوتے۔
(۴) **تذکرہ**۔ اس میں شعراء کے حالات بیان کئے جاتے ہیں۔
(۵) **گلدستہ**۔ مجموعہ نظم کو کہتے ہیں۔

(۲)

ادبِ اُردو کی ترقی کے ابتدائی دور

نظم کا نثر پر تقدم۔ اس کے وجوہ اور اس کا تعلق خاص ادبِ اُردو کے ساتھ تک بندی ایک فطری عطیہ ہے —— دُنیا کے تمام ادبوں کی ابتدا شاعری سے ہوئی ہے۔ جب تک فنِ تحریر وجود میں نہیں آیا۔ شعر کے ذریعہ واقعات وحادثات دماغ میں محفوظ رکھے جاتے تھے۔ غیر زبان کی تقلید نثر کی نسبت نظم میں زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اظہار جذبات کے لئے نظم زیادہ پسند کی جاتی ہے۔ ان وجوہ سے نظم کو نثر پر

[1] آجکل صرف نثر عاری پسند کی جاتی ہے۔ باقی اقسام متروک ہیں ۱۲

تقدم حاصل ہے۔

امیر خسرو اُردو کے پہلے شاعر ہیں اُردو شاعری کے ابتدائی دور میں امیر خسرو ایک درخشندہ ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اُردو الفاظ اشعار میں استعمال کئے۔ اُردو کی سب سے پہلی غزل انہی کی طرف منسوب ہے۔ انہوں نے ان گنت پہیلیاں کہ مکرنیاں، اور دو سخنے کہے۔

امیر خسرو سنہ ۱۲۵۳ء میں پٹیالی ضلع ایٹہ ممالک اودھ و آگرہ میں پیدا ہوئے۔ وہ غیاث الدین بلبن، معزالدین کیقباد وغیرہ کے درباروں میں معزز عہدوں پر سرفراز رہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ایسے عقیدتمند تھے کہ ان کے مرتے ہی تارک الدنیا ہو گئے اور چند روز بعد سنہ ۱۳۲۵ء میں خود بھی چل بسے۔ خسرو فن موسیقی کے زبردست ماہر تھے۔ خالق باری ان کی مشہور اور مقبولِ عام درسی کتاب ہے۔ امیر خسرو اُردو زبان کے سب سے پہلے شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ موجد اور مخترع کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔

اُردو کی پختگی کا زمانہ امیر خسرو کے زمانہ میں زبان میں پختگی نہیں آئی، البتہ روانی پیدا ہو گئی تھی۔ امیر خسرو سے لے کر شعرائے دکن تک تین صدیوں کا زمانہ ہے۔ اگرچہ زبان اُردو نے اس دور میں کوئی نمایاں ترقی نہیں کی۔ لیکن اپنے اغراض کو پورا کرنے کے لئے اس نے فارسی الفاظ کو نہایت فراخدلی سے جگہ دی۔ دیکھ لیجئے ملک محمد جائسی، کبیر اور تلسی داس کی تصانیف میں فارسی الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔

زیرِ عہد اکبری اکبر اعظم کی دلی تمنا تھی۔ کہ فاتح اور مفتوح شیر و شکر ہو جائیں۔ اظہارِ محبت کے لئے وہ اکثر ہندی میں بھی شعر کہتے۔ ان کے درباری شاعر سنسکرت کے اشعار کا فارسی میں ترجمہ کرتے فیضی، عبدالرحیم خان خاناں وغیرہ اکثر ہندی میں شعر کہتے۔ اسی دور میں راجہ ٹوڈرمل نے مسلمان افسروں کو ہندی اور ہندو حاکموں کو فارسی سیکھنے کا حکم جاری کیا۔ تاکہ محکمانہ کاروبار آسانی سے انجام پا سکیں۔

جس چیز کی ابتدا اکبر کے عہد میں ہوئی تھی۔ وہ شاہجہان کے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی گویا اس مبارک عہد میں زبانِ اُردو ادبی خدمات انجام دینے کے قابل ہو گئی۔

قدیم شعرائے دکن اور دربار شاہان گولکنڈہ و بیجاپور اگر امیر خسرو کا زمانہ زبان اُردو کے لئے صبح کاذب تھا۔ تو اس کی صبح صادق شاہان بیجاپور گولکنڈہ کے عہد میں ہوئی۔ یہ بادشاہ خود صاحبِ علم و فضل، اور اہلِ علم کے قدردان تھے۔ محمد قطب شاہ عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن دکھنی میں شعر کہتے تھے۔ اسی طرح بیجاپور کے بادشاہ عادل شاہ اول و ثانی اہلِ علم کے قدردان ہونے کے علاوہ خود بھی مُصنّف تھے۔ ان کی تصانیف زبان

و ادب کی تدریجی ترقی کی قابلِ قدر مثالیں ہیں۔

ولی دکھنی ۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء

ولی کے زمانہ میں اور بھی شاعر تھے۔ لیکن وہ ان کے سامنے چمک نہ سکے۔ ولی کو ریختہ کا موجد سمجھنا چاہیئے۔ انہوں نے اُردو شاعری کا سنگِ بُنیاد باقاعدہ طور پر رکھا۔ شمالی ہند کے شعرا نے ان کا کلام دیکھ کر اس کا تتبع کیا۔ ولی کا کلام نہایت سادہ اور صاف، پیچیدہ استعارات اور دُور از کار تشبیہوں سے پاک ہے۔ اس میں تصوف کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ فارسی الفاظ اور خیالات بکثرت ہیں۔ مگر ان کا غلبہ نہیں۔ ایسے ہندی الفاظ بھی موجود ہیں جو لبعد میں متروک ہو گئے۔

قدیم شعرائے دہلی حاتم۔ آبرو۔ آرزو

دہلی والوں کو شاعری سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اِس لئے مرکزِ شاعری دکن سے دہلی میں آگیا۔ یہاں کے شعرا ولی کا تتبع کرتے تھے۔ اب اُردو شاعری فارسی شاعری کے دوش بدوش چلنے لگی۔ اگرچہ زبان میں ابھی پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن لوگوں کے لئے شاعری بہترین مشغلہ بن گئی تھی۔ یہ قدیم شعرائے اُردو فارسی کے کُہنہ مشق شاعر تھے۔ اِس لئے اُردو شاعری فارسی شاعری کے نقشِ قدم پہ خود بخود چل رہی تھی۔

ولی کے پیرو

حاتم (۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء) خان آرزو (۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء) ناجی۔ مضمون۔ آبرو وغیرہ سب اُردو کے اجداد ہیں۔ ان لوگوں کا کلام تصوف میں ڈُوبا ہُوا۔ بہت صاف سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ نشستِ الفاظ میں بہت زور مارا ہے۔ فارسی الفاظ اور محاورات بکثرت ہیں۔ ولی کے کلام کی نسبت ہندی الفاظ بہت کم ہیں۔ ان کی جگہ فارسی الفاظ نے لے لی ہے۔ گویا نقشِ اوّل سے نقشِ ثانی ہر طرح بہتر ہے۔ فارسیت کا رنگ اور تصنع دکھنی شعرائے سے زیادہ ہے۔ کہیں کہیں ہندی دوہروں کا اثر بھی پایا جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں قدیم شعرائے دہلی کا کلام اُردو شاعری کی تدریجی ترقیوں کو نمایاں طور پر دکھلاتا ہے۔

میر و سودا کا زمانہ اس دور کی ترقیاں

یہ زمانہ اُردو شاعری کی سب سے بڑی ترقی کا زمانہ ہے۔ اس وقت اُردو شاعری زینتِ الفاظ اور جدتِ خیال سے آراستہ ہو کر دُنیا کے سامنے آئی۔ میر اور سودا اُردو شاعری کے اُستادِ اعظم مانے جاتے ہیں۔ یہ دونوں اُستاد اپنے ہم عصروں اور ماسبق حریفوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس دور میں غزل اور قصیدہ عروج پہ پہنچے۔

مظہر جانِ جاناں۔ درد۔ سوز۔ قائم۔ یقین۔ بیان۔ ہدایت۔ قدرت اور ضیا ان کے ہمعصر تھے۔

یہ لوگ فارسی نظم کے بھی اُستاد تھے۔ اُنھوں نے اُردو شاعری کو ہندی الفاظ سے پاک کیا۔ اور ان کے بدلے فارسی کے ہزاروں الفاظ اور محاورے بجنسہ یا ترجمہ کرکے اُردو میں داخل کئے۔ اسی زمانہ میں گُل و بُلبل اور قمری و شمشاد کے افسانے اُردو شاعری میں داخل ہوئے۔ فارسی سے نئی بحریں۔ نئی تشبیہیں۔ استعارے اور صنائع بدائع مستعار لئے۔ نئے نئے اصناف شعر مثلاً واسوخت مرثیہ مخمس۔ ہجو۔ مثلث مربع۔ مستزاد وغیرہ فارسی سے لے کر اُردو میں رائج کئے۔ جو اصناف سخن پہلے سے مروج تھیں۔ ان میں بھی ترقی ہوئی۔ صنعت ایہام پہلے بہت مقبول تھی۔ میر اور اُن کے بعد کے شعرا نے اس کو بہت کم استعمال کیا۔ اس زمانہ کے شعرا اصناف سخن کے موجد اور اُردو شاعری کو ترقی دینے والے ہیں۔ اسی دور میں زبان میں قوّت اور وسعت پیدا ہوئی اور نئے نئے الفاظ محاورے اور ترکیبیں زبان میں داخل ہوئیں۔

انشا اور مصحفی کا دور
زبان اور شاعری پر انکے احسان

اس دور میں اثر۔ میر حسن۔ جرأت۔ انشا۔ مصحفی۔ راسخ۔ بقا۔ حسرت۔ رنگین اور فراق مشہور ہیں۔ اُنھوں نے اُردو میں سے ہندی الفاظ کو خارج کرنے اور فارسی عربی الفاظ کو رائج کرنے کی کوشش برابر جاری رکھی۔ سکسینا صاحب کا خیال ہے کہ ہندی الفاظ ایک دم نکال دینے سے زبان کو سخت نقصان پہنچا۔ اس عہد میں وہ ہندی الفاظ بھی نکال دیئے گئے۔ جو میر اور سودا کے زمانہ میں باقی رہ گئے تھے۔ ان کی جگہ خوبصورت الفاظ اور محاورے زبان میں داخل کئے گئے۔ ہندی محاورے، فارسی ترکیبیں آپس میں ملا دی گئیں۔ مگر طرز وہی رہی۔ مضامین میں کوئی جدت پیدا نہیں کی۔ اس دور کی شاعری، اس زمانہ کی اخلاقی حالت اور دہلی کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا صحیح مرقع ہے۔ اسی دور میں "معاملہ بندی" کا رواج ہوا جس کے جرأت۔ انشا اور رنگین پیشرو تھے۔

ریختی

معاملہ بندی نے بعد میں ریختی کی صورت اختیار کرلی۔ ریختی عورتوں کی زبان کو کہتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار جذباتِ نفسانی اُبھارنے کے لئے کہے جاتے تھے۔ اسی لئے وہ زیادہ فحش ہوتے تھے۔ ریختی کی مثالیں ولی کے ہمعصروں کے کلام میں بھی ملتی ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے بعد میں یہ رنگ بالکل متروک ہوگیا۔ اس کو دوبارہ انشا اور ان کے دوست سعادت یار خاں رنگین نے زندہ کیا۔ سب سے بڑے ریختی گو میر یار علی خاں متخلص جان صاحب سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے اس کو ایک الگ فن قرار دیا۔ اور اسی رنگ میں عمر بھر شاعری کی۔ یہ صنف شاعری اب بالکل متروک ہوچکی ہے۔

اِس دَور کی خصوصیات اِس دَور کے شاعر غزل کے اُستاد تھے۔ مثنوی اور قصیدہ بھی خوب کہتے تھے۔ مشاعرے کثرت سے ہُوا کرتے تھے۔ اکثر شعرا دہلی چھوڑ کر لکھنؤ کے دربار میں چلے آتے تھے۔ کیونکہ وہاں شعرا کی بڑی قدر تھی۔ اسی عہد میں میر حسن اور میر درد کے بھائی میر اثر نے مثنویاں لکھیں جو اب تک قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ بالخصوص میر حسن کی شہرہ آفاق مثنوی سحر البیان کی روانی، رنگینی، سادگی اور شیریں بیانی کا جواب نہیں۔

غالب اور ذوق کا زمانہ اور اس کی خصوصیات اِس دَور کی ابتدا شاہ نصیر۔ ذوق۔ غالب۔ مومن اور ظفر سے ہوتی ہے۔ اِس عہد میں رہے سہے ہندی الفاظ بھی زبانِ اُردو سے خارج کر دیئے گئے۔ غالب اور مومن فارسی میں بھی خوب شعر کہتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے فارسیت کو عروج ہُوا۔ شاہ نصیر کو انشاؔ اور ذوق کے زمانے کی درمیانی کڑی سمجھنی چاہیئے۔ یہی زمانہ نظیر اکبر آبادی کا ہے۔ جن کا رنگ سب سے الگ اور نمایاں ہے۔ غالب و مومن کے ہاں فارسی کے مشکل الفاظ اور محاورات کی بھرمار ہے۔ زبان کے حق میں یہ بہت ہی اچھا ہُوا۔ کہ اس طرز نے رواج نہیں پایا۔ ورنہ اُردو اور فارسی میں بہت تھوڑا سا فرق رہ جاتا۔ اسی فارسیت سے مومن و غالب کا کلام مشکل بنگیا۔ سیکسینا صاحب کے نزدیک اُستاد ذوق ذہانت اور طباعی میں غالب سے کم ہیں۔ لیکن زبان محاورات اور تمثیلات میں ان کی قدرت مسلّم ہے۔ ظفر، ذوق اور غالب دونو کے شاگرد ہیں۔ لیکن ان کا کلام ذوق کے کلام سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ اسی لئے اکثر لوگ ظفر کے کلام کو ذوق کا کلام سمجھتے ہیں۔

اس زمانہ میں غزل اور قصیدے کو بہت ترقّی ہوئی۔ ذوق اور غالب کی غزلیں اور قصیدے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سنگلاخ زمینوں اور جدید بحروں میں اشعار کہے گئے۔ غیر مانوس ہندی الفاظ زبان سے نکال دیئے گئے۔ اور فارسی ترکیبیں داخل کر لی گئیں۔ خیالات میں جدّت اور مضامین میں نادرت پیدا ہوئی جس کا بہترین نمونہ غالب کے کلام کو سمجھنا چاہیئے۔

شعرائے لکھنؤ کا نیا دور اور اس کی خصوصیات ناسخ اور آتش کا زمانہ۔ اور ان کی خدمات زبان دہلی پر جب زوال آیا۔ تو اکثر اہل کمال لکھنؤ چلے گئے۔ ناسخ اور آتش کے زمانہ سے لکھنؤ میں شاعری کا ایک نیا دور شروع ہُوا۔ گویا دہلی کے شعرائے لکھنؤ میں شعر و شاعری کو ترقّی ہوئی۔ گھر گھر مشاعرے اور شاعری کے چرچے رہتے تھے۔ ان سے شاعری درجہ کمال کو پہنچی۔ زبان میں جدّتیں اور رنگینیاں پیدا ہوئیں،

پُرانے الفاظ، بندشیں اور ترکیبیں ترک کر دی گئیں۔

ناسخ اور آتش کا تعلق خاص لکھنؤ سے تھا۔ ناسخ کو متروکات کا ناسخ کہنا بالکل بجا ہے۔ اسی زمانہ سے شاندار الفاظ۔ عبارت میں تعقید و تکلف، صنائع و بدائع اور دُور از کار تشبیہوں اور استعاروں کی کثرت ہوئی۔ فضول مبالغے اور فرسودہ تشبیہیں رائج ہوئیں۔ جذبات اور اثر مفقود ہو گیا۔ اس خرابی کے باوجود اشعار مزے کے ہوتے اور سند قبول پاتے تھے۔ ناسخ کے علاوہ بحر۔ وزیر۔ صبا۔ سحر۔ رشک وغیرہ بھی اپنے وقت کے اُستاد تھے۔ آخر کار یہ رنگ ایک دفعہ پھر بدلا اور اشعار میں بے تکلفی۔ سادگی۔ سوز و گداز اور اصلیت پسند کی جانے لگی۔

آتش کا رنگ ناسخ سے بالکل الگ تھا۔ وہ غزل کے مسلّم الثبوت اُستاد مانے جاتے تھے۔ ان کی درسی تعلیم اور معلومات ناسخ سے کم کہی جاتی ہیں۔ مگر ان کا کلام ناسخ سے کہیں زیادہ شیریں اور مؤثر ہے۔ وہ اپنے خاص رنگ یعنی شُستگیٔ الفاظ، چُستیٔ بندش اور بلندیٔ مضامین میں قدما کے پیرو تھے۔ ان کے اشعار اثر اور سوز میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ شاید کم علمی نے ان کے کلام میں سوز و گداز پیدا کیا تھا۔ صفائی زبان پر بھی ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ لیکن ہم ناسخ کے زیادہ ممنون ہیں۔ ان دونوں باکمالوں میں اکثر مقابلے رہا کرتے تھے۔ یہ مقابلے زبان کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔

مراثی اور ان کا تعلق زبان کے ساتھ

مرثیہ ایک بہت پُرانی صنف سخن ہے۔ یہ صنعت عرب سے فارس پہنچی۔ اور وہاں سے ہمارے ہاں آئی۔ لیکن ہمارے قدما اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ حقیقتاً میر خلیق اور ان کے فرزند میر انیس اور میر انیس کے ہمعصر مرزا دبیر نے اس صنف کو زندہ کیا۔ قدیم شعرائے دکن نے بھی مرثیے لکھے ہیں۔ لیکن ان کی زبان بالکل ابتدائی رنگ کی ہے۔ مرثیہ گوئی کو لکھنؤ میں اس لئے عروج ہوا۔ کہ وہاں کے اُمرا اکثر شیعہ تھے۔ خود بادشاہ بھی مرثیہ لکھتے اور مجلسوں میں سُناتے تھے۔

میر انیس اور دبیر کا کلام نہایت مؤثر اور نیچرل ہے۔ اور نیچرل شاعری کا پرتو اس میں موجود ہے۔ ان کے کلام میں اخلاقی تعلیم ہے۔ قصاید کی طرح بیکار الفاظی اور دُور از کار مبالغے نہیں ہیں۔ ہر شعر میں فطری مناظر اور قلبی جذبات کی سچی تصویریں ہیں۔ حقیقتاً میر انیس کے مرثیوں نے اُردو شاعری کا ایک نیا دَور قائم کر دیا ہے۔

مابعد کے شعرا امیر و داغ کا زمانہ

واجد علی شاہ کی معزولی اور غدر دہلی کے بعد امیر۔ داغ۔ جلال اور تسلیم جیسے نامور شعرا اپنا وطن چھوڑ کر حیدر آباد دکن، رامپور اور دُوسری اسلامی ریاستوں میں چلے گئے۔ یہ لوگ قدما کا تتبع

کرتے تھے۔ ان کا اپنا کوئی خاص رنگ نہ تھا۔ درباروں اور محلوں میں مشاعرے ہوتے اور یہ لوگ وہاں بلبلوں کی طرح چہچہاتے تھے۔ غزلیں۔ قصیدے، قطعے اور رُباعیاں اس زمانے میں عام طور پر کہی جاتی تھیں۔

امیر مینائی اپنے پیشروؤں کے مقلد تھے۔ لیکن ان کا کلام زمانہ گذشتہ کی بے اعتدالیوں سے پاک ہے۔

داغ کا کلام بے ساختہ اور روزمرّہ کے مطابق ہے۔ مگر عام طور پر متانت اور بلندیٔ مضامین سے محروم۔

جلال کا کوئی خاص رنگ نہیں وہ قدما کے پیرو ہیں۔ عروض اور صحّت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

جدید رنگ
آزاد اور حالی کا زمانہ
انکی خدمات ادب و زبان

زمانہ حال میں نظم اُردو نے ایک نیا رنگ اختیار کیا جس کے موجد آزاد ہیں۔ اور سرور اور حالی ان کے خاص مددگار۔ اسی دور میں نئے مضامین نئی طرز سے زبان میں داخل ہوئے۔ پُرانی پابندیاں اُٹھادی گئیں۔ بے تکلّفی۔ اثر اور سادگی کو اختیار کیا گیا۔ قومی، خیالی اور بیانیہ نظمیں لکھی گئیں۔ جو حُسن و عشق کی قید سے آزاد ہیں۔ کہتے ہیں یہ نئی طرز انگریزی ادب سے اڑائی ہے۔ بہرحال اس نئے رنگ نے آیندہ ترقی کے دروازے کھول دیئے۔ اور ایک نئے دور کا سنگ بُنیاد رکھا۔

طرزِ جدید کے شعرا

حالی قومی شاعر ہیں اور آزاد نیچر کی شاعری کے موجد۔ سرور کا تخیّل نہایت پاکیزہ ہے۔ اکبر اپنے خاص رنگ کے اُستاذ ہیں۔ جو انہی پر ختم ہوگیا۔ اقبال کے کلام میں فلسفہ اور نیچر کے مضامین ہیں۔ حسرت کا کلام بہت سی قدیم و جدید خوبیوں کا مجموعہ ہے۔

نثر اُردو
اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ

جدید نثر اُردو کا سنگ بُنیاد اُنیسویں صدی میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے کلکتہ فورٹ ولیم کالج میں رکھا۔ وہ اُس وقت وہاں کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ اُنہوں نے شمالی ہند سے سیّد حیدر بخش حیدری۔ بہادر علی حسینی۔ میر امّن۔ حفیظ الدین احمد۔ مظہر علی ولا اور مرزا لطف علی وغیرہ جیسے قابل آدمیوں کو بُلایا کہ نووارد انگریزوں اور اہل ملک کے لئے اُردو سیکھنے کی کتابیں لکھیں۔ اس وقت تک کتابیں یا تو مذہبی رنگ میں لکھی جاتی تھیں یا قصّہ کہانیوں کی طرز پر جن میں صرف و نحو کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ ان ادیبوں نے نئی طرز پر کتابیں لکھیں۔ حقیقت میں شُستہ نثر نگاری کا رواج پانا اور سرکاری دفاتر کا کام اُردو میں ہونا ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کی کوششوں کا مرہون ہے۔ اسی زمانے میں اُردو لغات اور صرف و نحو کی کتابیں بھی ازسرِ نو ترتیب دی گئیں۔

نثر مقفیٰ
رجب علی بیگ سرور

نثر مقفیٰ ظہوری اور بیدل کی نثروں کی طرز پر لکھی جاتی۔ اس کی عبارت مقفیٰ اور جُملے بالکل نپے تلے ہوتے۔ صنائع بدائع استعمال ہوتے اور تشبیہیں دل کھول کر

صرف کی جاتیں۔ جملے طولانی اور پیچیدہ ہوتے جن کا پڑھنا اور سمجھنا سخت دقت طلب ہوتا تھا۔ عرصے تک یہ طرز مطبوع خاص و عام رہی۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کی مشہور تصنیف "فسانہ عجائب" اس رنگ کی بہترین مثال ہے۔

دریائے لطافت سید انشاء کی یہ تصنیف تاریخی اہمیت رکھتی ہے صرف نحو اردو کی پہلی کتاب ہونیکے علاوہ اس میں وقت کی مروجہ زبانوں کے الفاظ محاورے اور اصطلاحیں بکثرت موجود ہیں۔

اردوئے معلی اور عود ہندی یہ دونوں کتابیں مرزا غالب کے اردو خطوط کا مجموعہ ہیں۔ عبارت نہایت سلیس۔ سادہ بے تکلف اور دلآویز ہے۔ ظرافت اور شگفتگی نے خطوط کو بیحد دلچسپ بنا دیا ہے۔ اگرچہ غالب کی طرز خطوط نویسی نے زمانۂ مابعد کے نثر نگاروں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ لیکن پھر بھی وہ پرانے رنگ کی مقفی اور مسجع عبارت کو بالکل ترک نہیں کر سکے۔ انکے لکھے ہوئے دیباچے اور تقریظیں مقفی عبارتیں ہیں۔

عیسائی پادریوں کی تحریروں کا اثر عیسائی پادری جو بنگال میں مقیم تھے انجیل کا ترجمہ اور تبلیغی رسائل ملکی زبانوں میں شائع کرکے عوام میں تقسیم کرتے تھے۔ سکینا صاحب کے نزدیک اردو اخبار نویسی اسی زمانے سے شروع ہوتی ہے[ف۱]۔ ۱۸۰۵ء سے ۱۸۱۲ء تک انجیل کے ترجمے زیادہ تر اردو ہی میں شائع ہوئے۔

سرسید اور ان کے رفقا کا زریں عہد انیسویں صدی کے نصف آخر کو نثر اردو کی ترقی کا زریں عہد سمجھنا چاہیئے۔ اس عہد میں سرسید اور ان کے رفقا نے ایک خاص رنگ اختیار کیا۔ اِس زمانے میں عیسائیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی مناظرے اردو کی ترقی کا باعث ہوئے۔ نیز مناظرے کی کتابیں وغیرہ بھی نہایت سلیس زبان میں لکھی گئیں۔ قرآن کا سب سے پہلا اردو ترجمہ ۱۸۰۳ء میں ہوا۔ سرسید خود ایک سادہ اور جامع طرز تحریر کے موجد تھے۔ انہوں نے تعلیمی۔ اخلاقی۔ معاشرتی۔ مذہبی۔ سیاسی۔ غرض ہر موضوع پر نہایت پاکیزہ مضامین لکھے۔

سرسید کے رفقا حالی۔ شبلی۔ آزاد۔ ذکاء اللہ۔ مولوی چراغ علی۔ نواب محسن الملک اور نذیر احمد کی تحریروں سے اہل ملک اور ملکی زبان کو بیحد فائدہ پہنچا۔ یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ موجودہ زبان انہی کی زبان ہے جس میں ہم دن رات گفتگو کرتے ہیں۔

انگریزی تعلیم کا اثر اردو پر۔ چھاپے کی ابتدا۔ اردو کا سرکاری زبان ہونا انیسویں صدی کے نصف آخر سے انگریزی تعلیم کا نمایاں اثر اردو پر

ف۱ اردو کا سب سے پہلا اخبار مولوی محمد باقر مرحوم نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے جاری کیا تھا۔

پڑنے لگا۔اُردو میں معتد بہ معلومات اور اصنافِ سخن کا اضافہ ہوا۔چھاپے کی ترقّی سے اشاعت کتب آسان ہوگئی۔۱۸۳۲ء میں دفاتر کی زبان انگریزی سے اُردو ہوئی جس سے اُردو زبان کی قدروقیمت اور بھی بڑھ گئی۔

ناول نویسی کی ابتدا فسانہ نگاری۔تاریخی ناول اور اخبار نویسی کو انگریزی تعلیم کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔

اُردو ڈراما اُردو ادب میں یہ بالکل نئی صنف ہے۔فارسی میں اس کا وجود نہ تھا۔اس صنف کو ابھی کمال حاصل نہیں ہوا۔یورپ کے مشہور ڈرامے ہماری زبان میں ترجمہ ہو رہے ہیں۔گویا اُردو ڈرامانویسی کے سامنے ایک درخشاں مستقبل موجود ہے۔

(۳)

اُردو شاعری کی عام خصوصیات

اُردو شاعری فارسی شاعری کی مقلد ہے اُردو شاعری فارسی شاعری کے قدم بقدم چلی اور فارسی شاعری نے عربوں کا تتبع کیا۔شعرائے اُردو نے فارسی کی تشبیہیں اور مضامین اخذ کیئے۔اس سے نقصان یہ ہوا۔کہ اُردو شاعری کو باقاعدہ مدارج ارتقا طے نہیں کرنے پڑے۔ایک نئی زبان کو ترقّی کے لیئے یہ مدارج طے کرنے بے حد ضروری ہیں۔اِس دور میں فارسی زبان کے وہ مضامین بھی آگئے جن کا ہمارے مُلک سے کوئی تعلق نہیں۔

تقلید کے بُرے نتائج (۱) اُردو شاعری سے اصلیّت جاتی رہی اور ابتذال پیدا ہوگیا۔

(۲) غیر مُلکی مضامین مثلاً شیریں فرہاد۔مانی و بہزاد۔جیحوں سیحوں۔کوہ الوند۔بلبل اور سنبل وغیرہ کے افسانے ہماری شاعری میں داخل ہوگئے۔

(۳) فارسی شعرا کے تتبع نے اُردو شاعری کو محض نقالی بنادیا۔غزلوں اور قصیدوں میں غیر مُلکی تشبیہات اور استعارات کا استعمال ہونے لگا۔شعرا اپنے مُلک کی چیزوں اور موسموں کو بھول گئے۔ہمارے شاعروں نے فارسی شاعری کی تقلید آنکھیں بند کر کے جزئیات تک میں کی۔اِس اندھا دھند تقلید کا لازمی نتیجہ یہ ہوا۔کہ ہماری شاعری حسب دلخواہ ترقّی نہیں کر سکی۔

اُردو شاعری رسمی رہ گئی اُردو شاعری میں تکلفات بکثرت آجانے سے وہ محض رسمی اور لکیر کی فقیر بن گئی۔مقررہ حدود سے اِدھر اُدھر ہونا غیر فصیح قرار دیا گیا۔وہی پُرانے استعارے اور تشبیہیں ہیں جو قدم قدم پر

صرف ہو رہے ہیں۔ مشاہدات تازہ نام کو نہیں۔

قافیہ پیمائی | قافیہ بھی فارسی کے تتبع میں اختیار کیا گیا۔ قافیہ کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اظہار خیالات میں سخت رُکاوٹ کا باعث ہے۔ ہمارے شعرا کو قافیہ مدنظر رکھ کر مضمون پیدا کرنے پڑتے ہیں۔ یورپ اس کو ترک کر چکا ہے۔ اور ہمارے شعرا کو بھی اس تکلف کا احساس ہو رہا ہے۔

خلافِ نیچر مضامین | اُردو شاعری میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے۔ کہ اس میں اکثر مضامین فطرت کے خلاف باندھے جاتے ہیں۔ پھر جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ وہ بھی تہذیب کے بالکل خلاف ہوتے ہیں۔ اصل میں اس بدعت کا آغاز ہمارے قدیم شعرا نے کیا۔ بھاشا کی شاعری میں یہ بات نہیں۔ وہ حقیقی اور صحیح جذبات سے بھرپور ہے۔ یہ طرز اُردو شاعری کو ترقی اور مذاقِ صحیح پیدا کرنے سے روکتی رہی ہے۔

ہمارے قدیم شعرا اصل میں فارسی کے شاعر تھے اور ہندی اور سنسکرت سے ناواقف تھے اس وقت درباری زبان بھی فارسی تھی۔ اِس لئے اُردو میں سے قدرتاً ہندی اور سنسکرت کے خوبصورت الفاظ اپنی جگہ فارسی کے بھدّے اور ثقیل الفاظ کو دیتے رہے۔ یہی نہیں اُردو کو بیقدری کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا تھا۔ غالب کہتے ہیں ؎

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ ۔۔۔ بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من است

وجہ تذکیر معشوق | زمانہ جہالت میں جب کبھی معشوقہ کا نام ظاہر ہو جاتا۔ تو عرب قبیلوں میں کُشت و خون کی نوبت آجاتی۔ باعصمت عورتیں اس خامی سے بدنام ہو جاتی تھیں۔ اس قباحت کو دُور کرنے کے لئے خیالی عورتوں کے نام تجویز کئے گئے۔ یا کسی مشہور معشوقۂ سلف کے نام پر جذبات کا اظہار ہونے لگا۔ پھر صیغۂ تذکیر کے ساتھ معشوقہ کا ذکر ہوتا رہا۔ برخلاف اس کے فارسی شعرا کو یہ مصیبت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ فارسی زبان میں تذکیر و تانیث کا کوئی امتیاز نہیں۔ حقیقت امر یہ ہے۔ کہ ہر مُلک کا ادب اسکی سوسائٹی کے اخلاق کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس لئے ذکور سے عشق ظاہر کرنا اخلاقی لحاظ سے کسی طرح درست نہیں۔ سکینل کہتے ہیں کہ "یہ اعتراض کہ پردہ دار عورتوں کا ذکر مناسب نہیں معقول نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ پردہ دار عورتیں منظر عام پر نہیں آتیں"۔ بہرحال تذکیر معشوق اُردو شاعری میں کسی طرح خوش آیند معلوم نہیں ہوتا۔

اصنافِ سخن اُردو شاعری میں غزل قصیدہ۔ رُباعی۔ قطعہ۔ مثنوی۔ مرثیہ وغیرہ اصنافِ سخن میں شاعری کی جاتی ہے۔ ہم ان میں سے ہر صنف پر علیحدہ علیحدہ بحث کرتے ہیں۔

غزل اور اُس کا رنگ غزل سب سے مشہور صنفِ سخن ہے۔ اس کا رنگ زیادہ تر عاشقانہ یا صوفیانہ ہوتا ہے۔ متقدمین کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ اور قرونِ وسطیٰ میں مذہبی رنگ نمایاں،

تصوف ہمارے قدیم شعرا صوفی منش بزرگ تھے۔ ان کے بزرگ مجاہدینِ اسلام کے ساتھ یہاں آئے، تصوف کا مذاق ان میں وراثتاً چلا آتا تھا۔ ولی دکنی شاہ سعد اللہ گلشن کے مُرید تھے۔ آبرو شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں سے تھے مضمون سپاہی پیشہ تھے لیکن آخر میں وہ بھی تارک الدنیا ہو گئے۔ شاہ حاتم۔ مرزا مظہر۔ میر درد وغیرہ بھی مشہور صوفی بزرگ ہیں۔ میر سودا اور ان کے ہمعصروں کے کلام میں تصوف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ چونکہ فارسی شاعری میں تصوف بھرا ہوا تھا۔ اس لئے اُردو شعرا نے اس رنگ کو اختیار کر لیا۔ یہی وجوہ ہیں کہ ہماری شاعری میں تقدس۔ ریاضت نفس۔ ترک ماسوی اللہ۔ نمائش و ریاکاری سے نفرت عیش۔ حصولِ دولت اور اقتدار سے بیزاری وغیرہ کے مضامین بکثرت ہیں جس طرح فارسی شعرا حُسن مجازی کی تعریف کر کے حُسنِ حقیقی کی لذت سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے شعرا بھی مجاز سے حقیقت کی طرف پرواز کرتے ہیں۔

عاشقانہ رنگ غزل کے لغوی معنے عورتوں سے باتیں کرنا ہیں۔ اس میں چند اشعار ہوتے ہیں اور ہر شعر اپنے رنگ میں مکمل۔ غزل اُردو شاعری کی جان ہے اور اصناف شاعری میں سب سے سہل اور زیادہ کام آنے والی چیز۔ اس میں عاشقانہ رنگ اور تصوف اہلِ دربار کی عیش پرستی اور فارسی شاعری کے تتبع کی بدولت آیا ہے۔ عام طور پر غزلیں عاشق کی حرماں نصیبی۔ وصل کی جُستجو معشوق کے جور و جفا۔ گُل و بُلبل کے راز و نیاز۔ عاشق کی وحشت و جنون معشوق کے حُسن کی تعریف۔ باغ و بہار کے مناظر۔ شراب کی تعریف و طلب۔ رقیبوں کے شکوے وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہیں۔

اہلِ دربار کا اثر اُردو شاعری پر اُردو شاعری کی نشو و نما عام طور پر درباروں میں ہوئی۔ امرا اس کو پسند کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ۔ حیدرآباد اور دہلی جیسے شہر شاعری کا مرکز بنے رہے۔ درباری انعام و اکرام نے شاعری کو پروان چڑھایا۔ لیکن اس سرپرستی نے شاعروں کو درباری مذاق کا غلام

بنا دیا۔ عاشقانہ جذبات نے درباریوں کے مذاق کے مطابق خوب پرورش پائی۔ قصائد میں بھی عاشقانہ رنگ غالب آگیا۔ کیونکہ اس طرح شعرا کو خوب صلہ ملتا تھا۔ سروالٹر اسکاٹ کے اشعار کا مندرجہ ذیل ترجمہ اس حالت کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے ؎

اپنے رنگ عیش و عشرت کیلئے سب بادشاہ — شاعرانِ نکتہ رس سے لیتے ہیں محنت مدام
تھوڑی سی تنخواہ کے لالچ میں یہ کرتے ہیں مدح — لیکن اپنی رُوح کو کر لیتے ہیں پابند دام

قُدرتی مناظر کی اُردو شاعری میں کمی اُردو شاعری میں قدرتی مناظر بہت کم اور مصنوعی مناظر کا بکثرت ذکر ہے۔ گذشتہ صدی سے انگریزی تعلیم کی بدولت نیچرل شاعری کا چرچا ہونے لگا۔ پھر بھی ہمارے شعرا آج تک انہی پُرانے قصوں کو دُہراتے رہے۔ مغربی شعرا کی طرح وہ لہلہاتے ہوئے کھیت۔ گاتی ہوئی چڑیوں، اور حسن کی صحیح تصویروں سے متاثر ہی نہیں ہوئے۔

حزن و یاس کی فراوانی اُردو تو کیا ساری مشرقی شاعری حزن و یاس کے مضامین سے پُر ہے۔ یورپین کہتے ہیں کہ یاس انگیز مضامین کا مطبوع ہونا اہلِ مشرق کی طرزِ معاشرت کا نتیجہ ہے وہ تقدیر کے قائل ہیں۔ ان میں قوتِ عمل مفقود ہے۔ تقدیر سے مقابلہ کرنے کو حماقت خیال کرتے ہیں۔ اسکی ایک وجہ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اُنیسویں صدی کے شروع میں جب مُسلمانوں کی شاہانہ قوتوں کا زوال ہُوا۔ اور ان کی عظمت ایسی مٹی کہ اقبال کا زمانہ خواب و خیال ہو گیا۔ تو حزن و ملال ان کے دلوں میں گھر کر گیا۔ مغرب کے شعرا کی طرح اُردو شعرا خوشی اور مسرت کے ترجمان نہیں۔ دائمی مایوسی سے ان کے کلام میں درد اور اثر پیدا ہو گیا ہے۔ جو ایک حد تک قابلِ ستائش ہے لیکن اس کی بُہتات ترقی میں مانع ہے۔

قصائد قصائد نویسی میں اُردو کے شعرا نے فارسی اساتذہ کی پیروی کی ہے۔ وہ فارسی الفاظ کے استعمال سے قصیدوں کی شان بڑھاتے اور ممدوح کی تعریف میں بیحد مبالغہ کرتے ہیں۔ اکثر و بیشتر قصائد میں مشکل قوافی عمدہ صنائع و بدائع اور شکوہ الفاظ قصیدہ گو کی قدرت فن کا اظہار کرتے ہیں۔

مثنوی مثنوی بہت مقبول اور کارآمد صنف سخن ہے۔ اس میں بھی فارسی قواعد نظم کی پیروی کی جاتی ہے۔ ہمارے مشہور مثنوی نویس میر، میر حسن۔ مومن خان، نسیم، قلق اور شوق قدوائی ہیں۔ مثنویوں میں سب سے مشہور مثنویاں سحر البیان اور گلزار نسیم ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مثنوی ڈرامہ کی ضرورت کو پورا کرتی ہے لیکن یہ غلط ہے مثنوی میں کریکٹر نویسی ہوتی ہے نہ پلاٹ۔ ڈرامہ ہر حیثیت سے مثنوی سے بالاتر ہے۔ مثنوی میں بڑی یہ خرابی ہے کہ اس میں عمل بالکل مفقود ہوتا ہے اور وہ محض واقعات قدیم کی پابند ہوتی ہے۔

مراثی مراثیوں میں مناظر قدرت بہت عمدگی سے دکھلائے جاتے ہیں۔ پُر زور اور فصیح بیانیہ نظمونکی یہ بہترین صنف ہے۔

قطعہ اور رُباعی اِن میں خاص طور پر نصیحت آمیز اور پاکیزہ خیالات اور جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے انیس۔ دبیر اور حالی کی رُباعیاں خاص طور پر مشہور ہیں۔

اُستاد شاگرد کا تعلق اُستاد کا اردو شاعری میں خاص درجہ ہے۔ ایک نو آموز پہلے کسی اُستاد کو اپنا کلام دکھاتا ہے اور باقاعدہ اصلاح لیتا ہے۔ شاگرد اپنے اُستاد کا تتبع کرتا ہے۔ طرز اُستاد کے خلاف چلنا عیب گنا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اُستادی شاگردی کا تعلق قدرتی ذہانت اور طباعی کا خون کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری رسمی شاعری رہ گئی ہے۔

مشاعرے مشاعروں میں سخن سنج اور سخن گو جمع ہوتے۔ اور کسی مقررہ طرح پر طبع آزمائی کر کے دادِ سخن لیتے ہیں۔ مشاعروں سے اُردو شاعری میں ترقی ہوتی ہے۔ اہل یورپ اس چیز سے قطعی ناواقف ہیں۔

تخلص شعرا اپنے کلام میں اپنا ایک خاص نام استعمال کرتے ہیں۔ اور اسے تخلص کہتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنے نام کے جزو سے بھی تخلص کا کام لیا جاتا ہے۔

اُردو شاعری کی خصوصیات اُردو شاعری جذباتی شاعری ہے۔ ہمارے جذبات کو اُبھارتی ہے۔ نہایت شیریں اور لطیف ہے۔ عشق میں ڈوبی ہوئی ہے۔ عشق کی ناکامیاں، نامرادیاں اور حسرت و ارمان کے جذبات ہمارے قلب پر خاص اثر کرتے ہیں۔ اور یہ ایسے لطیف جذبات ہیں۔ جن سے دُوسری زبانیں محروم ہیں چونکہ اُردو نظم کی پیدائش کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اس لئے بہت سے شعرا کا کلام ناقص اور بدمزہ بھی ہے۔ موجودہ زمانہ میں اُردو شاعری نیچر کی روش پر پڑ گئی ہے جس سے اُردو کا مستقبل بہت شاندار بن گیا ہے۔ خوش قسمتی سے اس وقت شاعری کی طرف اِن لوگوں کی توجہ منعطف ہو گئی ہے۔ جو مشرقی اور مغربی ادب سے اچھی طرح واقف ہیں۔

(۴)

قدیم شعرائے دکّن

دکھنی؟ | اُردو شاعری کی ابتدا دکن کے مسلمان فرمانرواؤں کے دربار میں دکنی زبان میں ہوئی، دکھنی زبان اُردو کی ایک شاخ ہے۔ اُردو کی طرح فارسی خط (نستعلیق) میں لکھی جاتی ہے۔ اس میں فارسی الفاظ کی کثرت نہیں۔ جب فوجی مسلمان دکن میں پہنچے تو اس وقت اُس میں کچھ فارسی محاورے داخل ہو گئے تھے، وہ محاورات اب اُردو میں متروک ہیں۔ جب اطراف کی زبانوں سے اس نئی زبان کا میل ہوا تو اس کی ساخت میں بھی کسی قدر فرق آ گیا۔ مثلاً وہ لوگ "مجھ کو" کی جگہ "میرے کو" بولتے ہیں۔ یہ خرابیاں شمالی ہند میں آکر اصلاح پا گئیں۔ دکھنی کو ایک خراب قسم کی اُردو خیال کرنا صحیح نہیں بلکہ اس کو اُردو کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے۔ جو وَلی کی کوشش سے ایک ادبی زبان بن گئی۔

دکھنی کی ابتدا | سب سے پہلے علاؤالدین خلجی نے دکن کو فتح کیا اور اس کو دہلی کے ماتحت کر دیا۔ پھر دو مرتبہ سلطان محمد تغلق دکن جا کر رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی برباد ہو گئی۔ علما فضلا اور شعرا دکن میں جمع ہو گئے۔

دکن میں اُردو شاعری کی ابتدا کے اسباب | یہ بڑا اہم سوال ہے۔ کہ اُردو کا گہوارہ دکن کیوں قرار پایا؟ اس اجمال کی تشریح یہ ہے کہ خاندان بہمنی کا بانی گنگو برہمن کا چیلا تھا۔ انقلاب زمانہ سے تخت و تاج اس کے ہاتھ آیا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ گرو کا نام شامل کیا۔ اور اس کو اپنا وزیر مال بنا لیا۔ اس سے پہلے برہمن امور ملکی میں دخل نہیں دیتے تھے۔ محض مذہبی امور ان سے متعلق تھے۔ لیکن گنگو کے زمانہ سے یہ رواج ہو گیا کہ وزارت مال برہمنوں کو ملنے لگی۔ اس رسم کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو اور مسلمانوں میں ارتباط بڑھ گیا۔ آپس میں شادیاں ہونے لگیں۔ اس میل ملاپ سے زبان ہندی نے بھی خوب ترقی کی۔ ابراہیم عادل شاہ نے دکھنیوں کے زیر نگرانی حساب کتاب ہندی میں رکھنے کا حکم دیا۔ انہی اثرات کا نتیجہ تھا کہ ملکی زبان ترقی کرتے کرتے ایک ادبی زبان بن گئی۔ افسوس کہ

اس زمانہ کے شعرا کے حالات نہیں ملتے۔ ہاں ان کے نام اور انتخابات کلام کہیں کہیں کتابوں میں موجود ہیں۔

شاہان بہمنی کا زمانہ ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء تا ۹۳۲ھ/۱۵۲۵ء

۸۰۰ھ/۱۳۹۷ء سے دکن میں علم و ادب کی ابتدا ہوئی۔ گنج الاسلام شیخ عین الدین اور خواجہ گیسو دراز وغیرہ اس زمانے کے صوفی منش شاعر ہیں۔ جن کے چند ایک تصنیف کردہ مذہبی رسائل دریافت ہوئے ہیں۔

قطب شاہیوں کا عہد ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء تا ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۶ء

سلطنتِ بہمنی کے زوال کے بعد بیجاپور گولکنڈہ اور احمد نگر کی ریاستیں وجود میں آئیں۔ اس دور میں دکھنی کو بڑی ترقی ہوئی۔ محلوں میں ہندو رانیاں دیسی زبان بہت خوبصورتی سے بولتی تھیں۔ شاہان بیجاپور وغیرہ نہایت قابل بادشاہ تھے۔ وہ فارسی اور دکھنی میں شعر کہتے اور شعرا کی قدر کرتے تھے۔ امرا اور وزرا زیادہ تر فارسی داں تھے۔ اس لئے اطراف کی زبانوں نے دیسی زبان پر زیادہ اثر نہیں کیا۔ جنیدی۔ طبعی۔ نوری۔ فائز۔ طالب۔ مومن وغیرہ اس دور کے مشہور شاعر ہیں۔ افسوس کہ ان کے حالات کہیں نہیں ملتے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ ۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء

یہ سلطنت ۱۵۱۸ء میں قائم ہوئی اور بہت جلد معراج ترقی پر پہنچ گئی۔ سلطان قلی قطب شاہ اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کے بعد ۱۵۸۱ء میں بارہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ وہ اکبر اعظم اور شاہ عباس صفوی کا ہمعصر تھا۔ حیدرآباد کی اسی نے بنیاد رکھی تھی۔ طبیعت کا فیاض اور علوم و فنون کا قدرداں تھا۔ عرب اور ایران سے باکمال اُستاد اس کے دربار میں آتے رہتے تھے۔ مذہباً شیعہ تھا۔ اس لئے اس کے عہد میں مرثیے بہت لکھے گئے۔ عمدہ خوشنویس ہونے کے علاوہ ایک اچھا شاعر بھی تھا۔ اس کا کلام دکھنی۔ تلنگی اور فارسی تینوں زبانوں میں موجود ہے۔ فارسی میں قطب شاہ اور دکھنی میں معانی تخلص کرتا تھا۔ اس نے پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے ہیں۔ سادگی اور شیرینی اس کے کلام کا جوہر ہے۔ تصوف اور عاشقانہ رنگ میں اشعار کہتا تھا۔ مرقع نگاری اور مناظر قدرت کی بنیادیں اسی نے رکھی تھیں۔ جنہیں سودا اور نظیر اکبرآبادی نے تکمیل کو پہنچایا۔

قلی قطب شاہ پہلے شاعر ہیں۔ جن کا کلام مجموعی صورت میں اٹھارہ سو صفحات پر محفوظ ہے۔ ان کے کلام میں پختگی، سادگی اور ادبی شان پائی جاتی ہے۔ وہ فارسی شعرا کا تتبع کرتے ہیں لیکن

مقامی اثرات ان کے کلام پر بہت کافی ہیں۔ اکثر ہندی خیالات اور ہندی الفاظ بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ انکی طرز بھی ہندی ہے، گویا عشق عورت کی جانب سے مرد کی طرف ظاہر کرتے ہیں۔

سکسینا کہتے ہیں پہلے خیال تھا۔ کہ ولی اُردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ لیکن اب یہ سہرا قلی قطب شاہ کے سر ہے۔ یہاں میں صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ولی اور قطب شاہ کے کلام کا موازنہ کرکے دیکھ لیجئے۔ قطب شاہ قلی کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ صاحب دیوان ہونا کوئی کمال نہیں۔

نمونۂ کلام

دل مانگ خدا کن کہ خدا کام دویگا — تمنن کی مرادن کے بھرے جام دویگا
کرتے دعویٔ شعر کا سب اپنی طبع سوں — بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

سلطان محمد قطب شاہ
۱۶۱۱ء تا ۱۶۲۵ء

یہ سلطان قلی قطب شاہ کے بھتیجے انکے جانشین اور داماد تھے۔ نہایت متشرع اور سخی تھے۔ نظم و نثر اُردو میں خوب دستگاہ رکھتے تھے۔ فارسی میں ظل اللہ اور اُردو میں قطب شاہ تخلص کرتے تھے۔ ان کے دو دیوان فارسی اور دکھنی میں حیدرآباد میں نواب سرسالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ کلام میں شیرینی اور صفائی خوب ہے۔

نمونۂ کلام

سکھی تو ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ — محبت پر نظر رکھ کر بسر غیظ
دو لب تیرے رنگیلے یاقوت کو دیئے رنگ — بے بھیک رنگ عقیقاں نگین ہوئے یمن ہیں

سلطان عبداللہ قطب شاہ
۱۶۲۵ء تا ۱۶۷۲ء

یہ سلطان محمد قطب شاہ کے بیٹے تھے۔ اور سلاطین قطب شاہی میں ان کا چھٹا نمبر تھا۔ ۱۶۲۵ء میں تخت پر بیٹھے۔ شاہجہان بادشاہ کو خراج دیتے تھے۔ شاعری کے شوقین تھے۔ ان کا دربار علماء فضلاء سے ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ برہان قاطع انہی کے عہد میں لکھی گئی، فارسی اور دکھنی میں شعر کہتے تھے۔ دونوں زبانوں کے دیوان موجود ہیں۔ ان کے اشعار بھی صاف اور شیریں ہیں۔

نمونۂ کلام

تری پیشانی پر ٹیکا جھمکتا — تماشا ہے اُجالے میں اُجالا
آبحیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا — کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث

ابن نشاطی

یہ اس دور کے مشہور شاعر ہیں۔ گولکنڈہ کے باشندے اور عبداللہ قطب شاہ کے درباری شاعر تھے۔ حالاتِ زندگی معلوم نہیں ہوئے۔ ان کی مثنوی "پھول بن" زبان دکھنی میں موجود ہے۔

یہ مثنوی ۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس میں سکندر اور لقمان وغیرہ کی حکایتیں بھی ہیں، اور قصہ عشق و عاشقی میں انسانوں کا جانوروں کے قالب میں آجانے کا ذکر ہے۔ شاید فسانۂ عجائب اسی کو دیکھ کر لکھی گئی ہے۔

غواصی کا قصہ سیف الملوک | غواصی نے دکھنی میں ۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵ء میں یہ مثنوی لکھی تھی۔ اس میں شہزادی چین اور شہزادہ مصر کے عشق کے حالات منظوم ہیں۔ یہ قصہ غالباً الف لیلیٰ سے ماخوذ ہے۔ غواصی عبداللہ قطب شاہ کا شاعر تھا۔ مثنوی طوطی نامہ بھی اسی کی تصنیف ہے۔

سب رس مصنفہ مولانا وجہی | مولانا وجہی قطب شاہ کے درباری تھے۔ سب رس انہی کے حکم سے ۱۶۳۴ء یا ۱۰۴۵ھ میں تصنیف ہوئی۔ اس سے پیشتر کی نثر کے نمونے مذہبی رنگ میں ہیں۔ لیکن سب رس میں ایک ادبی شان ہے وجہی نے ظہوری کے تتبع میں مقفیٰ نثر بھی لکھی ہے۔ زبان صاف، سادہ اور قطب شاہیوں کے کلیات جیسی ہے۔

تحسین الدین | ان بزرگوار نے مثنوی "کامروپ کلا" لکھی۔ یہ والیٔ لنکا کی بیٹی اور راجہ اودھ کے صاحبزادے کے عشق کا قصہ ہے۔ مشہور ہے کہ جرمن شاعر گوئٹے نے اس کا ترجمہ کرا کر سُنا اور بہت پسند کیا۔

ملا قطبی | ملا قطبی نے ۱۰۴۶ھ/۱۶۳۶ء میں تحفۃ النصائح کا اسی ردیف و قافیہ میں ترجمہ کیا تھا جو شیخ یوسف دہلوی نے ۷۹۵ھ/۱۳۹۲ء میں اپنے بیٹے کی تعلیم کے لئے تصنیف کی تھی۔

جنیدی | ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ اُنہوں نے ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۳ء میں مثنوی ماہ پیکر تصنیف کی تھی۔

طبعی | یہ عبداللہ قطب شاہ کے ہمعصر اور گولکنڈہ کے باشندے ہیں۔ انہوں نے مثنوی بہرام و گل اندام ۱۰۸۱ھ/۱۶۷۰ء میں تصنیف کی۔ یہ مثنوی ہفت پیکر نظامی سے ماخوذ ہے۔

ابوالحسن قطب شاہ | یہ گولکنڈہ کے آخری تاجدار ہیں۔ عیش پسند نازک مزاج اور قابل حکمران تھے قابل لوگوں کی قدر کرتے تھے۔ ان کی آخری عمر مغلوں کی قید میں گزری۔ عبداللہ قطب شاہ کے داماد تھے۔ اور تانا شاہ کے نام سے شہرت پائی تھی۔ ان کے شعرا کے حالات ذیل میں درج ہیں:۔

نوری | سید شجاع الدین نام، گجرات کے سادات سے تھے۔ تانا شاہ کے وزیر کے بیٹے کے اتالیق تھے میر حسن نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے یہ فیضی کے دوست تھے۔ حقیقتاً فیضی کے دوست ملا نوری کوئی اور بزرگ تھے۔

فائز | یہ بھی گولکنڈہ کے باشندے تھے۔ انہوں نے قصۂ رضوان شاہ اور رُوح افزا نثر فارسی سے نظم دکھنی میں ترجمہ کیا۔

شاہی | شاہ قلی خان نام تھا۔ شاہی ملازمت کرتے تھے۔ تاناشاہ کے ندیم خاص تھے۔ انہوں نے شمالی ہند کی سیر بھی کی تھی۔

مرزا | ابو القاسم نام، تاناشاہ کے مصاحب تھے۔ تاناشاہ کے زوال کے بعد فقیر ہو گئے تھے۔

عادل شاہیوں کا زمانہ (سنہ ۸۹۵ھ تا سنہ ۱۰۹۷ھ / ۱۴۸۹ء تا ۱۶۸۵ء) | سلطنت عادل شاہی کی بُنیاد پڑنے سے مدتوں پہلے بیجاپور میں اُردو زبان عام ہو گئی تھی۔ سلاطین بہمنی کے دفتروں کی بھی یہی زبان تھی۔ لیکن یوسف عادل شاہ اور ان کے بیٹے اسمٰعیل عادل شاہ نے اپنے عہد میں دفاتر کی زبان فارسی کر دی۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی (سنہ ۱۵۸۰ء تا سنہ ۱۶۲۶ء) | سلاطین بیجاپور بھی شاہان گولکنڈہ کی طرح تعلیم یافتہ بادشاہ تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کو شعر و شاعری کا بہت شوق تھا۔ "ملّا ظہوری" ان کے دربار کے مشہور شاعر تھے۔ عادل شاہ خود ہندی موسیقی کے زبردست اُستاد تھے۔ اُنہوں نے سرودِ ہندی پر نورس نام ایک کتاب لکھی اور ملّا ظہوری نے اس پر دیباچہ لکھا۔ جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے۔

علی عادل شاہ ثانی | ان کے دربار میں بھی علما اور ادبا کا مجمع رہتا تھا۔ دکھنی شعرا کی بہت قدر کرتے تھے۔ رستمی۔ نصرتی۔ شاہ ملک۔ امین۔ مومن۔ ہاشم۔ مرزا وغیرہ ان کے عہد کے مشہور شاعر ہیں۔

رستمی | کمال خاں نام تھا۔ اُنہوں نے خاور نامہ کا شاہنامۂ فردوسی کی طرز پر دکھنی نظم میں ترجمہ کیا تھا۔

نصرتی | شیخ نصرت نام۔ بیجاپور کے رہنے والے۔ آباؤ اجداد فوجی ملازم تھے۔ نصرتی محمد عادل شاہ کے زمانہ میں دربار میں آئے۔ علی عادل شاہ کے دور میں ملک الشعرا ہوئے۔ سُنّی المذہب اور بندہ نواز گیسو دراز کے خاندان کے مُرید تھے۔

تصانیف | (۱) سنہ ۱۰۷۶ھ / ۱۶۶۵ء میں مثنوی علی نامہ لکھی اور اس میں علی عادل شاہ کے حالات قلمبند کئے۔ یہ بصورت قصیدہ دکنی کی پہلی مثنوی ہے۔

(۲) مثنوی گلشن عشق عشقیہ مثنوی ہے۔ اس میں عربی، فارسی اور بھاشا کی اچھی خاصی آمیزش ہے۔

(۳) گلدستۂ عشق۔ بعض کا خیال ہے کہ مثنوی ہے۔ اور بعض کے نزدیک یہ عاشقانہ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔

(۴) قصائد کا مجموعہ اور غزلوں کا دیوان بھی ہے۔

ان کی مضمون آفرینی، زورِ طبع اور اوجِ تخیل کو ابراہیم زبیری نے خاقانی کے کلام کا ہم پایہ بتایا ہے۔

ہاشمی سید میراں نام۔ بیجاپور کے باشندے۔ سید ہاشم شاہ کے مُرید تھے۔ اگرچہ مادر زاد اندھے تھے لیکن نہایت ذہین اور فطین تھے۔ مثنوی یوسف زلیخا ۱۶۸۷ء میں اپنے مُرشد کی فرمائش سے دکنی میں لکھی، یہ مثنوی دکنی ادب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا دیوان نایاب ہے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اس کا بیشتر حصہ ریختی میں ہے۔ قدیم بھاشا کا رنگ ان کے کلام میں نمایاں ہے۔ وہ ہندی شاعروں کی طرح عورت کا عشق مرد سے ظاہر کرتے ہیں۔

دولت اُنہوں نے سنہ ۱۶۴۳ء میں قصہ بہرام شاہ و بانوئے حُسن دکنی میں تصنیف کیا تھا۔

شاہ ملک بیجاپوری ہیں اور علی عادل شاہ کے معاصر۔ انہوں نے رسالہ احکام الصلوٰۃ ۱۰۷۷ھ/۱۶۶۶ء میں فارسی سے دکنی میں نظم کیا۔

شاہ امین ان کا نام شیخ امین الدین اعلیٰ تھا۔ بیجاپور کے اولیا میں سے تھے۔ اکثر حالتِ استغراق میں اشعار کہا کرتے تھے۔ مُریدوں نے ان کے اشعار کو مرتب کیا۔

دکن میں مرثیہ کی ابتدا سب سے پہلے مرثیہ نویس شیخ شجاع الدین نوری اکبری دور کے شاعر اور ابوالفضل اور فیضی کے ہمعصر تھے۔ ان کے علاوہ ہاشم علی برہانپوری۔ کاظم علی۔ رام راؤ ویسوا بھی مشہور ہیں۔

شعرائے دکن مغلوں کے عہد حکومت میں مغلوں نے گولکنڈہ بیجاپور فتح کرنے کے بعد شعرا کے ساتھ بیحد مراعات برتیں، ان رعایات سے اُردو شاعری کو فروغ ہوا۔ اس زمانہ کے مشہور شعرا کا حال درج ذیل ہے:

عاجز محمد علی نام۔ ان کی تصنیفات سے قِصہ فیروز شاہ۔ قصہ لال و گوہر۔ اور قِصہ ملکۂ مصر بزبان دکنی مشہور ہیں۔

بحری قاضی محمود نام۔ ان کے والد صُوفی منش بزرگ تھے۔ فارسی اور دکنی میں مثنویاں۔ غزلیں، رُباعیاں اور قصیدے ان کی تصنیف سے ہیں۔ اشعار کی تعداد پچاس ہزار بتاتے ہیں، جو تلف ہو چکے ہیں۔ "من لگن" کے نام سے دکنی میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔

امین شیخ محمد امین نام تھا۔ عہد اورنگ زیب میں ہوئے ہیں۔ یوسف زلیخا کو دکنی میں نظم کیا تھا۔

ولی دکنی سید محمد فیض نام۔ عالمگیر کا زمانہ پایا۔ رتن پدم، روضۃ الشہدا نام مثنویاں ان کی تصنیف ہیں۔

وجدی اس تخلص کے دکن میں دو شاعر ہوئے ہیں۔ ایک سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں اور دوسرے بارھویں صدی میں۔ قطب شاہی وجدی نے تحفۂ عاشقان لکھی۔ یہ فریدالدین عطار کی مثنوی گل وہرمز کا ترجمہ ہے۔ اور دوسرے وجدی نے فریدالدین عطار کی منطق الطیر کا ترجمہ "پنچھی نامہ" کے نام سے کیا۔

آزاد فقیر اللہ نام۔ حیدرآباد کے باشندے اور ولی اورنگ آبادی کے ہمعصر تھے۔

شعرائے اورنگ آباد اورنگ زیب نے حیدرآباد فتح کر کے "کہرکی" کو اپنا صدر مقام بنایا۔ اور اورنگ آباد اس کا نام رکھا۔ اورنگ آباد آخرکار علما و فضلا کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اس دور میں بہت سے شعرا ہوئے ہیں جن کے حالات مختلف تذکروں میں ملتے ہیں۔

ولی
سنہ ۱۶۶۸ تا سنہ ۱۷۴۴ء

مولانا آزاد نے لکھا تھا۔ کہ اردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی ہیں، لیکن قطب شاہیوں کے دیوانوں نے اس کی تردید کر دی ہے[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ ولی نے اردو شاعروں کی بنیادوں کو پختہ کیا۔ ان کے معاصرین اور بعد کے شعرا ان کو استاد مانتے ہیں۔

نام میں اختلاف ولی کے نام کے متعلق مصنفین میں اختلاف ہے۔ بعض شمس الدین نام اور ولی تخلص بتاتے ہیں بعض کے نزدیک محمد ولی نام شمس الدین لقب اور ولی تخلص ہے۔ میر حسن۔ مرزا لطف علی اور نساخ نے شاہ ولی اللہ نام بتایا ہے۔ نواب علی ابراہیم یوسف علی اور مولانا آزاد نے شمس ولی اللہ لکھا ہے۔

مقام پیدائش اور خاندان میں اختلاف میر حسن وغیرہ کا خیال غلط ہے۔ کہ ولی احمد آباد میں پیدا ہوئے۔ میر تقی نے ان کو اورنگ آباد کا بتایا ہے۔ ان کا خاندانی تعلق اورنگ آباد کے شیوخ قادریہ سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ شاہ وجیہ الدین کے خاندان سے نہیں تھے۔ بلکہ اس سے بیعت رکھتے تھے۔ اس خاندان کے شجرہ میں ان کا نام کہیں نہیں ملتا۔ بعض لوگ گجرات کی مفارقت پر ان کا ایک قصیدہ پیش کر کے ان کو گجراتی بتاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک اور ایک قصیدہ سورت کے متعلق بھی انہوں نے لکھا ہے۔ میرے نزدیک انہیں اورنگ آباد کا سمجھنا چاہئے۔

حالات زندگی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ بیس سال تحصیل علوم کر کے احمد آباد گئے۔ شاہ وجیہ الدین کے

---

[1] قطب شاہیوں کے دیوان ولی کے کلام کی برابری نہیں کرتے۔ اس لئے مولانا آزاد کا بیان صحیح تسلیم کرنا پڑتا ہے ۱۲

مدرسہ میں داخل ہوئے۔ پھر انہی کے مُرید ہو گئے۔ کچھ مدت بعد اپنے وطن کو واپس آئے۔ اُنہوں نے تقریباً سب اصناف سخن میں شاعری کی ہے۔

ولی کے دو سفر ولی ایک مرتبہ اورنگ زیب (۱۷۰۰ء) کے عہد میں دلّی آئے اور شاہ سعد اللہ گلشن سے ملے۔ دو مرتبہ (۱۷۲۲ء) محمد شاہ کے عہد میں سیّد ابو المعالی کے ساتھ دہلی آئے۔ اس مرتبہ اپنا دیوان بھی ساتھ لائے۔ دہلی میں ان کا کلام بہت مقبول ہُوا۔ اور اس سے شاعری کا خوب چرچا پھیلا۔

تصانیف اُنہوں نے شہدائے کربلا کی شان میں دہ مجلس کے نام سے ایک مثنوی لکھی۔ ہندی دیوان اور رسالۂ نور المعرفت تصوف میں ہے۔ انجمن ترقی اُردو کی سعی سے کلیات شائع ہو گیا ہے۔

وفات وہ کچھ دنوں اورنگ آباد میں رہ کر احمد آباد چلے آئے ۱۷۴۴ء میں انتقال کیا۔ جن لوگوں سے ان کو خاص تعلق تھا۔ ان کے نام ان کے اشعار میں اکثر ملتے ہیں۔ کلام میں صحابۂ کبار کی تعریف ان کو حنفی مذہب ظاہر کرتی ہے۔ وہ کسی مذہب سے تعصّب نہیں رکھتے صوفی منش فقیر مشرب بزرگ ہیں، جہاں جہاں گئے ہیں۔ اُن مقامات کی تعریف بھی ان کے اشعار میں موجود ہے۔

انتقاد وَلی نے کسی بادشاہ کی شان میں اشعار نہیں کہے۔ ہاں فخریہ اشعار جابجا ملتے ہیں۔ انکی تصانیف بہ اعتبارِ زبان اُردو ادب میں خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ عبارت نہایت سہل اور آسان ہے۔ روانی، سادگی سلاست ترنم ان کے کلام کا جوہر ہے۔ صنائع بدائع بھی بکثرت نہیں۔ بعض شعر تو بالکل زمانۂ حال کی زبان میں ہیں۔

نمونۂ کلام

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے — زخمی ہے شکار کیونکہ جاوے

دشمنِ دین کا دین دشمن ہے — راہزن کا چراغ راہزن ہے

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں دلبر سے — سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

خُوب رو خُوب کام کرتے ہیں — اک نگہ میں غلام کرتے ہیں

شعر فہموں کی دیکھ کر گرمی — دل ہُوا ہے مرا کباب سخن

عرفی و انوری و خاقانی — مجھ کو دیتے ہیں سب حساب سخن

داؤد مرزا داؤد نام۔ وَلی کے معاصر اورنگ آباد کے باشندے تھے۔ ایک چھوٹا سا دیوان انکی یادگار ہے۔

سراج | سید سراج الدین نام اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے فارسی شعرا کے کلام کا ایک ضخیم انتخاب کیا۔ اس کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ بارہ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک برہنہ پھرتا رہا۔ اسی حالت میں فارسی اشعار بھی کہے۔ جو تحریر میں نہیں آسکے۔ آخر شاہ عبدالرحمن چشتی کے مرید ہوئے۔ تقریباً پانچ ہزار اشعار اپنے برادر طریقت عبدالرسول خاں کی خاطر سے ریختہ زبان میں کہہ کر دیوان مکمل کیا۔ پھر مرشد کے حکم سے فقیری لے لی اور شاعری ترک کر دی۔

سید سراج ایک گوشہ نشین پاکباز بزرگ تھے۔ ان کے ہاں اکثر محفل سماع برپا ہوتی اور عمائدین شہر حاضر ہوا کرتے تھے۔ میر غلام علی آزاد۔ عاجز۔ فطرت۔ رسا وغیرہ ان کے ہمعصر تھے۔ باوجود گوشہ نشینی کے اکثر مشاعروں میں آتے تھے۔ انھوں نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ میر نے ان کو سید حمزہ کا شاگرد لکھا ہے۔ لیکن اس نام کا دکن میں کوئی شاعر نہیں ہوا۔

تصنیفات | دیوان فارسی۔ دیوان ریختہ اور ایک "منتخب دیوانہا" مثنوی بوستان خیال و گل و بلبل ان کی تصانیف سے ہیں۔

انتقاد | ولی کی طرح ان کا کلام بھی ایہام اور صنائع بدائع سے پاک ہے تکلف اور بناوٹ بالکل نہیں۔ اکثر اشعار تصوف میں ہیں۔ وہ ولی کے قائم مقام ہیں۔ اور استادی کا رتبہ رکھتے ہیں۔

نمونہ کلام |

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی — نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا۔ جو رہی سو بے خبری رہی
شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی — نہ خرد کی بخیہ گری رہی۔ نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمت غیب سے ایک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا — مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں — کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

کیا خاک آتش عشق نے دل بینوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

اس دور کے دیگر شعرا | اس دور میں اور بھی بہت سے شاعر ہوئے ہیں۔ جن کے حالات مختلف تذکروں میں موجود ہیں۔ ان میں عزلت اور عاجز زیادہ مشہور ہیں۔

احاطہ مدراس و کرناٹک کے شعرا | مولوی محمد باقر آگاہ۔ ویلور مولد۔ سیر اور عقاید کی متعدد کتابیں لکھیں، دربار کرناٹک کے مدار المہام شرف الملک محمد غوث اور ان کے خلف قاضی بدرالدولہ نے بھی اردو کتابیں

تصنیف کیں۔ اس وقت شعرا میں محمود صباحی۔ احمد۔ اعظم وغیرہ مشہور تھے۔

(۵)

اساتذۂ دہلی طبقۂ متقدمین

حاتم و آبرو کا زمانہ

دہلی میں اُردو کی ابتدا اور ترقی | اُردو زبان نے دکن میں نویں صدی سے اتنی ترقی کر لی کہ اس میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہو گیا۔ لیکن شمالی ہندوستان میں بارہویں صدی کے آغاز تک اُردو محض کاروبار کے لئے بولی جاتی تھی۔ بابر۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کی زبان پر بھی فارسی عربی کے الفاظ چڑھے ہوئے تھے۔ غرض بازاروں اور شاہی محلات میں یہی زبان بولی جاتی تھی۔

عالمگیر کے زمانہ سے اُردو شاعری شروع ہوئی۔ موسوی خان فطرت۔ مرزا عبدالقادر بیدل اور مرزا عبدالغنی فارسی کے شاعر تھے۔ لیکن تفریح کے لئے اُردو میں بھی کچھ کہہ لیتے تھے۔ محمد شاہ کے زمانہ میں جب مُلک میں امن ہوا تو صاحبِ فضل و کمال دہلی میں جمع ہو گئے۔ ان میں قزلباش خاں امید۔ شیخ سعداللہ گلشن۔ مرزا عبدالقادر بیدل۔ سراج الدین علی خاں آرزو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اسی زمانہ میں ولی، فراقی، فخری اور آرزو دکن سے دہلی آئے۔ اور یہ کاروباری زبان اُردو معلّی کا خطاب لیکر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی۔

اُردو لغات | عالمگیر کے زمانہ میں عوام کو اُردو لغات کا خیال پیدا ہوا۔ مُلا عبدالواسع ہانسوی نے "غرائب اللغات" کے نام سے اُردو ہندی الفاظ کا لغات مرتب کیا۔ لیکن معنی فارسی میں لکھے، پھر سراج الدین علی خاں آرزو نے اسی لغات کو تصحیح اور اضافہ کے ساتھ "نوادر الالفاظ" کے نام سے دوبارہ ترتیب دیا۔

دِلّی کے پُرانے شاعر | دِلّی کے پُرانے شاعر آبرو۔ حاتم۔ ناجی۔ مضمون اور مرزا مظہر اصل میں فارسی کے شاعر تھے

مگر اُردو میں ولی کی پیروی کرتے تھے۔ اِن لوگوں نے زبان کی بہت بڑی خدمات انجام دیں۔ وہ دکنی الفاظ جو ولی کے دیوان سے دہلی میں رائج ہو گئے تھے غیر فصیح قرار دیکر نکال ڈالے، اور انکی جگہ دلکش فارسی الفاظ اور محاوروں کا اضافہ کیا۔ حقیقتاً یہ کام نہایت جانفشانی اور تعریف کا ہے۔

ولی کے معاصر آبرو، یکرنگ اور حاتم صنعت ایہام کے بہت شوقین تھے۔ یہ محمد شاہی دور کی خصوصیت تھی۔ شاہِ عالم کے زمانہ میں مظہر، سودا، میر اور قائم وغیرہ نے اسے کم کیا۔ آخر میر درد اور میر حسن کے عہد میں یہ صنعت بالکل خارج ہو گئی۔

تصوّف

اس زمانہ میں تصوّف کا رنگ بہت غالب تھا۔ اکثر شعرا صوفی مشرب تھے۔ اُردو شاعری کی رہنما یعنی فارسی شاعری تصوّف میں ڈوبی ہوئی تھی اور دکن میں شاعری کی ابتدا مذہبی ادب سے ہوئی تھی۔

سپاہی پیشہ شعرا

سپاہی پیشہ لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ زمانہ پُر آشوب تھا۔ اس لئے اکثر شعرا سپاہی پیشہ ہوتے تھے۔

کلام میں یک رنگی کی کمی سبک و تبذل الفاظ کی کثرت

اس عہد کے اکثر شعرا کا کلام یک رنگ نہیں ہے۔ سوقیانہ اور بھرتی کے الفاظ آبرو۔ حاتم۔ ناجی اور مظہر کے ہاں بکثرت ہیں۔ میر اور سودا کے ہاں بھی بھرتی کے الفاظ کہیں کہیں ملتے ہیں۔ سیکسینا صاحب کا خیال ہے۔ کہ اس وقت شاعری تفنن کے طور پر کی جاتی تھی۔ اس لئے ایسے الفاظ استعمال ہو گئے۔ مَیں کہتا ہوں ہر عہد میں ایسے الفاظ بکثرت رائج ہوتے ہیں۔ جن کو آنے والے لوگ تبذل اور سبک کہدیا کرتے ہیں۔

شعرا کا طرز بیان اور ان کی خامیاں

اس دور تک نظم درجۂ کمال کو نہیں پہنچی تھی۔ اس لئے قواعد و عروض کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ ڈھیلی بندش اور زوائد کی کثرت ہوتی تھی۔ البتہ سادگی اور شیرینی بہت تھی۔

عربی فارسی الفاظ اور خیالات کا داخلہ، بھاشا سنسکرت اور دکنی الفاظ کا اخراج

اس دور میں سنسکرت بھاشا اور دکنی الفاظ نکال ڈالے گئے۔ میر اور سودا سے لیکر ناسخ کے عہد تک یہ سلسلۂ اصلاح برابر جاری رہا۔ بیشک اس دور کے باکمالوں نے بڑی بھاری خدمات انجام دیں۔ لیکن جوش اصلاح میں بھاشا اور سنسکرت کے بہت سے شیریں الفاظ بھی نکال ڈالے۔ اور ان کی جگہ نئے نئے محاورات اور الفاظ بنا کر زبان میں داخل کئے۔

شاہ مبارک آبرو
متوفی ۱۷۵۰ء

شاہ نجم الدین دہلوی نام - مبارک شاہ عرف - آبرو تخلص - گوالیار میں پیدا ہوئے، بچپن ہی میں دہلی آگئے تھے - خان آرزو کے شاگرد اور رشتہ دار تھے - ان کا دیوان تلف ہو چکا ہے -

نہایت خلیق اور متواضع بزرگ تھے - ایک آنکھ سے معذور تھے - اس لئے مرزا مظہر اکثر چوٹیں کرتے تھے - پیر کھن سے بہت محبت رکھتے تھے -

تذکرہ نویس ان کے کلام کی بہت تعریف کرتے ہیں - استعارات اور ایہام کے بادشاہ ہیں، کہیں کہیں ان کا کلام سبک اور تبذل بھی ہے - ان کی معلومات کچھ کم معلوم ہوتی ہیں - انہوں نے پچاس سے زیادہ کی عمر پائی -

خان آرزو

سراج الدین علی نام تھا مگر خان آرزو کے نام سے مشہور ہیں - ہندوستان کے مشہور نقادوں میں سے تھے - میر تقی کے قول کے مطابق ان سے بڑھکر کوئی محقق اور شیریں زبان شاعر اس زمانہ میں نہیں تھا - میر حسن نے ان کو امیر خسرو کے بعد سب سے بڑا شاعر مانا ہے - مولانا آزاد آرزو کی زبان اردو سے وہی نسبت بتلاتے ہیں - جو ارسطو کو فلسفہ کے ساتھ تھی - وہ فارسی کے شاعر تھے اردو میں کم کہتے تھے - میر - سودا - مظہر - درد ان کو استاد مانتے تھے - جوانی میں گوالیار میں منصبدار تھے فرخ سیر کے عہد میں دہلی چلے آئے - شیخ علی حزیں کی متکبرانہ باتوں سے ناراض ہو کر انہوں نے تنبیہ الغافلین لکھی - نادر شاہ کے حملہ کے بعد دہلی سے لکھنؤ چلے گئے - وہاں ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا - لیکن وصیت کے مطابق دہلی میں دفن کئے گئے -

خان آرزو بڑے صاحب کمال شاعر تھے - انکی قابلیت کا سب کو اعتراف ہے - تصانیف بھی بکثرت ہیں - جملہ تذکرہ نویس متفق ہیں کہ زبانِ اردو ان کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی -

شاہ حاتم
۱۶۹۹ تا ۱۷۹۱ء

ظہور الدین نام - سپاہی پیشہ تھے - ولی کا دیوان دیکھ کر شاعری کا شوق ہوا - آخر کار اپنے دور کے استاد کہلائے - ان کو دہلی کے رنگ کا موجد سمجھنا چاہیئے - ۲ دیوان یادگار ہیں - ایک قدیم رنگ میں ہے - پہلے رمز تخلص کرتے تھے - اپنے کلیات کو منتخب کر کے "دیوان زادہ" نام رکھا تھا - ایک دیوان فارسی میں بھی یادگار ہے -

انہوں نے ۴۵ شاگردوں کے نام لکھے ہیں - جن میں سودا - رنگین - نثار - تاباں اور فارغ

ان کے لئے باعث فخر ہیں۔ شاہ صاحب نے زبان میں سے بہت سے غیر مانوس الفاظ نکالے۔ کلام عاشقانہ عارفانہ صاف، سادہ اور سلیس ہے۔ دہلی میں ۸۳ یا ۹۶ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

میر تقی نے ان کو "مرد جاہل و متمکن" لکھا ہے۔ مگر میر حسن لکھتے ہیں کہ وہ صاحب کمال پسندیدہ افعال اور عالی ہمّت تھے۔ اور ان کی غزلیں محفلوں میں بڑے شوق سے گائی اور سنی جاتی تھیں۔

مضمون
متوفی ۱۷۴۵ء

شیخ شرف الدین نام۔ بابا فرید شکر گنج کی اولاد میں سے تھے۔ اکبرآباد کے رہنے والے اور سپاہی پیشہ تھے۔ بچپن میں دہلی آئے۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ بڑے بامذاق اور اپنے زمانہ کے اُستاد تھے۔ ایک دیوان دو سو اشعار کا یادگار چھوڑا ہے۔

کلام پاکیزہ اور پُرلطف ہے۔ استعارات اور ایہام بھی ہیں۔ آرزو کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ اگرچہ عمر میں ان سے بڑے تھے۔ نزلہ سے تمام دانت گر گئے تھے۔ اِس لئے آرزو ان کو "شاعر بیدانہ" کہتے تھے۔

مرزا مظہر
۱۶۹۸ء تا ۱۷۸۱ء

شمس الدین نام۔ جان جاناں عرف اور مظہر تخلّص تھا۔ باپ اور دادا منصبدار تھے۔ پردادا سے اکبر اعظم کی صاحبزادی منسوب تھیں۔ مانے ہوئے صوفی تھے۔ سینکڑوں ہندو مسلمان ان کے مُرید تھے۔ میر عبدالحی تاباں سے جو اس زمانہ کے حسین ترین شاعر تھے۔ بہت محبّت رکھتے تھے۔

مرزا صاحب کی تہذیب۔ متانت۔ قناعت۔ پابندیٔ وضع اور علمیت ضرب المثل تھی۔ نوابوں کے عطیّے واپس کر دیتے تھے۔ حسنِ معانی کے ساتھ حسنِ صورت کے بھی مالک تھے۔ اکثر کرامات بھی آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ نویں محرم تھی۔ مرزا صاحب نے تعزیہ کے جلوس پر اعتراض کیا۔ اس پر ان کو قرابین سے کسی ستم پیشہ نے مار ڈالا۔

اُنہوں نے نہ صرف اُردو زبان کو صاف کیا۔ بلکہ نئی فارسی ترکیبیں اور خیالات پیدا کئے۔ قدیم ایہام گوئی ترک کر کے جدید رنگ پیدا کیا۔ مصحفی اور شوق نے بھی ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ کلام نہایت سادہ، سلیس، فصیح مگر تاثیر اور تصوّف سے مالامال ہے۔

ناجی | محمد شاکر نام تھا۔ سپاہ گری پیشہ۔ ولی۔ آبرو۔ حاتم کے معاصر۔ اُنہوں نے نادر شاہ کو دہلی برباد کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور نہایت دردناک شہر آشوب لکھا۔ افسوس کہ

عنفوانِ شباب میں انتقال کیا۔ آرزو کا بہت احترام کرتے تھے نہایت تیز طبع اور ظریف تھے، ہر شخص کے کلام میں عیب نکالنے کی عادت تھی۔

ان کا دیوان موجود ہے۔ زبان میں سلاست اور خیالات میں نزاکت ہے۔ اشعار میں استعارات اور ایہام کی کثرت ہے۔ اکثر اشعار فحش بھی ہیں۔

تاباں | میر عبدالحی نام۔ غیر معمولی حسین ہونے کی وجہ سے یوسف ثانی کہلاتے تھے۔ ہمیشہ سیاہ پوش رہتے تھے۔ ان کے حسن کا شہرہ سن کر شاہ عالم انہیں دیکھنے گئے تھے۔ افسوس کہ عنفوانِ شباب میں انتقال کیا۔ کہتے ہیں۔ شراب نوشی سے استسقا ہو گیا تھا۔ میر صاحب نے بھی اپنے تذکرہ میں ان کی بہت تعریفیں کی ہیں۔

ان کا کلام عاشقانہ۔ شیریں اور نمکین ہے۔ خیالات نازک اور زبان صاف ہے۔ میر حسن نے ان کو محمد علی حشمت کا شاگرد لکھا ہے۔ بعض تذکرہ نویس حاتم کا شاگرد بتاتے ہیں۔ لطف کہتے ہیں سودا کے شاگرد تھے۔

یک رنگ | مصطفےٰ خاں نام، امرائے محمد شاہی میں سے تھے۔ بڑی عزت آبرو سے زندگی بسر کرتے تھے اور باکمال سخنوروں میں شمار ہوتے تھے۔ کلام بلند ہے مگر استعارات بہت ہیں۔ بعض شاہ آبرو اور بعض خان آرزو کا شاگرد بتاتے ہیں مگر وہ خود مرزا مظہر سے تلمذ ظاہر کرتے ہیں۔ اکثر و بیشتر کلام عاشقانہ اور عارفانہ رنگ میں ہے۔

فغاں متوفی ۱۷۷۲ء | اشرف علی خاں نام۔ احمد شاہ بادشاہ کے رضاعی بھائی تھے۔ ظریف الطبع ہونیکی وجہ سے ظریف الملک کا خطاب پایا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے بعد مرشد آباد گئے۔ وہاں سے فیض آباد پہنچے۔ لیکن نازک مزاجی نے یہاں رہنے نہ دیا۔ پٹنہ میں مہاراج شتاب رائے کے پاس بڑی عزت سے رہے آخر وہیں انتقال کیا۔

دیوان ریختہ اور دیوان فارسی یادگار ہے۔ فارسی اور ہندی کے محاورات بڑی خوبی سے نظم کرتے تھے عموماً کلام رواں پاکیزہ بلند اور نازک ہے۔ نیز ایہام اور فحش خیالات سے پاک، سودا اور میر دونوں ان کے کمال شاعری کے معترف ہیں۔

دیگر شعرا | اس زمانہ میں شاعری بہت رواج پا گئی تھی۔ میر تقی اور میر حسن کے تذکروں میں بہت سے

شاعروں کا ذکر آیا ہے مگر ان میں صرف میر محمد حسین کلیم دہلوی قابلِ ذکر ہیں۔ جو میر صاحب کے رشتہ دار تھے۔ اُنہوں نے فصوص کا اُردو ترجمہ کیا اور ایک رسالہ عروض و قافیہ پر لکھا۔

(۶)

اساتذۂ دہلی۔ طبقۂ متوسطین

میر اور سودا کا زمانہ

اُردو شاعری کا زرین عہد اس دور میں اُردو شاعری معراج ترقی پر پہنچی۔ میر حسن۔ درد۔ سودا اور میر اسی عہد کے زندۂ جاوید شعرا ہیں۔ اس زرین عہد میں تمام اصنافِ سخن انتہائے کمال کو پہنچے۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان۔ سودا کے پُر زور قصائد۔ میر اور درد کی پُر درد غزلیں اپنا آپ جواب ہیں۔ آنیوالے دور کے علمبردار یعنی ذوق۔ غالب۔ آتش۔ ناسخ وغیرہ ان کو استادِ مسلم الثبوت مانتے ہیں ؎

ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا
نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں
غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ

فارسیت کا غلبہ اس دور میں فارسیت کا بہت غلبہ تھا۔ شعر الہند میں لکھا ہے کہ اس وقت اُردو شاعری فارسی کے قالب میں ڈھل گئی۔ اور ہمارے شعرا بالکل ایرانی شعرا کی طرز میں کہنے لگے۔

سودا اور میر نے حافظ و سعدی سے استفادہ کیا۔ بعض نے ناصر علی۔ جلال۔ اسیر۔ کلیم۔ بیدل۔ طالب آملی اور شفائی کی روش اختیار کی۔ اس دور کے شعرا کے کلام میں فارسی ترکیبوں اور محاوروں کے ترجموں کی کثرت ہے۔ اور یہ اسی تقلید کا اثر ہے۔ سودا اور میر نے زبان کو نئی نئی ترکیبوں اور محاوروں سے مالامال کیا۔ لیکن میر حسن نے اصلی زبان پر قناعت کی۔

اسی عہد میں تذکیر و تانیث کی پابندی بھی عاید کی گئی۔ نئی بحریں اور نئے اصنافِ سخن بنائے گئے۔ میر صاحب نے واسوخت مربع اور مثلث ایجاد کیا۔ قصائد اور ہجو کی تکمیل سودا نے کی۔

شعرائے دہلی کی لکھنؤ کو ہجرت افغانوں کے حملوں اور مرہٹوں کی لوٹ مار کے خوف سے میرؔ اور سوداؔ۔ میر حسنؔ اور سوز وغیرہ نے دہلی سے لکھنؤ کو ہجرت کی۔ لکھنؤ میں ان کی خوب عزت افزائی ہوئی۔ لیکن دردؔ آخر دم تک دہلی میں قناعت کی زندگی بسر کرتے رہے۔

کلام کی خصوصیت اس عہد کے شعرا کے کلام میں پست خیالات کے ساتھ بلند خیال اور سخیف الفاظ کے ساتھ شاندار الفاظ ملے جلے نظر آتے ہیں۔ میرؔ کے متعلق ایک تذکرہ نویس کی رائے ہے کہ ان کے معمولی اشعار نہایت معمولی اور اعلیٰ اشعار نہایت اعلیٰ ہیں۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ پُرگو شعرا کا کلام عموماً ہموار نہیں ہوتا۔ چنانچہ خواجہ میر دردؔ کا کلام بیشتر اس عیب سے پاک ہے۔

تذکرے اس عہد میں متعدد تذکرے لکھے گئے۔ میر صاحب نے نکات الشعرا اور میر حسن نے تذکرہ شعرائے اُردو لکھا۔ یہ سب تذکرے چھپ چکے ہیں۔ ان سے اس زمانہ کے حالات اور معاملات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

خواجہ میر درد
۱۷۲۰ء ۱۱۳۳ھ تا ۱۷۸۴ء ۱۱۹۹ھ

سید خواجہ میر نام۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب کے صاحبزادے تھے۔ ان کے والد کا ایک بہت بڑا دیوان نالۂ عندلیب کے نام سے مشہور ہے۔ سلسلۂ نسب خواجہ بہاؤالدین نقشبند سے ملتا ہے۔ خواجہ صاحب کے جدِّ امجد بخارا سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کے والد جوان ہو کر شاہی منصب دار ہوئے۔ پھر دُنیا ترک کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔

خواجہ میر درد ۱۷۲۰ء ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ والد سے علوم متداولہ حاصل کئے۔ مصحفی نے لکھا ہے سپاہی پیشہ تھے۔ لیکن والد کے حکم سے ۲۸ برس کی عمر میں دُنیا چھوڑ کر گوشہ نشین ہو گئے۔ ۲۹ برس کی عُمر میں والد کی جگہ سجادہ نشین ہوئے۔ ذاتی تقدس اور سلسلۂ نسب کی برکت سے سب ان کے گرویدہ تھے۔ بادشاہ سے لیکر فقیر تک دلی عقیدت رکھتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی لوٹ مار نے سب شعرا کو دہلی سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن خواجہ صاحب اللہ پر توکّل کئے بزرگوں کے سجادہ پر بیٹھے رہے۔ آخر ۱۷۸۴ء ۱۱۹۹ھ میں انتقال کیا۔ ۶۶ برس کی عمر پائی۔

خواجہ صاحب کی آزادی اور استغنا کا اس بات سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ اُنھوں نے کبھی کسی کی مدح سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا۔ بادشاہ تک ان کے دربار میں باادب حاضر ہوتے تھے۔ موسیقی سے بڑا ذوق تھا۔ محرم میں مجالس عزا بھی برپا کرتے۔ بڑے بڑے اربابِ تصوف اور اصحابِ

سلوک ہمیشہ حاضر رہتے تھے۔ مشہور ماہرانِ موسیقی اپنے کمال کی داد لینے اور سعادتِ دارین حاصل کرنے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

تصانیف خواجہ صاحب کو تصنیف و تالیف کا بچپن سے شوق تھا۔ ان کی بہت سی تصانیف چھپ چکی ہیں۔ بیشتر کُتب تصوّف پر ہیں۔

دیوان اُردو خواجہ صاحب کی زبان میر کی طرح صاف اور سلیس ہے۔ درد و اثر اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے تصوّف میں ان سے بہتر کسی نے نہیں کہا۔ بیہودہ مذاق اور ہجو سے کلام پاک ہے کہیں کہیں پُرانے محاورے اور الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ لیکن اس طرح کہ ان سے شعر کی خوبصورتی بڑھ جاتی ہے عاشقانہ رنگ نہایت بلند، اور بوالہوسی سے پاک ہے۔ بقول مولٰنا آزاد خواجہ صاحب اُردو کے چار رُکنوں میں سے ہیں۔ میر تقی نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر نہایت احترام سے کیا ہے۔ ماننا پڑیگا کہ میر درد کی عارفانہ شاعری نے مابعد کے شعرا پر گہرا اثر کیا۔

شاگرد خواجہ صاحب کے بہت سے شاگرد تھے لیکن قائم۔ ہدایت۔ فراق اور اثر زیادہ مشہور ہیں۔

میر سوز
۱۷۲۰ء تا ۱۷۹۸ء
۱۱۳۲ھ تا ۱۲۱۳ھ

سید محمد میر نام تھا۔ ان کے والد میر ضیاء الدین صاحبزادہ شاہ عالم گجراتی کی اولاد میں سے تھے اصلی وطن بخارا تھا۔ میر سوز دہلی میں پیدا ہوئے۔ تیر اندازی میں مشاق اور ورزش کے شوقین تھے۔ خوشنویسی اور فنون سپاہ گری میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔ جوانی میں رنگین مزاج تھے۔ نہایت خوش طبع شیریں زبان اور پابند وضع تھے۔ پہلے میر اور پھر سوز تخلص اختیار کیا۔ شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی کی تباہی سے افسردہ ہو کر فرخ آباد گئے۔ کچھ دنوں وہاں کے نواب کی مُلازمت کی۔ اس کے بعد آصف الدولہ کے دربار میں چلے گئے۔ وہاں بھی جی نہ لگا، تو مرشد آباد کے دربار میں پہنچے۔ پھر آصف الدولہ کے پاس لکھنؤ آ گئے۔ اس دفعہ آصف الدولہ ان کے شاگرد ہوئے۔ کچھ مدت بعد انتقال کیا۔ سنہ وفات پر تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے۔ تقریباً ۸۰ سال کی عمر پائی۔

طرز کلام دیوان غزلوں، رباعیوں، مخمسوں اور ایک مثنوی پر مشتمل ہے۔ انداز کلام نہایت سادہ بیساختہ اور بے تکلف ہے۔ آورد۔ فارسی تراکیب فضول تشبیہوں۔ دُور از کار استعاروں اور لفظی صنائع بدائع سے پاک ہے۔ مرزا علی لُطف لکھتے ہیں۔ سوز عاشقانہ رنگ کے بادشاہ ہیں اور ان کا کلام سوز میں ڈوبا ہوا ہے۔ سادگی اور صفائی میں ان کا مقابلہ میر تقی سے کیا جا سکتا ہے۔ مگر سودا سے وہ بہت پیچھے ہیں میر صاحب

کے ہاں زبان کے چٹخارے کے ساتھ ندرتِ مضمون اور لطفِ جذبات بھی ہے۔ جو سوز کے ہاں نہیں۔ ان کے اشعار کی بے تکلفی سے معلوم ہوتا ہے کہ ریختی کی بنیاد انہی نے ڈالی تھی۔

میر سوز شعر اس انداز سے پڑھتے۔ کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے۔ ایک دفعہ شعر پڑھتے پڑھتے گر کر بیہوش ہو گئے تھے۔

سودا
سنہ ۱۷۱۳ء تا ۱۷۸۰ء
۱۱۲۵ھ تا ۱۱۹۵ھ

مرزا محمد رفیع نام۔ آباؤ اجداد کابل کے باشندے تھے۔ ان کے والد مرزا محمد شفیع بہ سلسلۂ تجارت دہلی میں آ کر مقیم ہوئے۔ مرزا رفیع دِلّی ہی میں پیدا ہوئے۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے۔ سودا نے باپ کی سوداگری اور ایشیائی شاعری کو مدِنظر رکھ کر سودا تخلص اختیار کیا تھا۔

مرزا نے تعلیم و تربیت دہلی میں پائی۔ پہلے سلیمان قلی خاں وداد اور پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ شاہ صاحب اپنے اس شاگرد پر بہت فخر کرتے تھے۔ مرزا خانِ آرزو کے شاگرد نہ تھے۔ مگر ان کی صحبت سے اس قدر فیضیاب ہوئے۔ کہ فارسی میں بھی کہنے لگے۔ مرزا کے کلام کا ہر جگہ چرچا تھا چنانچہ شاہ عالم بھی ان کے شاگرد ہوئے۔ کچھ مدت بعد مرزا ان سے ناراض ہو گئے۔ لیکن قدردانوں نے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دی۔ ایک مرتبہ نواب شجاع الدولہ نے بلایا۔ لیکن سودا نے یہ رُباعی جواب میں لکھدی اور نہ گئے

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک | آوارہ ازیں کوچہ باں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے | بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

گردشِ ایام مرہٹوں اور مغلوں کے حملوں سے دہلی برباد ہو گئی۔ مرزا کی عمر اُس وقت ساٹھ برس کی تھی۔ دہلی سے فرخ آباد پہنچے۔ وہاں چند سال رہے جب نواب احمد خاں کا انتقال ہوا۔ تو فیض آباد پہنچ کر نواب شجاع الدولہ کے ملازم ہو گئے۔ اب دار السلطنت بھی لکھنؤ قرار پایا۔ نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ تخت نشین ہوئے تو انہوں نے بھی مرزا کی خوب قدردانی کی۔

اس زمانہ میں مرزا فاخر مکین سے مرزا کی جنگ چھڑ گئی۔ لیکن نواب سعادت علیخاں ولیعہد نے فیصلہ مرزا کے حق میں کرا دیا۔ اس وقت مرزا کو ملک الشعرائی اور چھ ہزار سالانہ کا وظیفہ ملا۔ اور انہیں نواب صاحب کے مزاج میں اتنا دخل ہو گیا۔ کہ نواب صاحب مرزا کی صحبت کو محل کے عیش و آرام پر ترجیح دینے لگے۔

تصانیف مرزا کی تصانیف جملہ اقسامِ سخن میں بکثرت ہیں۔ اُنہوں نے تذکرہ شعرائے اُردو بھی لکھا تھا، جو اب نایاب ہے۔ دیوان ردیف وار غزلوں اور قصائد پر مشتمل ہے۔ دیوانِ اُردو میں ہر طرح کا کلام ہے۔ مرزا فاخر نے فارسی شعرا پر اعتراض کئے تھے۔ مرزا نے ان کا جواب عبرۃ الغافلین نام رسالہ میں دیا ہے۔

سودا کا مرتبہ شاعری سودا اپنے زمانہ کے بہت بڑے اُستاد مانے گئے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے ان کو اقلیم سخنوری کا شہنشاہ اور اُردو کا خاقانی اور انوری تسلیم کیا ہے۔

خدماتِ زبان مرزا صاحب نے ہندی الفاظ کی دُرشتی کو دُور کر کے فارسی کی آمیزش سے زبان میں حلاوت پیدا کر دی۔ اُردو زبان کو ادبی زبان بنایا۔ فارسی الفاظ کو اس خوبصورتی سے زبان میں داخل کیا کہ وہ اصل زبان کا جزو بن گئے۔ فارسی کی روش پر نئی نئی ترکیبیں اور محاورے ایجاد کئے۔ اور فارسی کی تلمیحات کیساتھ ہندوستان کی قدیم روایات کو بھی زندہ رکھا۔ ع

نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اس کو نہ دیکھا ہو　　کنہیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا ہے ہرجائی

مرزا کے عہد میں قدیم ایہام گوئی اور دوہروں کا رواج جو کسی قدر باقی رہ گیا تھا۔ وہ بالکل متروک ہوگیا۔ ع

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دُورنگی　　مُنکرِ سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

مرزا نے قصیدہ اور ہجو کی اُردو شاعری میں بُنیاد رکھی۔ اور ان اصناف کو اس درجہ کمال پر پہنچایا کہ کوئی ان کی برابری نہیں کر سکا۔

مرثیہ وقصیدہ مرزا سے پہلے بھی بہت لوگ مرثیہ کہتے تھے۔ مگر اس میں صرف مذہبیت ہوتی تھی۔ مرزا نے مرثیے میں اپنی شاعری کا کمال دکھایا۔ اور آنے والوں کے لئے ترقی کی راہیں کھول دیں۔

مرزا نے عرفی و خاقانی کے مقابلہ میں قصیدے لکھے جو نزاکت معنی اور طرفگی مضامین میں ان سے کہیں بہتر ہیں۔

ہجو مرزا نے بے انتہا ہجویں لکھی ہیں۔ جو گرمیٔ کلام کے باعث ظرافت کا ایک مستقل ذخیرہ ہیں۔ بڑھاپے تک ان کے مزاج کی یہ حالت تھی کہ جو دل میں آتی تھی بے خوف وخطر کہہ گزرتے تھے۔ حق یہ ہے کہ اُنہوں نے اس مبتذل صنف کو ایک باقاعدہ فن بنا دیا۔ ہجوؤں کے مُطالعہ سے ان کی قوتِ بیان۔ قُدرتِ زبان اور وسیع معلومات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ہر بات کی جزئیات کو مفصل بیان کرتے ہیں ظرافت کو دور دو اثر

کے ساتھ اس طرح ملاتے ہیں۔ کہ سننے والا پوری طرح متاثر ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے مخالفین کی لکھی ہوئی ہجویں کوئی سنتا بھی نہ تھا۔ اور ان کی ہجویں بچہ بچہ کی زبان پر ہوتی تھیں۔

سودا کا اثر بعد کے شعرا پر — مرزا کی شعر گوئی نے بہت سی منچلی طبیعتوں میں شعر گوئی کا مذاق پیدا کر دیا تھا معاصرین کے علاوہ شعرائے مابعد بھی ان کو اُستاذ الاساتذہ مانتے ہیں۔ ذوق نے سودا کے قصائد کو دیکھ کر ایسے بلند اور زوردار قصیدے لکھے۔ کہ قصیدہ گوئی سودا سے شروع ہوئی اور ذوق پر ختم ہو گئی۔ سودا نے زبان کی صفائی اور اصلی جذبات کے بیان سے آنیوالے دور کے لئے ایک نئی شاہراہ کھولی گویا مرثیہ گوئی میں انہیں انیس و دبیر کا رہنما کہنا چاہیے۔

کلام پر رائے — مرزا کو زبان اور بیان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کا کلام سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے نئی نئی بحروں، نئے نئے ردیف قافیوں، شگفتہ اور سنگلاخ زمینوں میں ایسے شعر نکالے ہیں جس طرح پتھر میں سے چشمہ نکلتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے مرزا کا دل اصلی جذبات سے معمور ہے۔ بندش میں ڈھیلا پن کہیں نہیں، ہر لفظ نگینہ کی طرح پیوست ہے۔ خیالات بلند اور نازک ہیں۔ استعارے اور تشبیہوں کو اس طرح صرف کرتے ہیں کہ شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ زبان نہایت صاف اور پاکیزہ ہے۔ بلکہ زبان کو صفائی بخشنے والوں میں ان کا نمبر سب سے اوّل ہے۔

شعرا کی رائیں — (۱) میر تقی نے اپنے تذکرے میں ان کی خوب تعریف کی ہے۔ اور بقول مولانا آزاد میر صاحب نے مرزا کو پورا شاعر مانا ہے۔

(۲) مرزا قتیل نے سودا کا مرتبہ قصائد میں ظہوری کے برابر مانا ہے۔ مولانا آزاد کو اس پر اعتراض ہے۔ وہ لکھتے ہیں ظہوری کے قصائد استعاروں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر مرزا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے۔ جو محاورے اور زبان دونوں کا بادشاہ ہے۔ اور قصائد اور ہجو دونوں خوب کہتا ہے۔

(۳) طبقات الشعرا میں مرزا کے قصائد میں عرفی اور خاقانی کے قصائد سے مقابلہ کیا گیا ہے۔

(۴) میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ مرزا کے مقابلہ کا اب تک کوئی شاعر ہندوستان میں نہیں پیدا ہوا۔

(۵) حکیم قدرت اللہ خاں بقا اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں مرزا سر آمد شعرائے فصاحت ہیں بعض کے

نزدیک وہ غزل گوئی میں میر تقی کو نہیں پہنچتے۔ مرزا ایک ناپید اکنار سمندر اور میر ایک عظیم الشان دریا ہیں۔ قواعد کی معلومات میں میر صاحب کو مرزا پر برتری ہے۔ اور قوتِ شاعری میں مرزا صاحب کو میر صاحب پر فوقیت۔

(۶) گلشن بےخار میں لکھا ہے "ان کی غزلیں ان کے قصیدوں سے۔ اور ان کے قصیدے ان کی غزلوں سے بہتر ہیں۔

(۷) شمس العلما نواب امداد امام کا قول ہے۔ سودا اُردو کے شکسپیر تھے۔

(۸) سر الفرڈ لائل نے سودا کو اُردو زبان کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا ہے۔

(۹) خواجہ باسط لکھتے ہیں۔ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا صاحب کا واہ۔

کلام میں کمی | (۱) کلام میں تصوف نہیں ہے۔ اگرچہ ان کے معاصرین کے کلام میں موجود ہے معلوم ہوتا ہے ان کا مطالعہ دُنیاوی معاملات تک محدود ہے۔

میر حسن متوفی ۱۲۰۱ھ ۱۷۸۶ء | میر غلام حسن نام تھا مگر میر حسن کے نام سے شہرت پائی۔ میر غلام حسین ضاحک معاصر سودا ان کے والد تھے۔ ضاحک نہایت زندہ دل اور ظریف واقع ہوئے تھے۔ ان کے اجداد ایران سے ہندوستان آئے تھے۔

میر حسن اپنے زمانہ کے مشہور فاضل اور خوشنویس تھے۔ وہ دِلی میں پیدا ہوئے اور دِلی والے کہلائے۔ اپنے والد سے علوم متداولہ پڑھے اور شاعری میں بھی انہی سے اصلاح لی۔ بعد میں میر درد کے شاگرد ہوئے دہلی کی تباہی کے بعد اپنے والد کے ساتھ فیض آباد چلے گئے۔ کچھ مدت وہاں رہ کر لکھنؤ آئے اور وہیں پیوندِ زمین ہوئے۔ ان کے چار بیٹے تھے جن میں سے تین شاعر تھے۔ مشہور مرثیہ گو میر انیس انہی کے پوتے تھے۔

میر حسن عربی کم جانتے تھے۔ لیکن فارسی کے زبردست عالم تھے۔ انہوں نے تذکرہ شعرائے اردو نہایت عمدہ فارسی میں لکھا ہے۔ مولانا آزاد اور میر صاحب ان کو سودا کا شاگرد لکھتے ہیں لیکن وہ خود اپنے آپ کو میر ضیاء الدین ضیاء کا شاگرد اور خواجہ میر درد۔ سودا اور میر کا پیرو بتاتے ہیں۔ نہایت خوش مذاق اور بذلہ سنج تھے۔ ہزل اور فحش سے اُنھوں نے کبھی اپنا قلم آلودہ نہیں کیا۔

طرز کلام | ان کا کلام غزلوں۔ رُباعیوں۔ مثنویوں اور مرثیوں پر مشتمل ہے۔ نہایت سادہ اور صاف ہے

ان کی مثنوی سحر البیان اُردو میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ غزلوں میں میرؔ اور سوز کا رنگ جھلکتا ہے۔

مثنوی سحر البیان اس کو قصۂ بے نظیر اور بدرِ منیر بھی کہتے ہیں۔ یہ مثنوی ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء میں لکھی گئی۔ اور نواب آصف الدولہ کے نام سے معنون ہوئی۔ یہ شاہزادہ بے نظیر اور شاہزادی بدرِ منیر کا عشقیہ افسانہ ہے۔ میر صاحب نے قصے کی جزئیات نہایت خوبی سے بیان کی ہیں۔ اشعار نہایت صاف اور سادہ ہیں۔ اس کے اشعار اب تک لوگوں کی زبان پر رواں ہیں۔ اگرچہ اسے لکھے ہوئے ڈیڑھ سو برس ہو چکے ہیں۔ لیکن زبان تا ہنوز تازہ ہے۔

دُوسری مثنوی گلزار ارم ہے۔ اس میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی تعریف ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی مثنویاں ہیں۔ جو اب نہیں ملتیں۔ اُنھوں نے کئی ایک ہجویں بھی لکھی ہیں۔ وہ بھی نہایت مہذب اور پُر لطف ہیں۔ کچھ قصائد، چند مرثیے اور سلام بھی ہیں۔

تذکرۃ الشعرا یہ تذکرہ فارسی میں ہے۔ اس میں تقریباً ۳ سو شاعروں کا ذکر ہے۔ اگرچہ تذکرہ مفصّل نہیں۔ لیکن پھر بھی نہایت دلچسپ اور کار آمد ہے۔

میر تقی میر محمد تقی نام، اور میرؔ تخلّص تھا۔ انہیں اُردو شعرا کا اُستادِ اعظم مانا جاتا ہے۔ ان کے والد میر عبد اللہ دُنیا ترک کر کے درویش ہو گئے تھے۔ اسی لئے علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے بزرگ حجاز سے سرحد دکن میں آئے۔ وہاں سے احمد آباد گجرات پہنچے۔ تلاشِ معاش میں میر صاحب کے دادا اکبر آباد آئے اور آب و ہوا کی ناسازی سے وہیں راہئ عدم ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کو خللِ دماغ تھا۔ وہ جوانی میں مر گئے۔ چھوٹے بیٹے میر صاحب کے والد تھے۔ جو علی متقی کے نام سے مشہور تھے۔

میر صاحب کے والد کا بعارضہ تپ انتقال ہوا۔ بڑے بھائی حافظ محمد حسن نے تمام ترکہ پر قبضہ کر لیا۔ میر صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی میر محمد رضی کو وہیں چھوڑا اور خود تلاشِ معاش میں دہلی آکر سرکاری مُلازم ہو گئے۔ نادر شاہی حملے میں نواب مارے گئے۔ اور انہیں آگرے واپس آنا پڑا۔ فکرِ معاش میں پھر دہلی گئے۔ اس مرتبہ اپنے بھائی خان آرزو کے ہاں ٹھہرے۔ اُنھوں نے بڑے بھائی کی تحریک پر کچھ تکلیف پہنچائی۔ میر صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔ یہاں تک کہ جنون کی سی حالت طاری ہو گئی۔ حکیم فخر الدین خان سے رجوع کیا اور انہی کے علاج سے افاقہ ہوا۔ آخر خان آرزو سے

علیحدہ ہو گئے اور رعایت خاں رئیس کے مصاحب بنے۔ جب احمد شاہ درانی کو سرہند پر شکست ہوئی۔ تو میر صاحب رعایت خاں کے ساتھ تھے۔ بعد میں ان سے کچھ رنجش ہو گئی، اور میر صاحب کو ملازمت ترک کرنی پڑی۔ خاں صاحب نے ان کے چھوٹے بھائی میر محمد رضی کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔

چند دن بعد میر صاحب نواب کے ہاں پھر ملازم ہو گئے۔ کہتے ہیں وہ روہیلوں کی جنگ میں شامل تھے۔ نواب صاحب کے قتل کے بعد میر صاحب پھر بیکار ہو گئے۔ سکندر آباد کی لڑائی میں میر صاحب احمد شاہ کے ساتھ تھے۔ آخر کار مہاراجہ ناگر مل کے بیٹے نے ان کی اتنی معقول تنخواہ مقرر کر دی تھی کہ فارغ البالی سے بسر ہونے لگی۔

دہلی کی بربادی میں میر صاحب کا گھر بھی لٹا۔ دہلی سے نکل کر کمہیر پہنچے جو سورج مل جاٹ کا قلعہ تھا۔ سورج مل نے میر صاحب کا کچھ روزینہ مقرر کر دیا۔ اس زمانہ میں میر صاحب دہلی آئے لیکن شہر کو ویران پایا۔ تین سال بعد راجہ سورج مل کے ساتھ آگرے پہنچے۔ اور کچھ مدت رہ کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد میر صاحب مختلف حاکموں کے ساتھ اِدھر اُدھر مارے مارے پھرے۔ آخر خانہ نشین ہو گئے شاہ عالمگیر ثانی نے ان کو کئی مرتبہ بلایا۔ مگر وہ نہ گئے۔ اُمرا کی مہربانیوں سے گزر اوقات ہوتے جاتی تھی۔

روانگی لکھنؤ میر صاحب خانہ نشین تھے اور چاہتے تھے شہر چھوڑ دیں۔ زادِ راہ کے لئے کچھ نقدی پاس نہ تھی۔ نواب آصف الدولہ نے زادِ راہ بھیجا تو میر صاحب لکھنؤ روانہ ہوئے۔ راستہ میں فرخ آباد کے رئیس نے میر صاحب کو اپنے پاس رکھنا چاہا۔ لیکن وہ نہ مانے اور سیدھے لکھنؤ پہنچے۔ جب نواب صاحب کی ملازمت حاصل کی۔ تو وہ بہت خوش ہو کر بغلگیر ہوئے، اپنے شعر اُن کو سنائے ان کے شعر خود سنے اور میر صاحب کا معقول روزینہ مقرر کر دیا۔

میر صاحب کی عمر میر صاحب کی عمر کے بارے میں تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے۔ مولانا آزاد نے سو برس لکھی ہے سکسینا صاحب ۸۸ یا ۸۹ برس کا اندازہ لگاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ نادر شاہی حملہ (۱۷۳۸ء / ۱۱۵۱ھ) میں ان کی عمر ۱۴ یا ۱۵ کی ہو گی لیکن مزہ یہ ہے کہ وہ اس جنگ میں بحیثیت مصاحب کے موجود تھے اور اعلیٰ خدمات انجام دے رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی سی عمر میں مصاحبت کا رتبہ کیونکر حاصل ہو گیا۔

میر صاحب کے صحیح سوانح حیات بہت کم معلوم تھے۔ خوش قسمتی سے تذکرۂ میر دستیاب ہو گیا۔ اور انجمن ترقّی اُردو نے اُسے چھپوا دیا۔ اس سے میر صاحب کے بہت سے حالات معلوم ہوئے لیکن افسوس کہ یہ کتاب بھی میر صاحب کی ادبی زندگی پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتی۔ اس میں نادر شاہ کی جنگ (۱۱۵۱ھ ۱۷۳۸ء) سے ضابطہ خاں (۱۱۹۶ھ ۱۷۸۲ء) کے قتل تک کے حالات موجود ہیں۔ اس سے دہلی کی خانہ جنگیوں۔ مرہٹوں۔ جاٹوں۔ روہیلوں اور افغانوں کی لڑائیوں۔ نوابانِ اودھ کے معرکوں۔ عمائدین شہر کی سازشوں اور ہندو مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات پر خوب روشنی ڈالی ہے۔

سیادت میں اختلاف تذکرہ شورش (۱۱۹۳ھ ۱۷۷۹ء) میں مذکور ہے۔ کہ میر صاحب حقیقت میں سیّد نہیں تھے لیکن میر تخلص نے ان کو سیّد بنا دیا۔ مولانا آزاد نے کہن سال بزرگوں سے روایت بیان کی ہے کہ جب میر تقی نے میر تخلص رکھا۔ تو ان کے والد نے منع کیا۔ "ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سیّد بن جاؤ گے"۔ اس کے بعد مولٰنا نے اپنی طرف سے لکھا ہے۔ کہ ان کی سیادت میں شبہ نہیں کرنا چاہیے اور سند میں انہی کا یہ شعر بیان کیا ہے ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی

ذکر میر سے اس بات کا قطعی فیصلہ ہو گیا ہے۔ کہ میر اصل نسل سیّد اور مذہباً شیعہ تھے۔ آبحیات میں مرقوم ہے کہ میر صاحب نہایت نازک مزاج اور بد دماغ تھے سیکسینا صاحب نے پہلے اس کی تردید کی ہے۔ اور آگے چل کر خود ہی مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ میر واقعی بد دماغ تو تھے لیکن اس درجہ بد دماغ نہ تھے۔

نکات الشعرا آبحیات میں لکھا ہے۔ میر صاحب کا دعویٰ تھا کہ مَیں نکات الشعرا میں ایک ہزار شعرا کا حال لکھوں گا۔ مولٰنا آزاد لکھتے ہیں۔ ان بچاروں میں سے ایک بھی طعنوں سے نہیں بچا۔ ولی کے متعلق میر صاحب فرماتے ہیں کہ "وے شاعر یست از شیطان مشہور تر"۔

سیکسینا صاحب کہتے ہیں۔ نکات الشعرا اب شائع ہو گئی ہے لیکن اس میں نہ تو سَو سے زائد شعرا کا حال ہے۔ اور نہ اس قسم کی سخت تنقیدیں۔ حسنِ اتفاق سے پنجاب یونیورسٹی نے تذکرہ شعرا میر قاسم بھی چھپوا دیا ہے۔ اس کو دیکھنے کے بعد آبحیات پر سے یہ اعتراض ہٹ جائیگا کہ وہ کہی

سُنی باتوں کا ذخیرہ ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ آبحیات تذکرہ شورش اور تذکرۂ میر قاسم سے ماخوذ ہے جو نہایت قابلِ اعتماد تذکرے ہیں۔

نکات الشعرا میں لکھا ہے۔ میر صاحب اور خان آرزو کے درمیان میر صاحب کے بڑے بھائی کے اُکسانے سے رنجش ہو گئی تھی۔ اس لئے آرزو ہمیشہ میر صاحب کو بُرا بھلا کہتے رہتے، اور دُشمنوں کی طرح کا سلوک کرتے۔ یہاں تک کہ میر صاحب کو وہ گھر اور محلّہ بھی چھوڑنا پڑا۔ سکسینا صاحب کہتے ہیں، اس دُشمنی کا میر صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ورنہ وہ اپنے تذکرے میں ضرور لکھتے۔ ناظرین خود ہی اندازہ کر لیں ایسی صُورت میں میر صاحب کس حد تک اپنی بد دماغی اور نازک مزاجی کو سنبھالے رہے ہونگے۔ درآنحالیکہ ان پر جنوں کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

تخلص کا جھگڑا مولانا آزاد نے لکھا ہے۔ میر صاحب نے میر تخلص سوز سے چھینا تھا۔ اور سکسینا صاحب کا خیال ہے۔ سوز نے یہ سوچ کر کہ ان کے اچھّے اشعار میر صاحب سے منسوب ہو جائیں گے اپنا تخلص سوز رکھ لیا ہو گا۔

میر صاحب کا کیریکٹر میر صاحب انتہا درجے کے خوددار اور حساس تھے۔ اُمرا کے ارتباط کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ بیحد وضعدار کم گو اور آزاد طبیعت انسان تھے۔ افلاس نے ان کو اور اعلیٰ ظرف بنا دیا تھا۔

نازک دماغی سکسینا صاحب لکھتے ہیں مولانا آزاد نے میر صاحب کی بد دماغی اور نازک مزاجی کو بہت مبالغہ سے بیان کیا ہے۔ پھر خود ہی لکھتے ہیں۔ کہ "راجہ ناگر مل جیسے قدردان کی مُلازمت انہوں نے اس لئے ترک کر دی کہ جو معاہدہ انہوں نے اس کے ایماء سے شاہی اُمرا سے کیا تھا اس پر وہ قائم نہیں رہا"۔ پتہ نہیں یہ بد دماغی نہیں تو اور کیا ہے۔ میر صاحب نے رعایت خاں کی رفاقت اس لئے ترک کی کہ انہوں نے گویّے کو تین چار شعر یاد کروانے کو کہا تھا۔ پھر کئی ایک مرتبہ عالمگیر ثانی نے بُلایا۔ لیکن نہیں گئے۔

اس قسم کی مثالیں دینے کے بعد سکسینا لکھتے ہیں اس کا ایک سبب تو طبعی تھا۔ دُوسرے اپنی وضع کا پاس، اور جب فقر و فاقہ درپے ہو۔ تو وضعداری نبھانے میں نازک مزاجی آ ہی جاتی ہے۔ ان کی نازک دماغی دُوسروں کی ہمدردی کی بھی متحمّل نہیں ہو سکی۔ وہ سریع الغیظ اور جلد برہم ہونے والے، اور اپنی کمزوری سے خود واقف تھے۔ اکثر اشعار میں اس طرف اشارہ بھی

کرتے ہیں ؎

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ　　دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ　　ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

میر صاحب اپنے معاصر شاہ حاتم جیسے بزرگ کی نسبت یہ فقرات لکھتے ہیں "مرد یست جاہل و متمکن و منقطع وضع"۔ لیکن برخلاف اس کے سودا کی تعریف کرتے ہیں۔ اس سے سیکسینا صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ وہ ہر شخص کو ناروا داری اور کم بینی سے نہیں دیکھتے تھے۔ سبحان اللہ۔

مولانا آزاد نے لکھا ہے "تحریری روائتیں اور تقریری حکائتیں ثابت کرتی ہیں کہ میر صاحب حافظ اور سعدی کی غزلوں پر سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔ تو اور کسی کی کیا حقیقت ہے"۔ سیکسینا صاحب کہتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نکات الشعرا مولانا کی نظر سے نہیں گزرا۔ بلکہ اُنھوں نے میر صاحب کے غرور اور بد دماغی کی اکثر بے بنیاد روائتیں ضعیف اور ناقابلِ اعتماد تذکروں سے علی الخصوص تذکرۂ قاسم سے بغیر جانچے ہوئے لے لی ہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ تذکرۂ شورش اور میر قاسم کو سیکسینا صاحب کیوں ناقابلِ اعتماد قرار دیتے ہیں۔ شاید اس واسطے کہ وہ ان کی اپنی نظر سے نہیں گزرا۔

کلام میں مایوسی اور درد میر ازل سے دردمند دل لیکر آئے تھے۔ ان کو سوائے رنج و الم کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر والد کی درویشانہ زندگی اور یہ تلقین کہ بیٹا عشق کرو کہ عشق ہی سے یہ دنیا بنی ہے عشق کے بغیر زندگی وبال ہے۔ اور عشق میں دل کو ہارنا کمال"۔ میر صاحب خود کہتے ہیں ؎

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو　　سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

میر شروع سے ہی مصیبتوں میں مُبتلا رہے۔ دس برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ تلاش معاش میں دہلی گئے۔ وہاں خان آرزو درپئے آزار ہوئے۔ بڑے بھائی پہلے ہی سے دُشمن تھے۔ آخر میر صاحب دیوانے ہو گئے۔ دلی میں جب تک قیام رہا۔ نانِ شبینہ کے فکر میں پریشان رہے۔

بہارِ بے خزاں میں لکھا ہے۔ ایک قضیے کے سلسلے میں رُسوائی کے خوف سے اکبر آباد سے لکھنؤ آ گئے لیکن وہ شعلہ عشق ہمیشہ بھڑکتا رہا۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچی۔

تصنیفات میر صاحب کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ انہوں نے چھ دیوان غزلوں کے لکھے۔ دیوان فارسی ابھی تک نہیں چھپا۔ تذکرۂ نکات الشعرا چھپ چکا ہے۔ دیوانوں میں جملہ اقسامِ سخن موجود ہیں۔ قصیدے بہت کم لکھے ہیں۔ لیکن وہ سودا کی طرح زوردار نہیں۔ بات یہ ہے۔ ان کی طبیعت غزل گوئی کے لئے مخصوص تھی۔ بہت سی عشقیہ مثنویاں بھی لکھیں جو مقبولِ عام ہوئیں۔

میر صاحب کی ایجادیں خدمات زبان اور تصرفات اُردو میں میر صاحب واسوخت۔ مربع۔ مثلث وغیرہ کے موجد خیال کئے جاتے ہیں۔

میر صاحب نے بہت سی فارسی ترکیبیں اور ان کے ترجمے اُردو میں داخل کئے۔ ان میں سے اکثر مقبولِ عام ہوئے اور بعض متروک ہو گئے۔

میر کی اقسامِ شاعری (۱) ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی (۲) نصف مصرعہ ہندی اور نصف فارسی (۳) حرف و فعل فارسی (۴) ترکیبات فارسی (۵) صنعت ایہام۔ اب اس کا رواج کم ہو گیا ہے (۶) اندازِ شعر۔ اس کو ہر ایک نہیں سمجھ سکتا۔

میر بحیثیت شاعر چونکہ اُردو شاعری تغزّل کی مرادف ہے۔ اور میر صاحب غزل گوئی کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ اس لئے وہ اُردو کے شاعر اعظم مانے جاتے ہیں۔ مثنوی نویسی میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ لیکن غزل گوئی میں یکتا ہیں۔ ان کے اشعار صاف سادہ۔ فصیح درد انگیز اور دلکش ہیں۔ ان میں انتہائی درجہ کا ترنم ہوتا ہے۔ اور وہ جذبات کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ میر صاحب کے ۷۲ نشتر مشہور ہیں۔ مگر ان کا تعین نہیں۔ ہر درد و اثر والے شعر کو لوگ نشتر کہتے ہیں۔ چھوٹی بحروں کی غزلیں خاص طور پر شستہ درد انگیز اور لاجواب ہیں۔ حسرت۔ ملال۔ مایوسی۔ درد اور حزن ان کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ اب تک تمام شعرا میر صاحب کو اُستاد الشعراء مانتے اور تمام تذکرہ نویس ان کے کلام کی تعریفیں کرتے ہیں۔

میر اور سودا میر صاحب کی شہرت غزلوں اور مثنویوں پر۔ اور سودا کی قبولیت قصیدوں اور ہجووں پر مبنی ہے۔ خواجہ باسط لکھتے ہیں۔ میر صاحب کا کلام "آہ" ہے۔ اور میرزا صاحب کا "واہ"۔

حقیقت یہ ہے کہ قسامِ ازل نے حزن و ملال میر صاحب کو دیا تھا۔ اور شگفتہ مزاجی اور فارغ البالی مرزا صاحب کے حصے میں آئی تھی۔ اس لئے دونوں اُستادوں کی شاعری اپنے مزاج اور ماحول کی صحیح صحیح آئینہ دار ہے۔ میر صاحب کے دماغ میں درد اور اثر پیدا کرنے کے لئے نہایت نرم صاف سادہ

اور زور واثر الفاظ کا ذخیرہ محفوظ ہے۔ جو غزل کیلئے نہایت موزوں ہے، برخلاف اس کے قصیدے کے لئے نہایت زور دار اور رفتاندار الفاظ کی ضرورت ہے قصیدہ کہنا ایک دل گرفتہ آدمی کا کام نہیں اس لئے میر صاحب اس میدان میں مرزا صاحب سے بہت پیچھے ہیں۔

(۷)

اساتذہ دہلی طبقۂ متاخرین

انشا اور مصحفی کا زمانہ

اِس دور کی ترقیاں | اس دور میں گذشتہ دور کی نسبت شعر کی زبان اور بندش میں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ پرانے الفاظ اور ترکیبیں متروک ہوگئیں۔ اور ان کی جگہ نئے الفاظ اور تراکیب نے لے لی۔ زبانِ اُردو میر انشا کی بہت احسان مند ہے کہ اُنہوں نے ہر حیثیت سے اسکی توسیع کی۔ اِس دور میں مصحفی اور جراءت نے بھی بہت کام کیا۔ وہ اگرچہ انشاء کے ہمعصر تھے۔ لیکن قدما کے پیرو تھے۔

شاعری اور دربار | بیشتر شعرا درباروں سے وابستہ ہوتے تھے لیکن پھر بھی وہ اپنی خودداری اور آزادی کو ہمیشہ برقرار رکھتے تھے۔ مگر اس دور کے شعرا کی حیثیت رؤسا کے درباروں میں بالکل نقالوں اور مسخروں کی سی ہوگئی۔ شاعری اُمرا اور رؤسا کو خوش کرنے کا ذریعہ بن گئی۔ شاعری پر اہل دربار کے مذاق کا بہت گہرا اثر پڑا۔ آپس میں رقابت اور بدمزگیاں پیدا ہونے لگیں۔ اور بڑھتے بڑھتے اخلاق اور شائستگی کے حدود سے متجاوز ہوگئیں۔ انشا اور مصحفی کے ہنگامے اس زمانہ کی شاعری پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہیں۔

خراب نتائج | اِس درباری تعلق سے شاعری کی پاکیزگی اور بلند خیالی مٹنے لگی۔ آئندہ ترقی کی راہیں بند ہوگئیں۔ اب تک شاعر حقیقی عشق سے سرشار نظر آتے تھے۔ لیکن اس درباری تعلق سے عشق مجازی کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ غزلوں کی زبان سوقیانہ اور خیالات رندانہ ہوگئے۔ عیش پرست اُمرا اس طرز سے خوش ہوتے تھے اور انعام دیتے تھے۔

دہلی کے شعرا بھی درباری مُلازم تھے لیکن ان کی شاعری عشق حقیقی سے معمور تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ

شاعری کی باگ ڈور شاہ گلشن۔ خواجہ میر درد اور مرزا مظہر جان جاناں جیسے باکمال بزرگوں کے ہاتھوں میں تھی

ریختی ریختی اسی دور کی ایجاد ہے۔ اور حقیقتاً اس وقت کے مذاق کا صحیح ترین نمونہ ہے۔ اس کے موجد سعادت یار خاں رنگین تھے۔ انشاء نے بھی اس کو رواج دینے میں بہت کچھ حصہ لیا تھا۔ ریختی عورتوں کی زبان ہونے کی وجہ سے عیاشوں کو بہت مرغوب تھی۔ اس میں سوائے فحش اور تبذل باتوں کے اور کچھ نہیں اس عہد میں شیریں کلامی اور بلند خیالی میں کمی ہو گئی۔ لیکن بحیثیت فنِ شاعری نے بہت ترقی کی شعرا مشکل ترین بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے اور اپنے جوہر دکھاتے تھے۔ اس دور کے اشعار میں درد و اثر مفقود ہے۔

ہزل گوئی اس دور میں بہت سے ہزل گو پیدا ہوئے۔ ان میں میر اٹل نارنولی میر جعفر زٹلی۔ زانی چرکیں۔ فسق۔ میر غلام حسین برہانپوری شاگرد زانی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

انشاء متوفی ۱۸۱۷ء سید انشاء اللہ خاں انشاء حکیم ماشاء اللہ کے بیٹے۔ ان کے بزرگ نجف سے آکر دہلی میں آباد ہوئے تھے۔ انشاء کے والد شاہی طبیب تھے، اور مصدر تخلص کرتے تھے۔ زوالِ سلطنت کے زمانہ میں وہ مرشد آباد گئے۔ مرشد آباد نوابانِ بنگالہ کا دار الخلافہ تھا۔ انشاء وہیں پیدا ہوئے۔

انشاء نے علوم رسمیہ اپنے والد سے پڑھے۔ بچپن سے شعر کہنے کا شوق تھا۔ اکثر اپنی طبع خداداد سے کام لیتے اور کبھی کبھی اپنے والد سے اصلاح لے لیتے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں دہلی آئے۔ شاہِ عالم خود شاعر تھے اور شاعروں کے قدردان۔ انہوں نے سید انشاء کو بڑے اعزاز سے اہلِ دربار میں شامل کیا۔ انشاء نے اپنی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی سے شاہ عالم کے مزاج میں ایسا دخل پایا کہ وہ ذرا سی دیر کی جدائی بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ آخر الامر انشاء دربار کی تباہی اور مرزا عظیم بیگ کے باہمی مناقشہ سے ایسے بددل ہوئے کہ لکھنؤ چلے گئے۔

لکھنؤ پہنچ کر انشاء نے مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ اور تھوڑے سے دنوں میں اپنی قابلیت کے زور سے مصحفی کی جگہ ان کے استاد بن گئے۔

نواب سعادت علی خاں تفضل حسین خاں علامہ سعادت علی خاں کے مشیر کار اور سرکار انگریزی کے معتمد تھے۔ سید انشا کی بہت عزت اور قدر کرتے تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ سید انشا مرزا سلیمان کے پاس نہیں رہنا چاہتے تو انہوں نے سعادت علی خاں سے سید صاحب کے کمالات کا ذکر کر کے بلوایا۔

نواب صاحب سید انشا کی پُر لطف صحبتوں کے ایسے گرویدہ ہوئے۔ کہ ایک دم کے لئے اُن کو جدا نہ ہونے دیتے تھے۔

افسوس کہ سید انشاء ہمیشہ نواب کی ہاں میں ہاں نہ ملا سکے۔ اکثر مذاق مذاق میں انشاء کی زبان سے ایسی باتیں نکل جاتیں۔ جو نواب کو مکدر کر دیتیں۔ ایک دن دربار میں شرافت و نجابت کا ذکر ہو رہا تھا۔ نواب نے کہا۔ کیوں بھئی انشاء ہم بھی تو نجیب الطرفین ہیں۔ انشا کی زبان سے بے ساختہ نکلا "بلکہ انجب"۔ انجب عربی میں لونڈی بچہ کو کہتے ہیں۔ سعادت علی خاں حقیقت میں لونڈی کے پیٹ سے تھے۔ اس بات پر سارے دربار میں سناٹا چھا گیا۔ اور نواب صاحب کو یہ بات کھٹک گئی۔

اَب انشا کی بات بات پر گرفت ہونے لگی۔ حکم ہوا کہ وہ کسی امیر کے ہاں نہ جائیں۔ صدمہ پر صدمہ یہ گزرا کہ جوان لڑکا تعالی اللہ خاں مر گیا۔ آبحیات میں لکھا ہے اس صدمہ سے انشا پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسی اثناء میں ان کی تنخواہ بھی بند کر دی جس سے فقر و فاقہ تک نوبت پہنچ گئی۔

حیاتِ دبیر کے مصنف نے مرزا[1] اوج کی زبانی لکھا ہے۔ نہ تو سید انشاء مجنون ہوئے اور نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا۔ کہ نہ وہ دربار میں بغیر بُلائے آسکتے تھے اور نہ کہیں آنے جانے کے مجاز تھے۔

خصوصیاتِ کلام انشا کو زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اُنھوں نے زبان کی بیحد توسیع کی۔ وہ پہلے ہندوستانی ہیں۔ جنھوں نے اُردو کی صرف و نحو دریائے لطافت کے نام سے مرتب کی۔

ان کے کلام میں ہمواری اور استقامت نہیں ہے سچ یہ ہے اگر وہ اپنی طبیعت اور زبان پر قابو رکھتے۔ تو اُردو کے اُستادِ اعظم کہلاتے۔

(۱) ظرافت اور مذاق میں سوائے سودا کے ان کا کوئی ہم پلہ نہیں۔

(۲) جامعیت۔ وہ ہر قسم کے مضامین کو اپنے خاص رنگ سے رنگ دیتے تھے۔

(۳) علم و فضل۔ ہر قسم کے علوم پر ان کو عبور تھا۔ پُر لطف قصوں شعروں اور دلیلوں سے اپنے حریف کو ہر وقت مغلوب کر لیتے تھے۔

(۴) ذہانت و طبّاعی۔ ان کی قوتِ تخیئل بجلی سے زیادہ تیز تھی۔ بات بات پر شعر کہتے اور سناتے

[1] مرزا اوج سید انشا کے نواسے تھے ۱۲

پیش کرتے تھے۔

(۵) فارسی۔ عربی۔ پشتو۔ ترکی۔ مارواڑی۔ پوربی۔ پنجابی۔ کشمیری اور ہندی وغیرہ میں بھی اکثر شعر کہتے تھے۔

مشکل اور نئی چیزوں میں ان کو بڑا لطف آتا تھا۔ اُنہوں نے ایک دیوان غیر منقوطہ لکھا ہے۔ نیز کوئی ایسی شعری صنعت نہیں جو اُنہوں نے اپنے اشعار میں صرف نہ کی ہو۔ اگر اُن کو اُردو کا امیر خسرو کہا جائے تو بجا ہے۔

بعض اوقات غیر معمولی مشکل قوافی اُن کے اشعار کو بھونڈا اور مہمل کر دیتے ہیں۔ ایسے اشعار مذاقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں۔ افسوس اس زمانے کے گرے ہوئے مذاق نے ان کی شاعری کو بھی مبتذل روش پر ڈال دیا۔

(۶) ایجاد و اختراع کے میدان میں ان کا پایہ بہت بلند ہے۔

(۷) اپنے وطن کی قدیمی روایات سے ان کو خاص لگاؤ تھا۔

عیوب (۱) انشا کی مثنوی شیر برنج۔ تصوّف اور مذاق کا بے جوڑ میل ہے۔

(۲) تناسب الفاظ کا صحیح اندازہ نہیں۔

(۳) کلام میں ہمواری نہیں۔ غزلوں میں خیالات کی قلت اور الفاظ کی کثرت ہے۔

(۴) قصیدہ اور غزل گوئی میں وہ قواعد شعر سے اکثر بے پروائی برتتے ہیں [حقیقتاً مشکل زمینیں اور قوافی اس امر پر مجبور کرتے ہیں]

(۵) اظہار ظرافت پر قابو نہیں رکھتے۔ اُمرا کو خوش کرنے کے لئے فحش زبانی کرتے ہیں [یہ اُس وقت کا رنگ ہے]۔

(۶) وہ شعر کے بلند درجہ پر فائز نہیں ہوئے۔ کوئی ان کا اعلیٰ مطمح نظر تھا نہ کوئی خاص پیغام اپنی شاعری کے ذریعہ دینا مدنظر تھا۔ [یہ ماحول کا اثر تھا اور نہ ان کا تخیّل بہت بلند تھا]۔

(۷) عموماً کلام بیکار اور خراب ہے۔ اکثر عمدہ اشعار بھی ہیں۔ جو مرتبہ میں کسی طرح کم نہیں [یہ پُرگوئی کا اثر ہے]

(۸) میاں بیتاب کی رائے ہے "انشا کے علم و فضل کو ان کی شاعری نے کھویا اور ان کی شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی درباداری نے ڈبویا"۔

تصانیف (۱) کلیات - دیوان اُردو - دیوان ریختی - قصائد اُردو و فارسی - دیوان فارسی مثنوی فارسی - بے نقط مثنوی فارسی - مثنوی شکار نامہ - مختلف مثنویاں متفرق اشعار اور دیوان بے نقط پر مشتمل ہے (۲) رانی کیتکی کی کہانی ٹھیٹھ ہندی میں (۳) دریائے لطافت یعنی قواعد اُردو (۴) لطائف السعادت غیر مطبوعہ (۵) بحر السعادت غیر مطبوعہ۔

تمام تصنیفات کی مجموعی حالت دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ سید انشا بہ حیثیت ادیب اور شاعر بہت بلند مرتبہ کے مالک ہیں۔ ان کی تصانیف میں اس قدر تنوّع ہے کہ کسی دُوسرے شاعر کو میسّر نہیں۔ تصرّف اور ایجادوں میں انہیں مہارت تامہ حاصل تھی۔

جرأت
متوفی ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء

شیخ قلندر بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ اصلی نام یحییٰ امان تھا۔ والد کا نام حافظ امان تھا۔ سلسلۂ خاندان رائے امان سے ملتا ہے۔ رائے امان محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں دربانی کی خدمت پر مامور تھے۔ وہ نادر شاہی حملہ [۱۷۳۹ء] میں مارے گئے۔ دہلی میں کوچہ "رائے مان" جسے آجکل کوچہ رحمٰن کہتے ہیں انہی کے نام نامی سے موسوم ہے۔

جرأت اپنے وطن سے بہت کمسنی میں نکلے۔ بچپن فیض آباد میں گزرا۔ شروع میں نواب محبّت خاں کی رفاقت میں رہے۔ خود کہتے ہیں ؎

بسکہ گلچیں تھے صد اعشق کے ہم بستاں کے
ہوئے نوکر بھی تو نواب محبّت خاں کے

اس کے بعد ۱۲۱۵ھ ۱۸۰۰ء میں مرزا سلیمان شکوہ کے مُلازم ہوئے۔ اور آخر تک لکھنؤ میں انہی کے دربار سے وابستہ رہے۔ ناسخ نے "ہائے ہندوستان کا شاعر موا" تاریخ وفات کہی۔

جرأت مرزا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ نجوم اور موسیقی کے خوب ماہر تھے۔ بچپن ہی میں آنکھوں کی بصارت جاتی رہی تھی۔ بعض کہتے ہیں۔ یہ حادثہ چیچک سے ہوا۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے۔ "جرأت عاشق مزاج تھے اور پری وشوں کی پُر لطف صحبتوں کے دلدادہ۔ ایک مرتبہ آشوب چشم کے بعد مشہور کر دیا۔ کہ بینائی جاتی رہی۔ اس بہانے رئیسوں کے گھروں میں اندھے بن کر جاتے اور جنس نازک کی پُر لطف صحبتوں کا لُطف اُٹھاتے۔ آخر اس عملِ بد کی پاداش میں وہ سچ مُچ اندھے ہو گئے"۔

جرأت کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن شعر کا شوق اس قدر تھا کہ ہر وقت فکر شعر میں غرق رہتے تھے۔

تصانیف ایک دیوان اور دو مثنویاں لکھی ہیں۔ دیوان میں غزلیں۔ فرد۔ رباعیاں۔ مخمس۔ مسدس۔ ہفت بند۔ ترجیع بند۔ واسوخت۔ ہجو۔ سلام۔ مرثیے۔ غرض سب کچھ موجود ہے۔

خصوصیات کلام جرأت نے فارسی میں کچھ نہیں کہا۔ وہ ایسی محفل کے شاعر تھے۔ جہاں دور شراب چلتا اور عشق و عاشقی کے چرچے رہتے تھے۔ معاملہ بندی ان کا خاص رنگ ہے۔ جو بعض اوقات فحش گوئی تک پہنچ جاتی ہے۔

میر اور جرأت باعتبار رنگ کے ان کا کلام میر صاحب سے ملتا جلتا ہے۔ عاشقانہ غزل کے استاد ہیں لیکن میر کا سا درد ان کے کلام میں نہیں حقیقتاً وہ سطحی شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں بازاری ناز و ادا عشاق کی حرماں نصیبی۔ ہجر کی مصیبتوں اور درباری رقابتوں کے مضامین اکثر پائے جاتے ہیں۔

غزل سے ان کی طبیعت کو بہت مناسبت تھی۔ انہوں نے غزل گوئی میں میر صاحب کے رنگ کو اختیار کیا۔ اور اس کی شیرینی فصاحت اور بلاغت میں ایسی شوخیاں بھریں۔ کہ ایک علیحدہ طرز بنکر خاص و عام میں مقبول ہو گئی۔

میر کا تخیل نہایت بلند اور عاشقانہ رنگ نہایت پاکیزہ ہے۔ برخلاف اس کے جرأت کا عشق ادنیٰ قسم کا ہے۔ میر کے قدردان سخن شناس ہیں اور جرأت کے دلدادہ عوام۔ میر کی شخصیت متانت خودداری۔ استغراق اور گوشہ نشینی کی بدولت سربلند ہے۔ وہ شاعری کو ایک معزز اور مقدس شغل خیال کرتے ہیں۔ جرأت ایک ظریف طبع اور خوش باش آدمی ہیں۔ شاعری کو ذریعہ معاش سمجھتے۔ اور اس فن سے اپنے دوستوں اور سرپرستوں کا دل خوش کرکے گزر اوقات کرتے ہیں۔ وہ میر کی طرح علم و فضل کے جامع نہیں۔ لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے لئے ایک ایسی راہ نکال لی ہے۔ کہ ان کا کلام خاص و عام کو مرغوب ہے۔

ایک دفعہ مشاعرے میں میر صاحب بھی موجود تھے۔ جرأت نے غزل پڑھی۔ ہر طرف سے واہ واہ ہوئی۔ جرأت میر صاحب کے پاس آ بیٹھے۔ اور ان سے اپنے کلام کی داد چاہی۔ میر صاحب نے تیوری چڑھا کر کہا۔ تم شعر کہنا کیا جانو اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔

جرأت نے نظم اُردو کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ جو شاہراہ متقدمین تیار کر گئے تھے۔ اسی پر گامزن رہے۔ کہا جاتا ہے۔ وہ عاشقانہ رنگ کے موجد ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ اسی حد تک درست ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے بگڑے ہوئے مذاق کی پیروی کی۔ اور ایک ایسا رنگ اختیار کیا۔ جس کی تکمیل نواب مرزا خاں داغ نے کی۔

مصحفی
سنہ ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء تا سنہ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء

شیخ غلام ہمدانی نام۔ شیخ ولی محمد کے بیٹے اور امروہے کے رہنے والے تھے۔ آغاز جوانی میں [سنہ ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء] وطن چھوڑ کر دِلّی آئے۔ تکمیل علوم متداولہ کے بعد شاعری کی طرف رجوع کیا۔ کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ مانگ کر کتابیں پڑھتے اور ان کا خلاصہ لکھ کر بطور یادداشت رکھ لیتے تھے۔ سنہ ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں ان کی شعر گوئی نے شہرت حاصل کی۔ وہ خود بھی مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے جن میں انشا۔ میر حسن اور جرأت وغیرہ شریک ہوتے تھے۔

بارہ برس دِلّی میں رہ کر ٹانڈہ آئے۔ اور نواب محمد یار خاں کے پاس قیام کیا۔ پھر لکھنؤ پہنچ کر شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت کی۔ تھوڑے دنوں بعد دِلّی چلے آئے۔ لیکن آب و دانہ پھر لکھنؤ کھینچ لے گیا۔ آخر اسّی برس کی عمر میں انتقال کیا۔

تصانیف مصحفی اُردو اور فارسی کے پُرگو شاعر تھے۔ اُنھوں نے نظیری نیشاپوری کے جواب میں فارسی دیوان مرتب کیا۔ اور ناصر علی اور جلال اسیر کے رنگ میں دو اور دیوان ترتیب دیئے۔ جو چوری ہو گئے۔ ایک تذکرہ فارسی شعرا کا اور ایک اُردو شعرا کا فارسی میں لکھا۔ اس کے علاوہ ایک شاہنامہ بھی تصنیف کیا۔ جس میں شاہ عالم تک بادشاہوں کے حالات درج ہیں۔

مصحفی کی شہرت زیادہ تر ان کے آٹھ اُردو دیوانوں اور تذکرہ شعرائے اردو پر مبنی ہے۔ تذکرہ میں تقریباً ساڑھے تین سو شعرا کا حال درج ہے۔

خصوصیات کلام (۱) مصحفی نہایت زود گو شاعر تھے۔ جب شعر کہتے تو اس طرح معلوم ہوتا جیسے کچھ نقل کر رہے ہیں۔ مشاعروں کے لئے بکثرت اشعار کہتے۔ منتخب اشعار اپنے لئے رکھ کر باقی خریداروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے۔ پُرگوئی سے ان کے کلام میں ناہمواری پیدا ہو گئی۔

(۲) مسلم الثبوت اُستاد تھے۔ اور میر مستحسن خلیق۔ ضمیر۔ آتش۔ شہیدی وغیرہ ان کے دامن تلمذ سے وابستہ تھے۔ اس قدر زیادہ شاگرد کسی اُستاد کو نصیب نہیں ہوئے۔

(۳) قواعد نظم کے سختی سے پابند تھے۔

(۴) کلام میں پرگوئی کی وجہ سے رطب و یابس بہت ہے۔ ہمواری نہیں کہیں میر کا سوز و گداز ہے کہیں سودا کی بلند پروازی۔ کہیں فغاں کی رنگینی۔ کہیں میر سوز کی سادگی۔ کہیں جرأت کی شوخی اور کہیں انشا کا رنگ جھلکتا ہے۔

سودا، میر اور سوز کے تتبع میں بہت سے کہے اشعار ہیں۔ مگر ان جیسی بات پیدا نہیں ہوئی۔

(۵) مصحفی کے کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ وہ متقدمین کے پیرو تھے مختلف اصناف سخن میں انہیں کمال حاصل تھا۔ ملکی خصوصیات ان کے ہاں جرأت سے زیادہ اور انشا سے کم ہیں تخیل میں بلندی ہے نہ جذبات میں دلکشی۔ زبان میں اکثر جگہ میر و سودا کی پیروی کی ہے۔ اگرچہ زمانہ انشاء اور جرأت کا پایا ہے۔

مصحفی اور سید انشا مصحفی اور انشا کے معرکے تاریخ اردو میں بہت مشہور ہیں۔ یہ ہنگامے بسا اوقات مذمت سے گذر کر فحش کی حد تک پہنچ گئے۔

ان ہنگاموں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ پہلے مرزا سلیمان شکوہ کا کلام مصحفی درست کیا کرتے تھے جب انشا پہنچے تو مرزا نے مصحفی سے سلسلہ تلمذ قطع کر کے انشا سے جوڑ لیا۔ بلکہ مصحفی کی تنخواہ بھی کم کر دی۔ یہ بات انہیں بہت ناگوار گذری مشاعروں میں نوک جھوک ہونے لگی۔ اس کے بعد گالم گلوچ تک نوبت پہنچی۔ ایک دن مصحفی کے بہت سے شاگردوں نے شہدوں کا سوانگ بھرا، اور سید انشا کی ہجو کے اشعار پڑھتے ہوئے ان کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ جب سید انشا کو خبر لگی تو انہوں نے بجائے مقابلہ کرنے کے ان کا شاندار استقبال کیا مٹھائیاں کھلائیں۔ اپنی ہجو یں نہایت خندہ پیشانی سے سنیں۔ اور عزت و احترام سے رخصت کیا۔

دوسرے دن سید انشا نے ایک شاندار جلوس ترتیب دیا جس میں لوگ ڈنڈے بجا بجا کر مصحفی کی ہجو گاتے جاتے۔ اور گڈے گڑیا کو آپس میں لڑا لڑا کر یہ شعر پڑھتے تھے؎

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن ‏ ‏ ‏ ‏ لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی اور مصحفن

ان ہنگاموں میں اس وقت کے تمام معزز شعرا شامل تھے۔ بلکہ مرزا سلیمان شکوہ بھی انشا کے ساتھ تھے۔

رنگین ۱۱۶۹ تا ۱۲۵۱ھ ۱۷۵۵ تا ۱۸۳۵ء	سعادت یار خان رنگین طہماسپ بیگ خان طورانی کے فرزند تھے۔ رنگین سرہند میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد طوران سے آکر پہلے لاہور میں ملازم ہوئے۔ پھر دہلی آئے

اور ہفت ہزاری کا منصب اور معزز خطابات پائے۔ رنگین نے پہلے مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت اختیار کی۔ پھر دکن میں توپ خانہ کے افسر ہوگئے۔ آخر کار ملازمت چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔

رنگین انشا کے بہت گہرے دوست تھے۔ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ پہلے شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے پھر میر کا شاگرد ہونا چاہا۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ تم امیرزادے ہو تمہیں شاعری نہیں آسکتی۔ حاتم کے بعد وہ محمد امان نثار کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ ایک جرمن مستشرق نے لکھا ہے کہ مصحفی سے بھی اصلاح لی تھی۔

چونکہ خود امیر اور خوبصورت تھے۔ اس لئے عیش ونشاط کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بے انتہا خلیق اور متواضع شخص تھے۔ تقریباً ۸۰-۸۱ برس کی عمر میں وفات پائی۔

تصانیف	(۱) مثنوی دلپذیر (۲) ایجاد رنگین (مثنوی) (۳) چار دیوان (۴) مثنوی مظہر العجائب

(۵) مجالس رنگین یعنی اس زمانے کے شعرا کے حالات اور تنقیدیں (۶) فرسنامہ یعنی گھوڑوں کی شناخت اور ان کے معالجے۔

ریختی؟	نسلخ کی رائے ہے کہ ریختی کے موجد میاں رنگین ہیں۔ وہ خود بھی اس کے دعویدار ہیں،

لیکن یہ طرز قدیم شعرائے دکن میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً مولانا ہاشمی بیجاپوری وغیرہ کے کلام میں ریختی موجود ہے۔ زیر بحث ریختی اور دکنی ریختی میں فرق یہ ہے کہ دکنی ریختی میں بھاشا کا اثر زیادہ ہے۔ اظہار عشق عورت کی جانب سے کیا جاتا ہے۔ جذبات حقیقی اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے میاں رنگین کی ریختی میں ایسے فحش خیالات اور الفاظ بکثرت ہیں۔ جن سے نفسیاتی جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کی ریختی کا دارومدار عیاشی اور نفس پرستی ہے۔

ہندوستان میں پردے کی رسم۔ قدامت پرستی۔ عدم تعلیم وآزادی اور شرم وحیا کی وجہ سے عورتوں کی زبان قدرتی طور پر مردوں کی زبان سے کسی قدر مختلف ہے۔ اس امتیاز سے انشا اور رنگین نے اپنے خاص اغراض کے لئے ریختی ایجاد کی۔

ریختی اس زمانہ کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا صحیح عکس ہے۔ لکھنؤ کے امرا کی عیش پسندیوں نے

عیش و عشرت کی محفلوں کو فیشن میں داخل کر لیا تھا۔ بازاری عشق و عاشقی کو عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے یہ طرز مقبول خاص و عام ہو گئی۔

جان صاحب | میر یار علی "جان صاحب" نے ریختی کو معراج پر پہنچایا۔ وہ میر امن کے بیٹے تھے۔ اصلی وطن لکھنؤ تھا۔ لیکن ملازمت کی وجہ سے رامپور میں رہتے تھے۔ اس خاص صنف میں وہ خوب کہتے تھے۔ مشاعروں میں زنانہ لباس پہن کر آتے اور بالکل عورتوں کی طرح پڑھ کر سننے والوں کو خوش کرتے تھے۔

جان صاحب تلاش روزگار میں دہلی اور بھوپال بھی گئے۔ آخر کار نواب کلب علی خاں والئے رامپور کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ انہوں نے ستر برس سے زیادہ کے سن میں ۱۸۹۷ء میں انتقال کیا۔

یہ صنف شاعری اب کوئی پسند نہیں کرتا۔ البتہ وہ ظریفانہ اشعار پسند کئے جاتے ہیں جو تہذیب سے گرے ہوئے نہیں ہوتے۔

شاہان دہلی

شاہ عالم ثانی ۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۶ء | آخر زمانہ کے شاہان دہلی شاعروں کے قدردان اور خود شاعر تھے۔ شاہ عالم ثانی آفتاب تخلص کرتے تھے۔ اور فارسی اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ سودا۔ میر۔ نصیر۔ انشا۔ ممنون۔ احسان وغیرہ سب ان کے وظیفہ خوار تھے۔

مرزا سلیمان شکوہ متوفی ۱۸۳۷ء | مرزا سلیمان شاہ عالم شاہ ثانی کے تیسرے بیٹے سلیمان تخلص کرتے تھے۔ غلام قادر نمک حرام کی بغاوت کے بعد دہلی سے لکھنؤ میں جا بسے تھے۔ نواب آصف الدولہ ان کو چھ ہزار روپے ماہوار اخراجات کے لئے دیتے تھے۔ نواب سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر ان سے جھک کر ملتے تھے۔ ۳۸ سال لکھنؤ میں رہے۔ پھر اکبر آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانہ میں کئی بار دہلی آئے۔ آخر ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا اور سکندرہ میں دفن ہوئے۔

مرزا سلیمان شعرا کی بہت قدر کرتے تھے۔ پہلے شاہ حاتم کے شاگرد تھے پھر مصحفی کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ آخر میں انشا کے شاگرد ہوئے۔ دہلی سے جو اٹھتا سیدھا ان کے دربار میں حاضر ہوتا۔ وہ فیاضانہ

سلوک کرتے تھے۔ مصحفی۔ قتیل۔ انشا اور میر حسن وغیرہ سب انہی کی سرکار سے وابستہ تھے۔

اکبر شاہ ثانی
۱۷۵۹ء تا ۱۸۳۷ء

اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی شاہ عالم ثانی کے دوسرے بیٹے تھے وہ ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۰۶ء میں تخت پر بیٹھے اور ۱۸۳۷ء میں انتقال کیا۔

اکبر شاہ موزوں طبع تھے۔ اپنے باپ کے تخلص آفتاب کی رعایت سے شعاع تخلص کرتے تھے خود شعر کم کہتے لیکن شعرا کی بڑی قدر کرتے تھے۔ نظام الدین ممنون۔ غالب۔ علی خاں بیدار اور شاہ نصیر وغیرہ ان کے درباری شاعر تھے۔

بہادر شاہ ثانی متخلص بہ ظفر
۱۷۷۵ء تا ۱۸۶۲ء

اکبر شاہ ثانی کے بیٹے اور خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار تھے ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ باپ کے بعد ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھے۔ اور ۱۸۵۷ء کے غدر میں معزول ہو کر رنگون جلا وطن کئے گئے۔ وہیں ۱۸۶۲ء میں فوت ہوئے۔

ظفر شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ اپنا سارا وقت شاعری میں صرف کرتے تھے، پہلے شاہ نصیر سے استفادہ سخن کرتے تھے۔ ان کے بعد ذوق کے شاگرد ہوئے۔ ذوق کے انتقال کے بعد غالب کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ فن موسیقی میں بھی دسترس رکھتے تھے اور خوشنویس بھی اچھے تھے۔

کلیات ظفر بہت ضخیم ہے۔ ان کی اکثر غزلیں لوگ بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غالب اور ذوق ان کو غزلیں کہہ کر دیتے تھے۔

خصوصیات کلام

کلام بہت صاف، سادہ اور خاص درد و اثر رکھتا ہے۔ اکثر اشعار ان کے مصائب کی سچی تصویریں ہیں۔ خیالات بلند۔ تشبیہیں رنگین اور جذبات و مشاہدات دلنشین۔ مشکل بحروں اور سخت قافیہ ردیف میں بھی خوب کہتے ہیں۔

قائم چاند پوری
متوفی ۱۲۱۰ھ ۱۷۹۵ء

شیخ قیام الدین نام۔ چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے دہلی میں توپخانہ کے داروغہ تھے پہلے اپنا کلام خواجہ میر درد کو دکھاتے تھے۔ بعد میں سودا کے شاگرد ہوئے انہوں نے ایک تذکرہ بھی لکھا تھا۔ دہلی کی تباہی کے بعد ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں کے پاس جا رہے تھے۔ پھر رامپور چلے گئے اور وہیں ۱۲۱۰ھ ۱۷۹۵ء میں انتقال کیا۔

خصوصیات کلام

وہ اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ قطعات اور رباعیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے پختگی کلام کی وجہ سے وہ استادوں کے دوش بدوش تھے۔ تذکرہ گلشن ہند میں مرقوم ہے،

مضمون تراشی اور معنی بندی میں سودا اور میر کے بعد کسی سخن گو کا قائم جیسا اسلوب نہیں ہوا۔

مِنّت
متوفی سنہ ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ء

میر قمر الدین منّت دہلی کے باشندے۔ ننھیال کی طرف سے سید جلال بخاری کی اولاد سے تھے۔ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ رُوحانی تعلیم مولانا فخر الدین سے حاصل کی اور شعر و شاعری میں میر نور الدین نوید اور میر شمس الدین فقیر کی شاگردی کی۔ منّت بہت پُر گو شاعر تھے۔ ایک کلیات تقریباً ڈیڑھ لاکھ اشعار کا یادگار ہے۔ ایک فارسی مثنوی شکرستان نام شیخ سعدی کی گلستان کے جواب میں لکھی تھی۔

سنہ ۱۱۹۱ھ / ۱۷۷۷ء میں دہلی سے لکھنؤ آئے۔ دہلی سے مسٹر جانسٹن ان کو مارکوئس آف ہیسٹنگز کے پاس کلکتہ لے گئے۔ انہوں نے ملک الشعرائی کا خطاب دیا۔ سنہ ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۵ء میں گورنر جنرل نے ایک خاص سفارت پر حیدر آباد دکن بھیجا۔ وہاں نظام کی مدح میں قصیدہ پیش کر کے گراں بہا انعام پایا۔ حیدر آباد سے عظیم آباد آ کر مہاراجہ تکیت رائے کی مصاحبت میں چند دن رہے۔ پھر کلکتہ آ گئے۔ اور وہاں پہنچتے ہی سنہ ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ء میں انتقال کیا۔

ممنون
متوفی سنہ ۱۲۰۸ھ / ۱۸۴۴ء

میر نظام الدین نام۔ میر قمر الدین منّت کے بیٹے۔ آبا و اجداد سونی پت کے رہنے والے تھے۔ لیکن وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کو فخر الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ کچھ دنوں اجمیر میں صدر الصدور کے عہدہ پر سرفراز رہے۔ پھر دہلی آ گئے اور سنہ ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں انتقال کیا۔ اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ مفتی صدر الدین خان آزردہ جیسے بلند مرتبہ لوگ ان کے شاگرد تھے۔ ان کا دیوان کمیاب ہے۔

حسرت دہلوی
متوفی سنہ ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء

مرزا جعفر علی نام، ابو الخیر عطار کے بیٹے۔ شروع میں عطاری کرتے تھے۔ فن شعر گوئی میں ایسا کمال حاصل کیا کہ شاہ عالم ثانی کے مخصوص شعرا میں داخل ہوئے۔ غلام قادر نمک حرام کی بغاوت انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس وقت کی لُوٹ مار اور شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکالنے کا منظر بہت دردناک پیرائے میں نظم کیا ہے۔

اِس ہنگامے کے بعد حسرت فیض آباد چلے گئے۔ فیض آباد اس وقت اودھ کا دار السلطنت تھا، وہاں نواب شجاع الدولہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ اس کے صلے میں کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا، سنہ ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۰ء میں جب لکھنؤ دار السلطنت ہوا تو دوستوں کے اصرار پر حسرت لکھنؤ چلے گئے۔ میاں جراءت

انہی حسرت کے شاگرد خاص تھے حسرت امرا کی طرح رہتے اور ہمیشہ پالکی میں سوار ہوکر نکلتے تھے ہمعصر شعرا رشک کھاتے تھے۔ چنانچہ سودا نے بھی ان کی ہجو لکھی ہے۔

شاہزادہ سلیمان شکوہ بھی حسرت کو کچھ وظیفہ دیتے تھے۔ ان کے شاگرد اس قدر زیادہ تھے کہ وہ خود پہچان بھی نہ سکتے تھے۔ جرأت اور نواب محبّت خاں ان کے بہت مشہور شاگرد ہیں۔ حسرت نے ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء میں بمقام لکھنؤ انتقال کیا۔

خصوصیات کلام تصنیفات میں ایک کلیات یادگار ہے۔ اس میں ہر قسم کے اصناف سخن موجود ہیں۔ ان کا خاص انداز سخن یہ ہے۔ کہ غزل کو اکثر قطعہ پر ختم کرتے ہیں۔ انکی غزلوں میں عموماً ایک ہی مضمون مسلسل ہوتا ہے۔

قدرت
متوفی ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء

شاہ قدرت اللہ میر شمس الدین فقیر کے برادر عمزاد تھے۔ کوئی عجب نہیں کہ انہی کے شاگرد بھی ہوں۔ نساخ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے مرزا مظہر جان جاناں اور جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔

خصوصیات کلام میر صاحب نے ان کو "عاجز سخن" کا خطاب دیا ہے۔ مگر میر حسن اور لطف نے اپنے تذکروں میں بے حد تعریف کی ہے۔

بیدار
متوفی ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء

میر محمد علی عرف میر محمدی، بیدار تخلص کرتے تھے۔ خواجہ میر درد کے دوست اور شاگرد تھے۔ فارسی میں مرتضیٰ قلی خاں فراخ سے اصلاح لیتے تھے۔ کہتے ہیں شاہ حاتم کو بھی کلام دکھایا تھا۔ مولانا فخر الدین کے مرید تھے۔ آخر عمر میں دہلی سے آگرہ گئے۔ جہاں ۱۷۹۴ء میں انتقال کیا۔ بیدار میر اور مرزا کے ہمعصر تھے۔ دو دیوان یادگار ہیں۔ کلام میں صفائی اور تصوف کا رنگ خوب ہے۔

نمونۂ کلام

بیدار راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی — صحرا میں قیس، کوہ میں فرہاد رہ گیا
ربط جو چاہیے بیدار سو اس سے معلوم — مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

ہدایت
متوفی ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء

ہدایت اللہ خاں دہلوی، خواجہ میر درد کے شاگردوں اور مریدوں میں سے تھے، ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء میں فوت ہوئے۔ صاحب دیوان شاعر ہیں۔ میر اور میر حسن ان کے کمالات شاعری کی تعریف کرتے ہیں۔

فراق حکیم ثناء اللہ خاں نام، ہدایت اللہ خاں کے بھتیجے، خواجہ میر درد کے مرید اور شاگرد۔ مشاہیر زمانہ میں سے تھے۔ اور دہلی کے بڑے نامور حکیم تھے۔ مصحفی اور میر حسن ان کی تعریفیں کرتے ہیں میر حسن سے

ان کی بہت دوستی تھی۔

ضیا | میر ضیاء الدین دہلوی سودا کے ہمعصر تھے۔ دہلی سے فیض آباد اور وہاں سے لکھنؤ اور عظیم آباد گئے۔ جہاں مہاراجہ شتاب رائے کے بیٹے راجہ بہادر متخلص بہ راجہ ان کے شاگرد ہوئے۔ پٹنہ میں انتقال کیا۔

خصوصیات کلام | مرزا علی لطف لکھتے ہیں سنگلاخ زمین میں اشعار لکھنا اور نامقبول الفاظ کو مقبول بنانا انہی کا کام ہے۔ میر حسن نے بھی ان کی تعریف کی ہے۔ میر حسن ابتدا میں انہی کے شاگرد ہوئے تھے۔ قصیدے اور مثنوی کہنے کا شوق نہ تھا۔ سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کہنے میں بہت مشاق تھے۔

کل کی رسوائی تجھے کچھ کم نہ تھی اے ننگ خلق
اس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا (ضیاء)

بقا
متوفی ۱۲۰۶ھ ۱۷۹۱ء | شیخ بقاء اللہ حافظ لطف اللہ خوشنویس کے بیٹے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں جا رہے تھے۔ فارسی میں مرزا فاخر مکین اور اردو میں شاہ حاتم اور خواجہ میر درد کے شاگرد تھے۔ اردو میں بقا اور فارسی میں حزیں تخلص کرتے تھے۔ میر اور سودا کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان دونوں سے انکی اکثر چوٹیں رہا کرتیں ؎

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر | اور بستی نہیں یہ دلّی ہے
میر و مرزا کی شعر خوانی نے | بسکہ عالم میں دھوم ڈالی ہے
کھول دیوان دونوں صاحب کے | اے بقا ہم نے جب زیارت کی
کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن | ایک تو تو کہے ہے ایک ہی ہی

مفلسی سے تنگ آکر انہوں نے تسخیر کواکب کے اعمال شروع کئے۔ آخر دماغ خراب ہو گیا۔ ۱۲۰۶ھ ۱۷۹۱ء میں ہر طرف سے مجبور ہو کر عتبات عالیات کی زیارات کو گئے مگر راستہ ہی میں دوسرے جہان کا سفر پیش آ گیا۔ اپنے زمانہ کے مشہور صاحب دیوان شاعروں میں سے ہیں۔

حزیں | میر محمد باقر نام، حزیں تخلص۔ مرزا مظہر جان جاناں کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ اپنے بزرگ استاد سے بہت عقیدت رکھتے تھے ؎

جس طرح جی چاہتا ہے ہو نہیں سکتی حزیں | حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

مصائب روزگار سے تنگ آکر پٹنہ عظیم آباد پہنچے۔ وہاں نواب صولت جنگ نے بڑی قدر کی۔

ایک دیوان یادگار ہے ؎

نمونہ کلام | کچھ کہا شاید اس نے قاصد سے — دل میں میرے وہ اضطراب نہیں
ہر نصیحت میں تری مانوں گا اے ناصح پر ایک — دلبروں کے دیکھنے میں جی مرا جاتا ہے

بیان
متوفی ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء

خواجہ احسن اللہ بیان کشمیری النسل تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ مرزا مظہر کے شاگرد اور مولانا فخرالدین کے مرید تھے۔ آخر عمر میں حیدرآباد گئے اور نواب آصف جاہ ثانی کی ملازمت میں عزت کی زندگی بسر کی۔ ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء میں انتقال کیا۔

میر حسن نے اپنے تذکرہ میں ان کی تعریف لکھی ہے۔ رباعیات خوب کہتے تھے۔

نمونہ کلام | مصلحت ترک عشق ہے ناصح — لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا
کافر ہوں گر زیادہ کچھ اس سے آرزو ہو — ایک بے خلل مکاں ہو بس میں ہوں اور تو ہو

راسخ
۱۱۶۲ھ تا ۱۲۴۰ھ / ۱۷۴۸ء تا ۱۸۲۴ء

شیخ غلام علی نام، ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۸ء میں پٹنہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ اور چھتر برس کے سن میں وہیں انتقال کیا۔

شروع میں مرزا فدوی اور مرزا اثر کو کلام دکھاتے تھے۔ مگر پھر میر تقی میر کے شاگرد ہو گئے۔ میر صاحب ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء تک کلکتہ۔ غازی پور۔ دلی۔ لکھنؤ کی سیاحت کی۔ اس کے بعد اپنے وطن میں زمین گیر ہو گئے اور شاعری کا مشغلہ بہت زور شور سے جاری رکھا۔

زبان پاکیزہ طرز بیان صاف اور سادہ ہے۔ سادہ اشعار کے ساتھ ساتھ رنگین اشعار بھی انکے کلام میں ملتے ہیں۔

(۸)

اساتذۂ لکھنؤ

ناسخ و آتش کا زمانہ

دربار لکھنؤ | اب شاعری کا مرکز دہلی سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ اس تغیر کے اسباب مندرجہ ذیل تھے:۔

(۱) سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہت کمزور تھے اور محض نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔

(۲) نادر شاہی حملے نے قصرِ سلطنت کی بُنیادوں کو ہلا ڈالا۔

(۳) ابھی نادر شاہی تباہی کے اثرات دُور نہ ہونے پائے تھے کہ احمد شاہ درّانی اور مرہٹوں کے قتل و غارت نے عوام میں افراتفری ڈال دی۔

(۴) غلام قادر نمک حرام نے شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکلوادیں، اور انہیں قید کر کے مُغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھیر دیا۔

لکھنؤ کا دربار شعرا کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا۔

اس عام بدامنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اچھے اچھے لوگ دہلی چھوڑ کر اِدھر اُدھر نکل گئے۔ میر، سودا، میر حسن اور انشا وغیرہ بھی انہی دنوں میں دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوئے۔

بُرے نتائج

(۱) اس دور سے پہلے شعرا اپنا اپنا خاص رنگ رکھتے تھے۔ نوابانِ لکھنؤ کی عیش پرستیوں نے ان کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ شعرا نے اپنی عزت اور خودداری کو چند روپوؤں کے بدلے اُمرا کے ہاتھ بیچ دیا۔

(۲) درباری مصاحبت اور رفاقت سے مرتبۂ شاعری پست ہو گیا۔

(۳) شاعری محض رسمیات اور تکلفات میں اُلجھ کر رہ گئی۔ اور الہامی اور عرفانی رنگ کھو بیٹھی۔ میر، سودا، انشا اور مصحفی پہلے بھی وظیفہ خوار تھے لیکن نہایت آزاد طبع۔ لکھنؤ کے دربار میں پہنچ کر ان کی شاعری بھی اُمرا کے ہاتھ بک گئی اور وہ اُمرا کی پسند کے مطابق شعر کہنے پر مجبور ہو گئے۔

طرزِ لکھنؤ

لکھنؤ میں شاعری کا مذاق شعرائے دہلی نے پھیلایا۔ شعرائے دہلی کے لکھنؤ میں جمع ہونے سے وہاں شاعری کا عام چرچا ہو گیا۔ بادشاہ شعرا کو بہت عزت سے اپنی مصاحبت میں رکھتے اور بڑی بڑی جاگیریں دیتے تھے۔ عوام الناس اور امرا بھی شاعری کے دیوانے ہو رہے تھے۔ روزانہ مشاعرے ہوا کرتے اور شعرا خراجِ تحسین وصول کرتے تھے۔

ان مشاعروں سے شعر میں جذبۂ تقابل پیدا ہو گیا۔ اور ایک نئی طرز کی بُنیاد پڑی۔ جس کے پیشوائے اعظم ناسخ ہیں۔ جدّت پسند طبیعتیں قدامت پرستی چھوڑ کر اپنے نام و نمود کے لئے نئی راہیں نکالنا چاہتی تھیں۔

جدید طرزِ لکھنؤ

ناسخ اور ان کے معاصر اپنی تمام توجہ شعر کے حُسنِ ظاہری۔ رعایتِ لفظی اور صنائع بدائع پر

صرف کرنے لگے یعنی حسن الفاظ پر بلند خیالی اور مصوری جذبات کو قربان کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے تکلفی اور سادگی جاتی رہی۔ تکلف اور تصنع کی بھرمار ہونے لگی اثر اور درد کی جگہ اغراق۔ غلو اور دوراز کار تشبیہوں نے لے لی۔ اصل میں یہ رنگ صائب اور بیدل کے کلام سے اُڑایا گیا تھا۔ صائب کی طرح پہلے مصرع میں دعویٰ کیا جاتا اور دوسرے مصرع میں مثال پیش کی جاتی تھی۔ بیدل کے تتبع میں نازک خیالیوں سے کام لیا گیا۔ لیکن اُردو میں یہ طرز گورکھ دھندا بن کر رہ گئی۔ طرز لکھنؤ دماغ کو ضرور لطف اندوز کرتی ہے۔ لیکن دل پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ اس سے جدت پسند طبیعتیں بہت جلد اُکتا گئیں۔ اور انیس و دبیر کی جادو نگاری اور غالب و مومن کی مضمون آفرینی سے لطف اندوز ہونے لگیں۔

ناسخ اور ان کے شاگردوں کے کلام سے اس زمانہ کے نسائیت پسند مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے ارشادات میں سے عورتوں کی آرائش کے سامان کی ایک لمبی چوڑی فہرست تیار ہو سکتی ہے اکثر اوقات زبان بھی زنانہ استعمال کی جاتی ہے۔ شعرائے لکھنؤ ایک ایک زمین میں سہ غزلے اور چوغزلے کہتے تھے۔ اس طوالت سے اکثر بے لطفی اور بدمزگی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس خراب رسم کی بنیاد مصحفی اور جرأت نے ڈالی تھی۔

| طرز دہلی | زنانہ طرز گفتگو شعرائے دہلی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ وہ جذبات کی تصویر نہایت

پُر اثر، سادہ اور نرم الفاظ میں کھینچتے ہیں اور فارسی کے انداز میں چھوٹی چھوٹی غزلیں کہتے اور پامال و فرسودہ خیالات سے احتراز کرتے ہیں۔

| تحقیق الفاظ کا زمانہ | اس دور میں ناسخ نے تحقیق الفاظ اور رعایت لفظی کو رواج دیا۔ یہ طرز لکھنؤ اور رامپور میں بہت مقبول تھی۔ رشک۔ بحر۔ سحر۔ منیر۔ جلال۔ برق۔ واجد علی شاہ۔ اختر و اسیر وغیرہ ہمیشہ صحیح الفاظ اور محاورے لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس چھان بین میں بہت سے الفاظ نکال ڈالے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لغات شعریہ بہت کم رہ گئے جس سے زبان میں کرختگی پیدا ہو گئی کیونکہ ایک تو الفاظ کم تھے۔ دوسرے ان کو مخصوص انداز سے استعمال کیا جاتا تھا لکھنؤ کی جدید طرز نے دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں اختلاف پیدا کر دیئے۔ لکھنؤ والے بعض محاورات اور الفاظ کو خاص محل پر خاص انداز سے استعمال کرتے تھے اور اس بات کے مدعی تھے کہ ہمارا طریقہ

زیادہ فصیح ہے۔ ایسے اختلافات کا صرف و نحو پر بھی اثر پڑا۔ اکثر الفاظ کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ہو گیا۔ اس کی ابتدا میر علی اوسط رشک شاگرد ناسخ نے کی۔ ان کے بعد سے ابتک شعرائے دہلی اور لکھنؤ ان باتوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

ناسخ متوفی ۱۸۳۸ء شیخ امام بخش نام، اردو زبان کے بہت بڑے شاعر اور طرز لکھنؤ کے موجد۔ ان کے خاندانی حالات معلوم نہیں ہوئے، کہتے ہیں لاہور کے ایک مشہور دولتمند خدا بخش نام سوداگر خیمہ دوز کے متبنیٰ تھے۔ اسی سوداگر نے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ سوداگر کے مرنے کے بعد اس کے بھائیوں نے وراثت کا جھگڑا اٹھایا اور پھر ان کو زہر دینے کی کوشش کی۔ وہ ان کو اپنا غلام کہتے تھے۔ آخر کار کچھ مصالحت ہو گئی۔

فارسی اور عربی انہوں نے حافظ وارث علی اور علمائے فرنگی محل سے لکھنؤ میں پڑھی۔ وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ شاعری میں کس کے شاگرد تھے۔ کہتے ہیں میر کے پاس گئے تھے لیکن اُنہوں نے انکار کر دیا۔ مصحفی لکھتے ہیں۔ وہ میر صاحب کے شاگرد تنہا سے اصلاح لیتے تھے۔ لیکن یہ تعلق زیادہ مُدت قائم نہیں رہا۔ مشاعروں میں بڑے زور شور سے غزلیں پڑھتے تھے۔ آخر زور کلام نے اُستاد بنا دیا۔ اور بہت سے لوگ ان کے پاس اصلاح لینے کے لئے آنے لگے۔

ورزش کا شوق ناسخ کو ورزش کا بہت شوق تھا۔ بڑے قوی ہیکل تھے۔ رنگ کالا سیاہ تھا۔ ان کے حریف انہیں "دُم کٹا بھینسا" کہا کرتے تھے۔ خوش خور اس قدر تھے کہ پانچ سیر غذا ایک وقت میں کھا جاتے تھے۔ لیکن کھاتے ایک ہی وقت تھے۔ روزانہ صُبح اُٹھ کر ورزش کرتے پھر نہا دھو کر اپنے دوستوں سے ملتے۔ قریب بارہ بجے کے کھانا کھاتے، اور تھوڑی دیر آرام کرتے شام کو دوست احباب جمع ہوتے اور مشق سخن ہُوا کرتی۔ رات کو فکر سخن فرماتے، اور شاگردوں کی غزلیں وغیرہ درست کرتے۔ اکثر لوگ انہیں پہلوان سخن کہتے تھے۔

لکھنؤ کے بڑے بڑے اُمرا ان سے ملنے آتے تھے۔ ساری عمر کسی کی مُلازمت نہیں کی۔ لیکن قدر دانوں کی بدولت ہمیشہ آرام سے زندگی بسر کی۔ مشہور ہے نواب آغا میر نے ۱۸۳۱ء میں انہیں سوا لاکھ روپیہ دیا تھا۔

ایک مرتبہ غازی الدین حیدر بادشاہ نے اپنے دربار سے متعلق کرنا چاہا۔ اور خطاب

ملک الشعرائی کا وعدہ کیا۔ ناسخ اپنی آزادی بیچنا نہیں چاہتے تھے۔ کہلا بھیجا کہ نہ تو آپ کا شاہانِ دہلی جیسا مرتبہ ہے اور نہ سرکار انگریزی جیسا اقتدار، پھر میں آپ کا خطاب لے کر کیا کروں گا۔ بادشاہ نے اس حقارت آمیز جواب سے ناراض ہو کر جلاوطنی کا حکم دیدیا۔

ویران مثلِ وادیٔ وحشت ہے لکھنؤ
سُنتے ہیں ناسخ آج وطن سے نکل گیا

ناسخ لکھنؤ سے الہ آباد گئے۔ یہاں راجہ چندو لال دیوان حیدر آباد دکن نے بارہ ہزار روپیہ اور قدر و منزلت کے وعدے کر کے بُلا بھیجا۔ لیکن انہوں نے حُبِّ وطن کے جوش میں اتنی دُور جانے سے انکار کر دیا۔ مشہور ہے ایک دفعہ پھر پندرہ ہزار روپے بھیجے تھے اور انہوں نے دوبارہ انکار کر دیا تھا۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد ناسخ لکھنؤ واپس آئے۔ لیکن مہدی کی دُشمنی کی وجہ سے پھر وطن چھوڑنا پڑا۔ اب کی مرتبہ فیض آباد۔ الہ آباد۔ بنارس۔ کانپور اور پٹنہ میں تھوڑی مُدّت رہے۔ آخر ۱۸۳۲ء میں حکیم مہدی نے انتقال کیا۔ اور ناسخ اپنے محبوب وطن میں واپس آگئے۔ جہاں پندرہ سال آرام سے گزار کر ۱۸۳۸ء میں انتقال کیا۔ میر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی۔

دِلا شعر گوئی اُٹھی لکھنؤ سے

تصانیف ناسخ کے تین دیوان ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ناسخ نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ مدحیہ قطعات اکثر ملتے ہیں۔ ہجو اور مذاقیہ اشعار بھی ان کے دیوان میں نہیں۔ مثنوی سراج اور ایک مولود بھی آپ کی تصنیف ہے۔ لیکن آپ کی شان کے شایاں نہیں۔

ناسخ کا اثر ناسخ کی شہرت کے تین سبب ہیں (۱) قادر الکلامی (۲) طرز جدید (۳) مشہور شاگردوں کی جماعت۔ وہ اپنے زمانہ کے مسلم الثبوت اور مستند شاعر تھے۔ سودا اور میر کے زمانے کے الفاظ سے اجتناب کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بڑا نقص یہ ہے کہ انہوں نے الفاظ کی تحقیق میں زیادہ دِقّت نظر سے کام نہیں لیا۔ عربی فارسی کے ایسے مُشکل الفاظ غزلوں میں موزوں کر ڈالے کہ غزل ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ان کا کلام حُسن ظاہری سے آراستہ مگر تاثیر سے خالی ہے۔

غزل ناسخ ناسخ کی غزلیں شاندار الفاظ اور نادر تشبیہات کا مجموعہ ہیں۔ مگر جذبات و اثر سے عاری، تصنع ان کے کلام میں بہت ہے حُسن الفاظ کو شاعری کی غرضِ اصلی سمجھتے ہیں۔ اکثر اوقات مناسبت

الفاظ کی نگہداری میں اصل مضمون خبط ہو جاتا ہے۔ غزلوں میں صائب اور بیدل کا رنگ جھلکتا ہے۔ تصوف اور ظرافت نام کو نہیں۔ ان کی ہنسی بناوٹی اور مذاق پھس پھسا ہے۔ کہیں کہیں مذہبی حملے بھی کرتے اور طعن و تشنیع سے کام لیتے ہیں۔ یہ باتیں ان جیسے بلند مرتبہ شاعر کے مُنہ سے کچھ بھلی معلوم نہیں ہوتیں۔

تاریخ گوئی | تاریخ گوئی میں ان کو خاص مہارت تھی۔ بات بات پر نہایت عمدہ اور دلچسپ تاریخ کہہ ڈالتے تھے۔ یہ تاریخیں اس حیثیت سے زیادہ قابلِ قدر ہیں کہ ان سے اکثر نامی گرامی شعرا اور مشاہیر کے سنین وفات اور خاص حادثات اور واقعات کا پتہ چلتا ہے مثلاً گھسیٹے خاں کی تاریخ وفات کس قدر لطیف ہے ع

افسوس کہ موت نے گھسیٹا

قصیدہ | ناسخ کو شکوہ الفاظ کا بہت شوق تھا۔ اور شکوہ الفاظ قصیدہ گوئی کی جان ہے لیکن تعجب ہے کہ انہوں نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا معلوم ہوتا ہے ان کی بلند فطرت خوشامد درآمد کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ غالباً اسی لئے انہوں نے اپنے آپ کو کسی رئیس کے دربار سے بھی وابستہ نہیں کیا۔

نقائص | ناسخ کے کلام میں بلند خیالات مفقود ہیں۔ شعر پڑھنے سے کوئی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ اکثر اشعار بے لوچ ہیں تصنّع اور تکلّف بہت ہے۔ فارسی تشبیہات اُردو کے جامہ میں بھدی معلوم ہوتی ہیں۔ ادق اور ثقیل فارسی الفاظ طبیعت پر گراں گذرتے ہیں۔ ہر جگہ شعر کی لفظی آرائش مقدم ہے اس لئے اکثر خیالات پست ہو گئے ہیں۔ ان پر سرقہ کا الزام بھی لگایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ الزام کچھ وزن نہیں رکھتا۔

ناسخ کے کارنامے | ناسخ اپنے تخلّص کے اعتبار سے طرزِ قدیم کے ناسخ گنے جاتے ہیں۔ یہ شوق ان کے دل میں مرزا حاجی صاحب رئیس کی پُرلطف صحبتوں سے پیدا ہوا تھا حقیقتاً ناسخ کی شاعری کو اسی بزرگ کی وجہ سے بیحد فروغ ہوا۔ انہوں نے مندرجہ ذیل تغیرات غزل میں کیے:۔

(۱) سب سے پہلے لفظ اُردو بجائے ریختہ استعمال کیا (۲) اکہری ردیف کی غزلیں کہیں (۳) افعال میں تغیر کیا مثلاً آئے ہے جائے ہے کی جگہ آتا ہے جاتا ہے استعمال کیا اور آئیاں دکھائیاں وغیرہ ترک کیا (۴) قدما کے فحش الفاظ اور محاورات کو ترک کیا (۵) عربی فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو رواج دیا (۶) ہندی لفظوں کو بے ضرورت خارج کیا (۷) تذکیر و تانیث کے سخت قواعد مقرر کیے۔

ناسخ نے غزل کا دائرہ وسیع کیا اور الفاظ کا صحیح استعمال کرنا سکھایا۔ وہ مقرر کردہ قواعد پر خود بھی سختی سے عمل پیرا تھے۔ اور شاگردوں کو بھی سخت تاکید کرتے تھے۔

شاگرد ناسخ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں وزیر۔ برق۔ رشک۔ بحر۔ منیر۔ مہر۔ نادر۔ آباد۔ ظاہر وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

برق ۱۸۵۷ء فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق۔ مرزا کاظم علی خاں کے بیٹے۔ اور واجد علی شاہ بادشاہ کے مصاحب اور اُستاد تھے۔ بادشاہ سے ان کو بہت محبت تھی چنانچہ بادشاہ معزول ہو کر کلکتہ گئے تو وہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہیں ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا۔

برق شاعری کے علاوہ بانکپن میں بھی مشہور تھے۔ بانک۔ بنوٹ اور تلوار کے ہاتھ خوب جانتے تھے۔ شاعری میں اپنے اُستاد ناسخ کی پیروی کرتے تھے۔ ان کے کلام میں اُستاد کی طرح تصنع اور تکلف بہت ہے مگر زبان پر قدرت اور شعر میں مزہ بھی ہے۔ ایک ضخیم دیوان یادگار ہے۔ جس میں تمام اصناف سخن موجود ہیں۔ لکھنؤ کی تباہی بڑے دردناک پیرائے میں نظم کی ہے۔ جلال اور سحر ان کے مشہور شاگرد ہیں۔

نمونہ کلام

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا — کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

قیس کا نام نہ لو ذکرِ جنوں جانے دو — دیکھ لینا مجھے تم موسمِ گل آنے دو

بحر متوفی ۱۸۸۳ء شیخ امداد علی بحر شیخ امام بخش کے بیٹے اور حضرت ناسخ کے شاگرد تھے۔ ان کی ساری عمر پریشانی اور تنگدستی میں گذری۔ نواب کلب علی خاں والئے رامپور کے دربار سے وابستہ تھے۔ پچھتر برس کی عمر میں وہیں انتقال کیا۔

ان کے کلام میں پیچیدہ مثالیں اور دقیق استعارات پائے جاتے ہیں۔ ناسخ کی طرح تصنع اور تکلف کی بھرمار نہیں۔ اکثر اشعار نہایت سادہ اور پُر اثر ہیں۔ بحر صحتِ الفاظ اور تحقیقِ لغات کے اُستاد تھے۔ ناسخ اور رشک کے بعد ان کا درجہ بہت اونچا تھا۔

نمونہ کلام

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا — میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں — دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں

آباد مرزا مہدی حسن خاں آباد مرزا غلام جعفر کے بیٹے اور نوابانِ فرخ آباد کے رشتہ دار تھے۔

۱۸۱۳ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ شعر گوئی کے بڑے شوقین تھے۔ اپنے مکان پر باقاعدہ مشاعرہ منعقد کرتے تھے۔ نہایت پُر گو شاعر تھے۔ دو دیوان یادگار ہیں۔ ان کے کلام میں کوئی خصوصیت نہیں۔ کہیں کہیں کوئی شعر پھڑکتا ہوا نکل آتا ہے۔

خواجہ وزیر
متوفی ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۳ء

خواجہ محمد وزیر نام، وزیر تخلص۔ خواجہ محمد فقیر کے بیٹے۔ ددھیال کی طرف سے حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبند کے خاندان سے متعلق ہیں۔ لکھنؤ میں خاندانی وقار اور ذاتی تقدس کی وجہ سے عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ شعر گوئی میں ناسخ کے شاگرد تھے۔ آخر عمر میں گوشہ نشین ہو کر شعر و سخن سے نفرت ہو گئی تھی۔ تسخیر کے اعمال کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت نقش بھرا کرتے تھے۔ سنو روپیہ ماہوار خرچ تھا۔ مگر آمدنی کہیں سے نہ تھی۔ آزاد طبع اس قدر تھے کہ واجد علی شاہ بادشاہ نے دو مرتبہ یاد فرمایا۔ لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ۱۸۵۳ء میں انتقال کیا۔

وفات کے بعد شاگردوں اور دوستوں نے کلام ترتیب دے کر چھاپا۔ خواجہ وزیر اپنے اُستاد کے محبوب ترین شاگرد تھے۔ اور اپنے عہد کے بلند مرتبہ شاعر سمجھے جاتے تھے۔

نمونہ کلام

ہے چشم نیم باز عجب خوابِ ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

نہ کر نظر مرے جرم و گناہِ بے حد پر
الٰہی تجھکو غفور الرحیم کہتے ہیں

کہیں عدو نہ کہیں مجھ کو دیکھ کر محتاج
یہ اُن کے بندے ہیں جنکو کریم کہتے ہیں

رشک
متوفی ۱۸۶۷ء

میر علی اوسط رشک میر سلیمان کے بیٹے، بزرگ فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ لیکن ان کی پرورش لکھنؤ میں ہوئی اور وہیں ان کی شاعری نے شہرت پائی۔ ناسخ کے مشہور معروف شاگرد تھے۔ ان کی شہرت زیادہ تر "نفس اللغۃ" پر مبنی ہے۔ یہ لغات فارسی میں ہے۔ اس میں اُردو اور ہندی الفاظ کی تحقیق بڑی احتیاط سے کی گئی ہے۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے جن میں منیرؔ مشہور ہیں۔ منیر پہلے ناسخ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

رشک کچھ دنوں کانپور میں رہے۔ پھر کربلائے معلّیٰ چلے گئے۔ آخر ستر برس کی عمر میں وہیں وفات پائی۔

خصوصیات کلام

رشک کا رنگ وہی ہے جو ناسخ کا تھا۔ ہمعصروں کی طرح ان کا کلام بھی پھیکا اور بے مزہ ہے۔ صحتِ الفاظ کا بہت خیال رکھتے تھے جو لفظ جس طرح بولا جاتا ہے اُس کو اکثر اسی طرح نظم کرتے مثلاً

آپ ہی کی جگہ "آپی" وغیرہ وغیرہ۔ کلام میں بلند خیالی اور مضمون آفرینی نہیں۔ بالکل معمولی انداز سے معمولی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ بہت پُر گو شاعر تھے۔ کلام کا بیشتر حصہ رعایت لفظی اور ضلع جگت میں اُلجھا ہُوا ہے۔

نمونہ کلام

یار کو ہم سے کچھ لگاؤ نہیں | وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں
پُرزوں میں وستخط کروں کیا حال | ایک دو تین چار تاؤ نہیں
میرے کھانے سے کیوں فلک ہے کباب | پاؤ روٹی ہے نانپاؤ نہیں

مہر متوفی ۱۸۷۹ء

مرزا حاتم علی بیگ مہر ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور اصفہانی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے دادا مرزا مراد علی خاں نے نواب شجاع الدولہ کی سرکار سے رکن الدولہ کا خطاب پایا تھا۔ اور والد ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں علی گڑھ کے تحصیلدار تھے۔ والد کا انتقال ان کی صغر سنی میں ہوگیا تھا۔ مہر چودہ برس کی عمر سے شعر کہتے تھے شاعری میں ناسخ کے شاگرد تھے ۱۸۴۰ء میں منصفی کا امتحان پاس کرکے چنار گڑھ میں تعینات ہوئے اور یہ شعر کہا ؎

ازبسکہ سوز ہجر سے خوگر ہوئے ہیں ہم | منصف چنار گڑھ کے مقرر ہوئے ہیں ہم

کچھ مدت ہائی کورٹ کے وکیل بھی رہے۔ غدر میں انہوں نے چند انگریزوں کو پناہ دی تھی اس صلے میں سرکار انگریزی نے خلعت اور دو گاؤں جاگیر عنایت کئے۔ اس کے بعد وہ آگرے میں آنریری مجسٹریٹ ہوگئے۔ ۱۸۷۹ء میں بمقام ایٹہ انتقال کیا۔

مہر امامیہ مذہب تھے اور غیر متعصب۔ غالب۔ انیس۔ دبیر۔ صبا۔ منیر وغیرہ سے دوستی تھی۔ اُردوئے معلیٰ میں غالب کے اکثر خطوط ان کے نام موجود ہیں۔ بنارس کے راجہ بلونت سنگھ ان کے شاگرد تھے۔ اور پچاس روپے ماہوار دیتے تھے۔

تصانیف

مہر کی اکثر تصانیف غدر میں ضائع ہوگئیں۔ (۱) دیوان اُردو (۲) پیرایۂ عروض (۳) باغ فرنگستان (۴) مثنوی داغ نگار (۵) داغ دل مہر (۶) مثنوی شعاع مہر وغیرہ۔

خصوصیات کلام

پُر گو شاعر تھے۔ تاریخ خوب کہتے تھے۔ کلام میں سلاست۔ روانی۔ تناسب اور زبان پر قدرت ہے۔ بعض اشعار نہایت عمدہ اور پُر لطف ہیں۔

منیر متوفی ۱۸۸۱ء

سید اسمٰعیل حسین نام، ان کے والد سید احمد حسین شاد۔ شکوہ آباد ضلع پوری کے رہنے والے تھے

منیر لکھنؤ میں عرصے تک رہے۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ پہلے ناسخ سے خط و کتابت کے ذریعہ اصلاح لیتے تھے جب ناسخ لکھنؤ سے کانپور آئے تو ان کے سامنے باقاعدہ زانوئے ادب تہ کیا۔ اُستاد کے مشورے پر رشک سے بھی اصلاح لیا کرتے تھے۔ لکھنؤ کی دلچسپیاں ان کو ہر سال لکھنؤ کھینچ بُلاتی تھیں۔ کچھ مُدّت کے لئے ظفر الدولہ نواب علی اصغر خاں (لکھنؤ) کے مُلازم ہو گئے۔ لیکن پھر کانپور چلے گئے۔ دوبارہ لکھنؤ آئے اور نواب سیّد محمّد ذکی خاں کے رفقا میں داخل ہوئے۔ انہیں اصلاح بھی دیتے رہے۔ دو سال بعد نواب تجمل حسین خاں کے بُلائے فرخ آباد چلے گئے اور ان کے جیتے جی ان کے ساتھ رہے۔ مہاراجہ الور نے بُلایا لیکن وہ والئے باندہ کی ملازمت کر چکے تھے۔ غدر کے بعد ان پر ایک رنڈی کے قتل کا مقدمہ چلا۔ اور اس میں کالے پانی کی سزا ہوئی۔ ۱۸۶۰ء میں رہائی پائی۔ اور رامپور میں آ رہے۔ ۱۸۸۱ء میں وہیں انتقال ہوا۔

خصوصیات کلام تین دیوان یادگار ہیں۔ بہت پُر گو شاعر تھے۔ مرثیہ گوئی میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ قصیدے بہت زوردار کہتے تھے۔ رنگ وہی ناسخ اور رشک کا تھا۔ اکثر اشعار میں بلند پروازی اور عُمدہ تخیّل ہے۔ قطعات و رُباعیات بہت صاف اور سادہ ہیں۔ غزلوں میں پورا لکھنؤ والوں کا رنگ ہے۔ منیر کا مرتبہ اس زمانہ کے شعرا میں بہت بلند رہے۔

آتش
متوفی ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۶ء

خواجہ حیدر علی آتش خواجہ علی بخش کے فرزند دہلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد نواب شجاع الدولہ کے عہد میں دہلی سے فیض آباد آئے۔ آتش وہیں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے اعلیٰ تعلیم و تربیت سے محروم رہے۔ بُری صحبت سے بانکے اور شوریدہ سر ہو گئے تھے۔ نواب مرزا تقی خاں کے ملازم ہو کر ان کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ وہاں مصحفی اور شعرا کے زوردار مقابلے دیکھ کر شعر گوئی کا ایسا شوق پیدا ہوا کہ چند دنوں کی مشق سے صاحبِ طرز بن گئے۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔

ناسخ و آتش آتش میں تکلف اور تصنع بالکل نہ تھا۔ عاشق مزاج، حُسن پرست اور آزاد طبع تھے۔ سپاہیانہ لباس پہنتے اور ہر وقت تلوار لگائے رکھتے، طبیعت میں بانکپن بہت تھا۔ قناعت اور توکّل سے زندگی بسر کرتے۔ شاگرد کبھی کبھی از خود سلوک کرتے لیکن خود کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرتے۔ بادشاہ کی طرف سے اسّی روپے ماہوار ملتے تھے۔ ایک شکستہ مکان میں

رہتے تھے۔ وضعدار اور خوددار تھے منکسر المزاج اور خلیق ہونیکے باوجود اُمرا سے تنتے تھے۔ آخر دنوں میں مصحفی سے بگاڑ ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ آتش اور ناسخ کے ہواخواہوں میں تقسیم تھا۔ اس مقابلہ کی وجہ سے دونوں اُستاد خوب طبیعت پر زور دے کر کہتے اور نہایت لطیف پیرائے میں آپس میں نوک جھوک بھی کیا کرتے تھے ؎

(ناسخ) ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب — بو مسلم نے کہا تھا جیسے قرآں کا جواب

(آتش) کیوں نہ دے ہر مومن اس ملحد کے دیواں کا جواب — جسنے دیواں اپنا ٹھہرایا ہے قرآں کا جواب

ان تمام ہنگاموں کے باوجود آتش ناسخ کا بہت احترام کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ ناسخ کے بعد انہوں نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔

خصوصیات کلام | ان کا کلام تخلص کی طرح گرم ہے تصنّع اور تکلّف بالکل نہیں۔ خیالات بلند ہیں اور ابتذال سے پاک۔ شعروں میں فضول تمثیلیں نہیں۔ سادے اور صاف الفاظ کو موتیوں کی طرح پروتے ہیں۔ اکثر اشعار میں روانی موسیقیت کی حد تک ہے۔ محاورات کا استعمال نہایت برمحل اور صحیح ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان کی شاعری میں میر جیسی تڑپ نہیں لیکن پھر بھی وہ اپنے کمال میں بے مثال ہیں۔ میر اور غالب کے بعد انہی پر نظر ٹھہرتی ہے۔ جذبات کو نہایت مؤثر اور دلکش الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ شاندار اور ثقیل الفاظ سے ان کا کلام پاک ہے۔ زبان بہت مزیدار اور روزمرّہ کی ہے۔ شعر کافی بلند ہوتے ہیں۔ مگر آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔

نقائص کلام | بعض لوگ کہتے ہیں علمی استعداد کم ہونے کی وجہ سے کلام پختہ اور بلند نہیں۔ غلط العام الفاظ جُوں کے تُوں باندھ دیتے ہیں۔ مثلاً المضاعف کو المضاف حلوائے بیدود کو حلوۂ بیدود۔ ایک طرح سے انہوں نے بہت ہی اچھا کیا۔ اس لفظی چھان بین ہی نے زبانِ شعر کو عربی فارسی وغیرہ کے ثقیل الفاظ سے کرخت اور بے لوچ بنا دیا تھا۔ آتش کے اس اجتہاد سے زبان میں لوچ اور لچک پیدا ہو گئی۔

آتش و ناسخ کا مقابلہ | دونوں کامل اُستاد اور صاحب طرز تھے۔ اپنے زمانہ میں دونوں کی بڑی قدر تھی، مگر آج کل کے لوگ ناسخ کو پسند نہیں کرتے۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے تذکرہ گلشن بیخار میں ناسخ کو آتش پر ترجیح دی ہے۔ غالب نے ایک خط میں لکھا ہے "آتش کا کلام بہت مؤثر ہے"۔ حقیقتاً بندش کی چُستی۔ الفاظ کی حلاوت مضمون کی بلندی میں آتش کو ناسخ پر فوقیت حاصل ہے۔ ناسخ کو ثقیل الفاظ او

شکل تشبیہات استعمال کرنے کا بہت شوق تھا جس سے شعر کا مزہ جاتا رہتا تھا۔ آتش کے اشعار نیچر کے مطابق ہیں۔ ناسخ کے اشعار کی نسبت ان میں بے تکلفی اور تڑپ بہت زیادہ ہے۔ آتش کے خیالات بہت رفیع ہیں۔ اور ان میں تصوف بھی ہے۔ مختصر یہ کہ بحیثیت ایک حقیقی شاعر کے آتش کو ناسخ پر برتری حاصل ہے۔

شاگرد رند، صبا، خلیل، نسیم۔ نواب مرزا شوق، اور آغا حجو شرف ان کے مشہور شاگرد ہیں۔

نمونہ کلام

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

کوچہ یار میں سائے کی طرح رہتا ہوں — در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

رند
متوفی ۱۸۵۷ء

نواب سید محمد خاں نام، سراج الدولہ نواب غیاث محمد خاں کے بیٹے۔ ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے۔ عالی خاندان تھے۔ بڑے ناز و نعمت سے پلے بڑھے جب تک فیض آباد میں رہے وفا تخلص کیا اور اپنا کلام میر مستحسن خلیق کو دکھایا۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں لکھنؤ گئے اور وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ لکھنؤ میں آتش کے شاگرد ہوئے اور رند تخلص رکھا۔

تخلص کی مناسبت سے بڑے لطف کی رندانہ زندگی بسر کی۔ آتش کی وفات کے بعد شراب چھوڑ کر تائب ہو گئے۔ غدر شروع ہونے سے کچھ دنوں پہلے گھر سے حج کو روانہ ہوئے۔ مگر بمبئی پہنچ کر اِنتقال ہو گیا۔

خصوصیات کلام دو دیوان ہیں۔ کلام نہایت صاف سادہ اور پُر اثر ہے۔ محاورات برجستہ استعمال کئے ہیں۔ بلند خیالی اور مضمون آفرینی کم ہے۔ اشعار مہذب ہیں۔ اکثر جگہ تصوف اور روحانیت کی جھلک ہے۔ آتش کے شاگردوں میں ان کا درجہ بہت بلند ہے۔

نمونہ کلام

پھینک دینگے اسے ہم چیر کے پہلو اپنا — تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

خلیل میر دوست علی نام خلیل تخلص۔ سید جمال علی کے بیٹے۔ بڑولی کے رہنے والے آتش کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ نواب نادر مرزا کے ساتھ کلکتہ بھی گئے تھے۔

خصوصیات کلام اکثر کلام ناہموار ہے۔ بعض اشعار نہایت بلند اور عمدہ ہیں۔ غیر مانوس الفاظ اور رعایت

لفظی کے شوقین ہیں۔ ان کے شعر عام طور پر عشق مجازی میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ بعض اشعار میں ابتذال بھی پایا جاتا ہے۔

نسیم
متوفی ۱۲۶۱ھ ۱۸۴۴ء

پنڈت دیا شنکر کول نسیم پنڈت گنگا پرشاد کول کے بیٹے۔ ایک معزز کشمیری خاندان کے فرد تھے۔ ۱۲۲۷ھ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے اور ۳۲ سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔ فارسی میں کافی دستگاہ تھی۔ امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی فوج میں بخشی گری کے عہدہ پر فائز تھے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا بیس سال کی عمر میں آتش کے شاگرد ہوئے اور نسیم تخلص اختیار کیا۔

مثنوی گلزار نسیم

نسیم نے مثنوی میر حسن کے جواب میں مثنوی گلزار نسیم جیسی زندہ جاوید مثنوی لکھی مشہور ہے کہ یہ بہت ضخیم تھی۔ اُستاد کے کہنے سے مختصر کر دی۔ ان کے کلام میں برجستگی محاورات نادر استعارے اور تشبیہات قابل تعریف ہیں تصنع بہت ہے۔ دلاویزی اور تاثیر کم۔ یہ مثنوی میر حسن سے علیحدہ طرز پر لکھی گئی ہے اس لئے دونوں کا مقابلہ فضول ہے۔

صبا
متوفی ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۴ء

میر وزیر علی نام میر بندہ علی کے بیٹے لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں تربیت پائی۔ چچا نے بیٹا بنا کر بقدر ضرورت عربی فارسی کی تعلیم دی۔ شاعری میں آتش کے مشہور شاگرد تھے۔ بہت ملنسار خلیق اور یار باش آدمی تھے۔ دو سو روپیہ ماہوار واجد علی شاہ اور تیس روپے نواب محسن الدولہ دیتے تھے۔ ۱۲۷۱ھ ۱۸۶۵ء میں گھوڑے سے گر کر راہی ملک عدم ہوئے۔

خصوصیات کلام

ایک دیوان اور ایک مثنوی یادگار ہے۔ کلام میں تصنع اور غیر مانوس الفاظ بکثرت ہیں کہیں کہیں ایک آدھ شعر اپنے اُستاد کے رنگ میں بھی ملتا ہے۔ اور دل پر اثر کرتا ہے۔

آغا جو شرف

میر سادات حسین نام عرف آغا جو۔ واجد علی بادشاہ کے سمدھی کے خسر تھے۔ غدر کے بعد والئے اودھ کے ساتھ کلکتہ گئے۔ ولی عہد کے ساتھ رہتے اور ان سے غیر معمولی محبت کرتے تھے۔

خصوصیات کلام

اشعار کی زبان نہایت صاف اور سلیس۔ بندشیں اور ترکیبیں دلکش ہیں مضمون آفرینی کی کمی ہے۔ فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ ان کے کلام میں بہت کم ہیں۔

نمونہ کلام

پھڑک کے جان نہ دیتا تو آہ کیا کرتا ۔۔۔ قفس سے اور نکلنے کی راہ کیا کرتا
شاخ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی ۔۔۔ پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

اس دور کے تغیرات زبان

(۱) غیر مانوس اور ثقیل فارسی عربی الفاظ اور ترکیبوں کی کمی (۲) متروک ہندی الفاظ کا

پھر سے رائج ہونا (۳) صرف برمحل اور حسنِ شعر کو بڑھانے والے محاورات کا استعمال (۴) معشوق کے خدوخال۔ گل و بلبل۔ دُور از کار تشبیہوں اور استعاروں وغیرہ کی کمی۔

(۹)

دربارِ لکھنؤ اور اس کے شعرا

واجد علی شاہ اختر کا عہد

شاہانِ اودھ — زوالِ دہلی کے بعد اُردو شاعری کا مرکز لکھنؤ بن گیا تھا۔ کیونکہ دہلی کے نامور شعرا مثلاً میر سودا اور سوز وغیرہ لکھنؤ جا رہے تھے۔ دہلی کی پریشانیاں اور شاہان اودھ کی قدردانیاں شعرا کے دلوں کو لکھنؤ کی طرف برابر کھینچ رہی تھیں۔

نواب آصف الدولہ متوفی ۱۷۹۷ء — آصف تخلص۔ نواب یحییٰ خاں نام اور مرزا امانی عرف تھا۔ نواب شجاع الدولہ کے فرزند اور جانشین تھے۔ شعر و سخن اور علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے۔ ۱۱۸۸ھ/۱۷۷۴ء میں ۲۷ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ جب لکھنؤ دارالسلطنت قرار پایا تو انہوں نے بڑے شوق سے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ان کے عہد میں انگریزوں کا اثر و رسوخ بہت بڑھا۔ بالکل غیر متعصب تھے۔ دربار میں ہندو بھی بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے۔ سودا۔ میر اور سوز انہی کے عہد میں لکھنؤ آئے۔ ۱۷۹۷ء میں انتقال کیا۔

آصف الدولہ اپنا کلام میر سوز کو دکھاتے تھے۔ ان کے اشعار اپنے اُستاد کے کلام کی طرح صاف و سادہ، اور تصنع تکلف سے پاک ہیں۔ ایک دیوان یادگار ہے۔

نمونہ کلام

جہاں تیغ اس کی علم دیکھتے ہیں — وہاں اپنا سر ہم قلم دیکھتے ہیں
جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں — خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں
گذرتے ہیں سو سو خیال اپنے دل میں — کسی کا جو نقش قدم دیکھتے ہیں
بتوں کی گلی میں شب و روز آصف — تماشہ خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

نواب وزیر علی خاں | آصف الدولہ کے بعد ۱۷۹۷ء میں ان کے بیٹے وزیر علی خاں[1] مسندِ وزارت پر بیٹھے۔ مگر چار ہی مہینے بعد انگریزوں نے یہ کہہ کر معزول کر دیا۔ کہ آپ آصف الدولہ کی اولاد نہیں ہیں۔ شاید یہ اس لئے ہوا کہ وہ خود سر تھے معزول کر کے انہیں بنارس بھیجا۔ جہاں طیش میں آ کر انہوں نے رزیڈنٹ کو مار ڈالا۔ اور بغاوت کر دی۔ آخر جے پور میں پناہ لی۔ وہاں سے گرفتار کر کے انہیں فورٹ ولیم بھیج دیا گیا۔

وزیر علی خاں وزیر تخلص کرتے تھے۔ ذیل کے اشعار انہوں نے مصیبت کی حالت میں لکھے تھے ؎

ارمان بہت رکھتے تھے ہم دل کے چمن میں — بیٹھے نہ خوشی سے کبھی سائے کے تلے ہم
ہم وہ نہ قلم تھے کسی مالی کے لگائے — نرگس کے نہالوں میں تھے آصف کے پلے ہم
زندانِ مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں — رہتے ہیں وزیری ہی سے دن رات ملے ہم

نواب سعادت علی خاں | نواب وزیر علی خاں کی معزولی کے بعد نواب آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی نواب سعادت علی خاں مسند نشین ہوئے۔ ان کے عہد میں انگریزوں کے ساتھ ایک اور عہد نامہ ہوا جس کی رو سے انگریزوں کا اثر و رسوخ اور زیادہ بڑھ گیا۔ اور نتیجے کے طور پر ⅔ دو تہائی ملک انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس عہد میں ہر طرف امن و سکون تھا۔ نواب ہر وقت عیش و عشرت میں مشغول تھے۔ پھر بھی علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے خود بھی شعر کہتے تھے۔ مگر ان کا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ مصحفی اور انشا کے معرکے انہی کے عہد میں ہوئے۔ سید انشا ان کے دربار کے شاعرِ خاص تھے۔

نواب غازی الدین حیدر | نواب سعادت علی خاں کے بعد ان کے بیٹے ۱۸۱۴ء میں مسندِ وزارت پر بیٹھے۔ گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز کے زمانہ سے یہ لوگ پھر بادشاہ کہلانے لگے۔ ان کی تخت نشینی بڑی شان و شوکت سے ہوئی۔ غازی الدین اردو میں نعت و مرثیہ کہتے تھے۔ ان کا کلام بہت روکھا پھیکا ہے۔

نصیر الدین حیدر شاہ | غازی الدین حیدر کے بعد ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر تختِ سلطنت پر متمکن ہوئے اور ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک حکومت کی۔ یہ بھی اپنے والد کی طرح آئمہ کی شان میں شعر کہتے اور بادشاہ تخلص کرتے تھے۔

نمونۂ کلام

یہ کس مست کے آنے کی آرزو ہے — کہ ساقی لئے ساغرِ مشکبو ہے
چلو قبرِ فرہاد پر فاتحہ کو — مگر آبِ شیریں سے لازم وضو ہے

[1] لکھنؤ کے نواب وزیر کہلاتے تھے۔ یہ تغیر سیاسی حالات کی پیچیدگی سے رونما ہوا تھا ۱۲

شفق بن کے ہوتا ہے گردوں پہ ظاہر — یہ کس کشتۂ بے گناہ کا لہو ہے
گلستاں میں جا کر ہر اک گل کو دیکھا — نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے
رہے سایۂ پنجتن بادشہ پر — خداوندِ عالم نگہبان تو ہے

محمد علی شاہ و امجد علی شاہ نواب نصیر الدین حیدر کے بعد ان کے حقیقی چچا محمد علی شاہ ۱۸۳۷ء سے لیکر ۱۸۴۲ء تک حکمران رہے۔ پھر ان کے بیٹے امجد علی شاہ نے ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۷ء تک حکومت کی۔ یہ دونوں علوم و فنون کے قدردان، اور شعرا کی بہت قدر و منزلت کرتے تھے۔

واجد علی شاہ امجد علی شاہ کی وفات کے بعد ان کے بیٹے واجد علی شاہ بیس سال کی عمر میں تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ ان کو فنِ تعمیر کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے دو کروڑ روپیہ صرف کر کے لکھنؤ میں قیصر باغ بنوایا۔ نالائق اور بدخواہ ہم نشینوں کی صحبت کے اثر سے عیش و عشرت میں پڑ گئے تھے۔ صدہا ارباب نشاط ملازم تھیں۔ اس عیش کوشی پر انگریزوں نے بار بار فہمائش کی۔ آخر ۳ جنوری ۱۸۵۶ء میں معزول کر کے فورٹ ولیم بھیج دیے گئے۔ اس طرح دو کروڑ سالانہ کی سلطنت انگریزوں کے قبضے میں آگئی۔

واجد علی شاہ تقریباً دو سال فورٹ ولیم میں رہے۔ وہاں سے مٹیا برج میں منتقل کر دیئے گئے۔ انہوں نے مٹیا برج کو لکھنؤ کا نمونہ بنا دیا تھا۔ ہر بات میں ندرت اور نفاست پسند تھی۔ ان کا کلکتہ کا چڑیا خانہ دور دور سے لوگ دیکھنے آتے تھے۔ فنِ موسیقی کو بدرجۂ اتم جانتے تھے۔ اُردو شاعری میں اختر تخلص کرتے تھے۔ معزولی کے بعد لکھنؤ سے کلکتہ تک کا سفر ایک مثنوی میں نہایت دردناک پیرائے سے بیان کیا ہے۔ ہندی میں "جانِ عالم پیا" تخلص کرتے تھے۔ ان کی ٹھمریاں ابتک زبان زدِ عوام ہیں۔

تصانیف تقریباً چالیس تصانیف ہیں (۱) چھ دیوان (۲) سات مثنویاں (۳) تین جلدیں مراثی کی۔ ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں۔ ایک خطوط کا مجموعہ بھی چھپا ہے جو لکھنؤ کی یاد میں انہوں نے اپنی محبوب بیوی کو لکھے تھے۔ میر مظفر علی اسیر اور نواب فتح الدولہ برق سے اصلاح لیتے تھے۔ برق کو ان سے اس قدر محبت تھی کہ معزولی کے بعد ان کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

خصوصیات کلام اس زمانہ کے عام رنگ کے مطابق شعر کہتے تھے۔ رعایت لفظی کا بہت خیال تھا۔ سوز و گداز ان کے اشعار میں نہیں۔ ہاں لکھنؤ سے کلکتہ کے سفر کے حالات جو مثنوی حزنِ اختر میں بیان کئے ہیں ضرور پُردرد ہیں۔

نمونہ کلام کمر۔ دھوکا۔ دہن عنقا۔ غزال آنکھیں پری چہرہ — شکم ہیرا۔ بدن خوشبو۔ جبین دریا۔ زبان عیسیٰ
برائے سیر مجھ سا رندمے خانے میں گر آئے — گرے ساغر۔ لنڈھے شیشا۔ ہنسے ساقی۔ بہے دریا

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالے میں
لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

شعرائے اختری

اسیر۔ برق۔ امانت۔ قلق۔ بحر۔ سحر۔ ذکی۔ درخشاں۔ قبول۔ شفق۔ بیخود۔ ہنر۔ عطارد۔ ہلال اور سرور وغیرہ ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔

اسیر سید مظفر علی خاں نام۔ اسیر تخلص۔ ان کے والد سید امداد علی امیٹھی کے رہنے والے تھے۔ کتب درسیہ علمائے فرنگی محل سے پڑھیں۔ شاعری میں مصحفی سے اصلاح لی۔ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں ملازم ہوئے اور امجد علی شاہ کے عہد میں برسرِ اقتدار آئے۔ واجد علی شاہ کے آٹھ نو سال مصاحب رہے۔ تدبیر الدولہ اور مدبر الملک کے خطابات پائے۔ جب واجد علی شاہ لکھنؤ گئے تو انہوں نے ساتھ جانا منظور نہ کیا۔ اس پر بادشاہ ان سے ناراض ہو گئے۔

غدر کے بعد نواب کلب علی خان اور پھر ان کے صاحبزادے نواب یوسف علی خان نے قدردانی کی۔ اس لئے چھ مہینے رامپور اور چھ مہینے لکھنؤ میں رہا کرتے تھے۔ ۱۸۸۱ء میں لکھنؤ میں ۸۱ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔

خصوصیاتِ کلام چھ دیوان ان کی تصنیف ہیں۔ ایک دیوان فارسی کا بھی ہے۔ مرثیہ اور قصیدہ بھی کہتے تھے۔ فنِ عروض کے استاد کامل تھے۔ زبان پر پوری قدرت تھی۔ نظم کا رنگ اہل لکھنؤ کا سا ہے۔ کہیں کہیں اچھے اشعار بھی ملتے ہیں۔ امیر مینائی انہی کے شاگرد تھے۔ ان کے دونوں بیٹے حکیم اور افضل بھی صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں۔

نمونہ کلام کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست — مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

آیا ہے ہم کو ہاتھ یہ مضموں چراغ سے
روشن اسی کا نام رہے جو جلائے دل

امانت سید آغا حسین نام۔ امانت تخلص۔ میر آغا رضوی لکھنوی کے بیٹے۔ ان کا رشتہ سید علی رضوی سے ملتا ہے جو مشہد مقدس کے کلید بردار تھے۔ شروع میں مرثیہ گوئی کا شوق ہوا اور دلگیر سے اصلاح لینے لگے۔ کچھ مدت بعد غزلیں کہنی شروع کیں۔ لیکن استاد نے اصلاح دینے سے انکار کر دیا۔

۱۸۳۵ء ۱۲۵۱ھ میں بیس برس کے تھے کہ کسی عارضے سے قوتِ گویائی جاتی رہی۔ تحریر کے ذریعے باتیں کرتے تھے۔ دس سال بعد یہ مرض آپ ہی آپ جاتا رہا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بلا کر خود بخود زبان کھل گئی تھی۔ لطافت اور فصاحت اپنے دو لڑکے جانشین چھوڑے۔ یہ دونوں شعرائے لکھنؤ میں بہت مشہور ہیں۔

تصانیف | امانت کی شہرت واسوخت اور اندر سبھا پر مبنی ہے۔ اندر سبھا کا اردو ڈرامہ اُن کی سب سے پہلی اور مشہور تصنیف ہے۔

خصوصیات کلام | رعایت لفظی اور صنائع بدائع کا اس قدر شوق تھا۔ کہ بعض شعر محض لفظی گورکھ دھندا ہیں لکھنؤ کا رنگ ان کے ہر شعر سے ٹپکتا ہے۔ کہیں کہیں صاف اور سادہ اشعار بھی ملتے ہیں۔

نمونہ کلام |

بزم عالم میں یہ ہر شب ہے امانت کی دُعا
شمع روئے یار سے روشن مرا کاشانہ ہو

فی سبیل اللہ پانی ان کو دو اے آبلو
کانٹے آب دیکھے نہیں جاتے زبانِ خار کے

فصل گُل میں رات دن بس ہم ہوں اور میخانہ ہو
ساقیٔ مہوش ہو مے ہو۔ شیشہ ہو پیمانہ ہو

کوچۂ قاتل تلک اے دل رسائی کیجئے
کاسۂ سر ہاتھ میں لے کر گدائی کیجئے

آفتاب الدولہ قلق | خواجہ ارشد علی خاں عرف خواجہ اسد اللہ ملقب بہ آفتاب الدولہ۔ قلق تخلص۔ خواجہ وزیر کے بھانجے اور شاگرد۔ اپنے آپ کو واجد علی شاہ کا شاگرد بھی کہتے تھے۔

خصوصیات کلام | ان کے کلام میں لفظی رعایتیں اور مثنوی میں رکاکت و ابتذال ہے۔ بلحاظ زبان ان کا کلام مستند ہے مگر شعری خوبیوں سے معرا۔ مثنوی طلسمِ اُلفت نہایت دلچسپ اور قابلِ قدر کتاب ہے۔ ایک دیوان بھی یادگار ہے۔ جس میں بادشاہ کی نظربندی کی دردناک نظم شامل ہے۔

ذکی | مہدی علی خاں نام۔ ذکی تخلص۔ شیخ کرامت علی خلف الصدق۔ لکھنؤ کے رہنے والے۔ آخر عمر میں مُراد آباد جا رہے تھے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ آئے اور ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ بادشاہ کی شان میں قصیدہ لکھ کر انعام پایا۔ لکھنؤ سے دہلی اور دکن گئے۔ جہاں ان کی خوب قدر ہوئی۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد مُراد آباد چلے گئے۔ کچھ دنوں نواب یوسف علی خاں والئے رامپور کی سرکار سے وابستہ رہے۔ ان کے انتقال کے بعد انبالہ گئے اور وہیں ۱۸۶۴ء ۱۲۸۱ھ میں انتقال کیا۔

بہت خوش گو شاعر تھے۔ لکھنؤ کے دُوسرے درجے کے شعرا میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔

۱۲۵۱ھ ۱۸۳۵ء میں بیس برس کے تھے کہ کسی عارضے سے قوتِ گویائی جاتی رہی - تحریر کے ذریعے باتیں کرتے تھے - دس سال بعد یہ مرض آپ ہی آپ جاتا رہا - بعض لوگ کہتے ہیں کربلا جا کر خود بخود زبان کھل گئی تھی - لطافت اور فصاحت اپنے ڈولڑکے جانشین چھوڑے - یہ دونوں شعرائے لکھنو میں بہت مشہور رہیں -

تصانیف | امانت کی شہرت واسوخت اور اندر سبھا پر مبنی ہے - اندر سبھا کا اردو ڈرامہ اُن کی سب سے پہلی اور مشہور تصنیف ہے -

خصوصیات کلام | رعایت لفظی اور صنائع بدائع کا اس قدر شوق تھا - کہ بعض شعر محض لفظی گورکھ دھندا ہیں - لکھنو کا رنگ ان کے ہر شعر سے ٹپکتا ہے - کہیں کہیں صاف اور سادہ اشعار بھی ملتے ہیں -

نمونہ کلام | بزم عالم میں یہ ہر شب ہے امانت کی دُعا
شمع روئے یار سے روشن مرا کاشانہ ہو

فی سبیل اللہ پانی ان کو دواے آبلو
کانٹے اب دیکھے نہیں جاتے زبان خار کے

فصل گل ہیں رات دن بس ہم ہوں اور میخانہ ہو
ساقی مہوش ہوے ہو - شیشہ ہو پیمانہ ہو

کوچہ قاتل تلک اے دل رسائی کیجئے
کاسہ سر ہاتھ میں لے کر گدائی کیجئے

آفتاب الدولہ قلق | خواجہ ارشد علی خاں عرف خواجہ اسد اللہ ملقب بہ آفتاب الدولہ - قلق تخلص - خواجہ وزیر کے بھانجے اور شاگرد - اپنے آپ کو واجد علی شاہ کا شاگرد بھی کہتے تھے -

خصوصیات کلام | ان کے کلام میں لفظی رعایتیں اور مثنوی میں رکاکت وابتذال ہے - بلحاظ زبان ان کا کلام مستند ہے مگر شعری خوبیوں سے معرا - مثنوی طلسم الفت نہایت دلچسپ اور قابلِ قدر کتاب ہے - ایک دیوان بھی یادگار ہے - جس میں بادشاہ کی نظر بندی کی دردناک نظم شامل ہے -

ذکی | مہدی علی خاں نام - ذکی تخلص - شیخ کرامت علی خلف الصدق - لکھنو کے رہنے والے - آخر عمر میں مُراد آباد جا رہے تھے - غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنو آئے اور ناسخ کے شاگرد ہوئے - بادشاہ کی شان میں قصیدہ لکھ کر انعام پایا - لکھنو سے دہلی اور دکن گئے - جہاں ان کی خوب قدر ہوئی - واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد مُراد آباد چلے گئے - کچھ دنوں نواب یوسف علی خاں والئے رامپور کی سرکار سے وابستہ رہے - ان کے انتقال کے بعد انبالہ گئے اور وہیں ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۴ء میں انتقال کیا -

بہت خوش گو شاعر تھے - لکھنو کے دوسرے درجے کے شعرا میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں -

علمِ عروض سے خوب واقف تھے۔ اس فن پر ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔

درخشاں سید علی خاں نام اور نواب الدولہ کوکب الملک ستارۂ جنگ خطابات تھے۔ درخشاں تخلص کرتے تھے۔ اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ انہی کی کوشش سے دربار میں پہنچے۔ فنِ نجوم سے بھی واقف تھے۔ معمولی قابلیت کے آدمی تھے۔ واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ گئے اور وہیں انتقال کیا۔

اختر قاضی محمد صادق خاں نام قاضی محمد لعل کے صاحبزادے ہگلی کے قاضی زادوں میں سے تھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانہ میں لکھنؤ آئے اور ملک الشعرا کا خطاب پایا۔ مرزا قتیل کے شاگرد تھے مصحفی۔ انشا۔ جرأت کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ مشہور ہے۔ واجد علی شاہ نے بہت سا انعام دے کر ان سے تخلص خرید لیا تھا۔ واجد علی شاہ کی ناراضی کی وجہ سے انہیں لکھنؤ چھوڑنا پڑا تھا۔ پھر اٹاوہ میں تحصیلدار ہو گئے تھے۔ وہیں ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا۔

اختر بڑے جامع کمالات تھے۔ فارسی میں بہت کہتے تھے۔ بیشتر تصنیفات فارسی میں ہیں۔ فارسی شعرا کا تذکرہ بھی لکھا ہے جس میں پانچ ہزار شعرا کا حال درج ہے۔ ان کے چند ایک دیوان بھی ہیں۔

نمونہ کلام

قطعہ

کل بن کے شیخ مجتہدِ عصر سا قیا — دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا
کہنے لگا زراہِ تنفر مجھے بطنز — معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے — پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

(۱۰)

مرثیہ اور مرثیہ گو

مرثیہ کی تعریف مرثیہ قصیدہ کے برعکس ہے۔ قصیدہ میں کسی زندہ شخص کی تعریف کی جاتی ہے۔ اور مرثیہ میں مُردہ اشخاص کے اوصاف بیان کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر مرثیہ اُن نظموں کو کہتے ہیں۔ جن میں شہدائے کربلا کی شہادت کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ مرثیے بہت سوز و گداز اور خوش الحانی سے ان مجالس اور جلوسوں میں پڑھے جاتے ہیں جو شہدائے کربلا کی یاد میں ترتیب دیئے جاتے ہیں۔

ابتدا میں مراثی صرف بین کے اشعار پر مشتمل ہوتے تھے۔ اور ان کا مقصد صرف رونا رُلانا اور داخل حسنات ہوتا تھا۔ لیکن اُنیسویں صدی میں مرثیہ کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا۔ نئے نئے مضامین اور اسلوب بیان اختیار کئے گئے۔ مثلاً چہرہ۔ مناقب ممدوح۔ مصائب دشمن۔ مناظر جنگ۔ مناظر قدرت۔ رجز خوانی، گھوڑے اور تلوار کی تعریفیں وغیرہ وغیرہ گویا مرثیہ اُردو نظم کی ایک مستقل صنف بن گیا۔

مرثیہ کی قدامت شروع سے اہلِ اسلام مرثیہ کے بہت شائق ہیں چنانچہ عرب شاعری کی ابتدا ہی مرثیہ سے ہوئی۔ مرنے والے سے مرثیہ گو کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اِس لئے شعرا نے قصیدے لکھ کر امیروں سے انعام لینے شروع کئے۔ اِس طرح مرثیہ گوئی کا زوال شروع ہوا۔

فارسی شاعری کی بُنیاد تکلف اور آورد پر قائم تھی اس لئے ایران میں ابتدا قصیدہ سے ہوئی۔ پھر بھی شاہنامہ میں کچھ ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں فطری اثر اور جوش پایا جاتا ہے۔ مثلاً ماد سہراب نے اپنے بیٹے کی موت پر نہایت درد انگیز بین کئے۔ محمود غزنوی کی وفات پر فرخی نے دس بارہ اشعار دردناک پیرائے میں لکھے ہیں۔

سعدی اور خسرو نے بھی مرثیے لکھے لیکن نہ وہ مقبول ہوئے اور نہ لوگوں نے ان کا اتباع کیا۔ مُلّا محتشم کاشی بے مثل مرثیہ گو تھے۔ انھوں نے بھی طرز قدیم میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اسی طرح طالب آملی۔ غزالی۔ سیلی۔ کلیم اور ظہوری وغیرہ نے بھی مرثیہ لکھے۔ لیکن ان میں سوائے تعریفوں اور اظہارِ تاسف کے کچھ نہ تھا۔ آخر مُلّا مقبل نے اس صنف میں ایک قسم کا تغیر پیدا کیا۔ جس کو ایرانیوں نے بہت پسند کیا۔

اُردو مرثیہ اُردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی اور مرثیہ بھی سب سے پہلے وہیں لکھا گیا۔ مصنف گُلِ رعنا لکھتے ہیں تولی نے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھی۔ شاہان گولکنڈہ اور بیجاپور خود مرثیہ کہتے اور شاعروں کی قدردانی کرتے تھے۔ شعرائے دہلی بھی مرثیہ گوئی مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ اسی لئے مرثیے میں عیوب شاعری پر نظر نہیں کرتے تھے۔ میر و سودا نے بھی مرثیے لکھے۔ ان میں بھی جذبات کی کمی ہے۔ میر انیس کے اجداد میر ضاحک اور میر حسن کے مرثیے بھی کوئی خصوصیت نہیں رکھتے۔ مرثیے سودا کے وقت تک چو مصرعے ہوتے تھے۔ سکینا لکھتے ہیں۔ سودا نے سب سے پہلے مرثیے کو مسدس کیا۔ حقیقت امر یہ ہے کہ میر انیس کے بزرگوں نے مرثیے کے لئے مسدس کو منتخب کیا۔

میر ضمیر نے مرثیہ میں تشبیہات، استعارات، معرکہ کارزار کے مفصل حالات، شاعرانہ استدلال اور دلچسپ مبالغے داخل کئے۔ زور بندش میں چستی اور صفائی پیدا کر کے سوز سے پڑھنے کی بجائے تحت اللفظ خوانی کی طرح ڈالی۔ اور یہی طرز انیس اور دبیر کے زمانہ میں معراج کمال کو پہنچی۔

بزرگان انیس کی خدمات میر آمانی، میر ضاحک اور میر حسن نے بھی مرثیے کہے تھے لیکن وہ اب نہیں ملتے۔

میر حسن کے چار بیٹے تھے۔ جن میں خلیق، خلق، محسن شاعر تھے۔ خلق صاحب دیوان تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے۔ انہوں نے سو برس کی عمر میں انتقال کیا۔

میر خلیق میر مستحسن نام۔ خلیق تخلص کرتے تھے۔ خلق سے چھوٹے تھے۔ تعلیم و تربیت فیض آباد اور لکھنؤ میں پائی تھی۔ سولہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ ان کے والد میر حسن مثنوی سحر البیان کی تصنیف میں مشغول تھے۔ اس لئے ان کو مصحفی کا شاگرد کرا دیا تھا۔ تھوڑی مدت میں وہ بہت ترقی کر گئے۔ چنانچہ ایک مشاعرے میں آتش بھی موجود تھے۔ جب خلیق نے یہ مطلع پڑھا ؎

رشک آئینہ ہے اس رشکِ قمر کا پہلو صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

تو آتش نے یہ کہہ کر اپنی غزل پھاڑ دی جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے۔

میر حسن کے انتقال سے سارے گھر کا بوجھ میر خلیق پر پڑ گیا۔ گذر اوقات کے لئے خلیق اپنی غزلیں بیچنے لگے۔ وہ آخر عمر میں صرف مرثیہ کہنے لگے تھے۔ بہت پُرگو شاعر تھے۔ ضمیر، فصیح اور دلگیر اُن کے معاصر اور ناسخ کے شاگرد تھے۔ زبان میں لکنت ہونے کی وجہ سے مرثیہ خود نہیں پڑھ سکتے تھے۔ انہوں نے مرثیہ میں جدتیں نکالی تھیں۔ مرزا فصیح جب حج کو چلے گئے تو ضمیر اور خلیق کے لئے میدان خالی رہ گیا۔ یہ دونوں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے اس جدوجہد کا نتیجہ مرثیے کی ترقی کا باعث ہوا۔ اب مرثیہ چو مصرعے سے مستقل طور پر مسدس ہو گیا۔ سلام غزل کی طرز میں لکھے جانے لگے۔ مرثیہ پڑھنے کا طریقہ سوز سے تحت اللفظ ہوا۔ مستزاد کی صورت میں نوحے کہے گئے۔ پہلے مرثیہ چالیس بند کا ہوتا تھا۔ میر ضمیر نے قدیم طرز کو خیرباد کہکر پہلے سراپا اور پھر میدان جنگ کا نقشہ کھینچ کر شہادت امام کو بیان کیا۔ اس طرز نے ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اب سے پہلے مرثیے صرف حصول ثواب کے لئے لکھے جاتے تھے۔ جدید اختراعات نے ان کو شاعری کے دامن میں لے لیا۔ اب اس پر سختی اور باریک بینی سے تنقیدیں ہونے لگیں،

گویا مرثیہ شاعری کی ایک الگ صنف بن گیا۔

خصوصیات کلام میر خلیق نے صفائی زبان اور صحت محاورہ پر بہت توجہ صرف کی۔ انہوں نے خالی تشبیہوں کو چھوڑ کر درد و اثر اختیار کیا۔ میر ضمیر اور خلیق کے کلام میں یہی فرق ہے۔ انیس بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلے۔ ناسخ کہا کرتے تھے اگر زبان سیکھنی ہو تو خلیق کے گھرانے سے سیکھو۔

میر انیس میر ببر علی انیس ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء یا ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد نے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ جب ان کے بڑے صاحبزادے میر نفیس پیدا ہوئے تو لکھنؤ آئے۔ چھوٹے بھائی اُنس ہمراہ تھے۔ باپ اور بھائی فیض آباد میں رہتے تھے۔ اس لئے فیض آباد میں آنا جانا رہا۔ آخر پورا خاندان لکھنؤ آ گیا۔

ابتدائی تعلیم مولوی حیدر علی اور مفتی میر عباس سے حاصل کی۔ ورزش کا بہت شوق تھا۔ فنونِ سپہ گری میر کاظم علی اور ان کے بیٹے سے سیکھے۔ فنِ سپہ گری اور شہسواری مناظرِ جنگ دکھانے میں ان کے بہت کام آئے۔

میر انیس بڑے وضعدار اور خوددار شخص تھے۔ اپنی خاندانی فضیلت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے۔ گھر والوں سے بھی اوقاتِ مقررہ پر ملتے تھے۔ بادشاہِ وقت کے ہاں اُس وقت تک نہیں جاتے تھے۔ جب تک ایک معتمد شاہی ان کو لینے نہ آتا تھا۔ استغنا، خودداری اور قناعت اس قدر تھی کہ نہ کبھی کسی کی مدح کی اور نہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کیا۔ ہاں اُمرا کے تحائف قبول کر لیتے تھے۔ وہ لوگ بھی آلِ رسُول سمجھ کر ان کی خدمت کرنا اپنے لئے سعادتِ دارین سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب تہور جنگ رئیس حیدر آباد نے میر صاحب کی جوتیاں اُٹھا کر ان کی پالکی میں رکھی تھیں۔ لباس بھی ان کا خاص تھا۔

میر انیس سلطنت لکھنؤ کی تباہی سے پہلے لکھنؤ سے باہر نہیں نکلے۔ کہتے تھے اور جگہ کے لوگ ہماری زبان کا کیا لُطف اُٹھائیں گے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۵۹ء میں اور ۱۸۶۰ء میں نواب قاسم علی خاں کی دعوت پر پٹنہ عظیم آباد گئے۔ اس کے بعد ۱۸۷۱ء میں نواب تہور جنگ کے اصرار پر حیدر آباد پہنچے۔ ان مقامات سے لوٹتے ہوئے بنارس اور الہ آباد میں معرکہ آرا مجالس پڑھیں۔ ۱۸۷۴ء میں بعارضۂ تپ لکھنؤ میں فوت ہوئے۔

انیس کی شاعری میر صاحب طبعی شاعر تھے اور ملکۂ شاعری ورثہ میں بھی پایا تھا۔ ان کے خاندان جتنے مشہور اور قابل شعرا کسی خاندان میں نہیں ہوئے۔ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ پہلے حزیں تخلص کرتے تھے۔ جب لکھنؤ آئے تو ان کے والد ناسخ کے پاس لے گئے۔ ناسخ کے مشورے سے انیس تخلص کیا۔ شروع ہی سے مرثیہ کہنے میں اچھی مہارت پیدا کرلی تھی۔ اپنے والد کی زندگی میں وہ کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ چنانچہ جب خلیق اور ضمیر نے میدان خالی کیا تو میر انیس اور مرزا دبیر کا مقابلہ شروع ہو گیا۔

تصانیف کہا جاتا ہے میر صاحب کا کلام اب تک پورا شائع نہیں ہو سکا۔ انہوں نے ہزار ہا مرثیے، رباعیاں اور سلام وغیرہ لکھے ہیں۔ مشہور ہے انہوں نے ڈھائی لاکھ شعر کہے جن میں غزلیں بھی تھیں۔ کلام ہموار ہے اور رطب و یابس سے پاک۔ بحیثیت شاعر کے ان کی جگہ صف اوّلین میں ہے۔ وہ اردو کے تمام شعرا میں بہترین اور کامل ترین سمجھے جاتے ہیں۔

انیس کی مرثیہ خوانی جس طرح انیس کا کلام لاجواب ہے اسی طرح ان کے پڑھنے کا طریقہ بھی بے مثال تھا۔ ان کی آواز۔ قد و قامت۔ صورت شکل غرض ہر چیز نہایت موزوں واقع ہوئی تھی۔ ہمیشہ تنہائی میں آئینہ سامنے رکھ کر پڑھنے کی مشق کیا کرتے تھے۔ آنکھ کی گردش اور ہلکی سی اعضا کی جنبش سے اپنے کلام میں زندگی پیدا کر دیتے تھے۔ جس سے سننے والے سر دھنتے رہ جاتے تھے۔

خدمات انیس میر انیس نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے حقیقت میں انہوں نے زبان کو مانجھ ڈالا۔ صحت محاورہ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ لغات کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ الفاظ کو نہایت خوبصورتی سے صرف کرتے تھے۔ انہوں نے نئے نئے محاورات زبان میں داخل کئے اور محاورات کا صحیح استعمال بتایا۔ میر صاحب کی زبان لکھنؤ اور دہلی کی ٹکسال میں مستند مانی جاتی ہے۔ انیس سے پہلے اردو زبان رزمیہ نظم سے بالکل تہیدست تھی۔ انہوں نے اس کمی کو اس طرح پورا کیا کہ کسی کے لئے گنجائش باقی نہ رکھی۔ اسی طرح مناظر قدرت اور انسانی جذبات بھی نہایت صحت اور عمدگی کے ساتھ نظم کئے۔

مرقع نگاری انیس مناظر قدرت کی تصویر اس کمال سے کھینچتے ہیں کہ صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے اس قسم کے مناظر اصل مضمون کے تحت میں بھی ہیں اور بالذات ایک مکمل چیز بھی۔

اظہار جذبات میر صاحب انسانی جذبات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سننے اور پڑھنے والا وجد کرنے

لگتا ہے - جزئیات نہایت اہتمام اور احتیاط سے بیان کرتے ہیں انہوں نے جنگوں کے مناظر ہزاروں جگہ بیان کیے ہیں - مگر ہر جگہ نئے انداز اور نئی تشبیہات کے ساتھ - افسوس ہے کہ بعض واقعات کربلا بیان کرنے میں انہوں نے تحقیق سے کام نہیں لیا -

مولوی عبدالغفار نساخ نے ایک رسالہ میں انیس اور دبیر کی غلطیاں جمع کی ہیں - انیس اور دبیر کے طرفداروں نے ان کے جواب بھی دیئے ہیں - اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں - انہوں نے لاکھوں شعر کہے اگر کہیں کہیں تصرف یا غلطیاں سرزد ہو گئیں تو اس سے ان کی اُستادی میں کوئی فرق نہیں آسکتا -

طرز انیس میر انیس تمثیلوں - استعاروں اور صنائع بدائع کے استعمال میں کمال مہارت رکھتے تھے - وہ اپنے زمانہ کی روش کے خلاف فضول مبالغوں کو پسند نہیں کرتے تھے صنائع بدائع کو اس طرح استعمال کرتے تھے - کہ اس سے شعر کے حُسن اور خوبی میں اضافہ ہو جاتا تھا اسی طرح ان کے استعارے اور تشبیہیں بھی نہایت خوبصورت ہیں اور آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں - ان کے کلام کی فصاحت اور زور کہیں کم نہیں ہوتا - بیان میں روانی غضب کی ہے - ایک بات کو ہزار مرتبہ کہتے ہیں لیکن ایسے انداز سے کہ اس کی دلاویزی کم نہیں ہوتی - سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں تصنع تکلف اور مُبالغہ کا عام رواج تھا - لیکن ان کی شاعری حقیقت کا آئینہ ہے - حقیقت میں جس نیچری شاعری کی بُنیاد آزاد اور حالی نے ڈالی تھی اس کا آغاز میر انیس نے کیا تھا - نیچر کے شاعر ہونے کی حیثیت سے آجکل انیس انگریزی دان طبقے میں بہت مقبول ہیں -

مرزا دبیر مرزا سلامت علی دبیر ۱۲۱۸ھ ۱۸۰۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے - والد کا نام مرزا غلام حسین تھا - وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے - مرزا دبیر کے والد دہلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ گئے وہیں شادی کی اور وہیں رہنے لگے - جب دہلی میں امن ہوا تو مرزا غلام حسین دہلی میں آرہے - مرزا کی عمر سات سال کی تھی کہ پھر لکھنؤ چلے گئے -

مرزا دبیر کی استعداد علمی معقول تھی بچپن ہی سے مرثیہ گوئی کے شوقین تھے - میر ضمیر کے شاگرد ہوئے اور بہت جلد شہرت حاصل کر لی - آخرکار بادشاہ نے بھی ان کو سنا - محلات شاہی اور رؤسائے لکھنؤ ان کے شاگرد ہوئے - اس شہرت، عزت اور اُستاد کی محبت سے دشمنوں میں آتش حسد بھڑک اُٹھی - ایک مجلس میں لوگوں نے اُستاد کے دل میں رنجش پیدا کر دی لیکن یہ رنجش

بہت جلد دور ہو گئی۔ حق یہ ہے کہ مرزا صاحب اپنے استاد کا بہت احترام کرتے تھے۔

مرزا دبیر کی شہرت بہت کافی ہو چکی تھی کہ انیس فیض آباد سے لکھنؤ پہنچے۔ دونوں میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ انیس و دبیر ایک دوسرے کا بہت احترام فرماتے اور نہایت لطیف انداز سے آپس میں نوک جھوک کرتے تھے۔

۱۲۹۱ھ میں مرزا صاحب کو ضعف بصارت کی شکایت ہو گئی۔ واجد علی شاہ نے مٹیا برج بلایا اور کلکتہ میں ایک ماہر ڈاکٹر سے ان کا علاج کروایا۔ کہتے ہیں اس علاج سے یہ شکایت جاتی رہی تھی۔ مرزا صاحب بھی میر انیس کی طرح گھر سے نہیں نکلتے تھے، غدر کے بعد وہ بھی مرشد آباد اور پٹنہ عظیم آباد گئے۔

۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں انہوں نے لکھنؤ میں انتقال کیا۔

مرثیہ گوئی مرزا دبیر نے انیس کی طرح پوری عمر مرثیہ گوئی میں صرف کی اور اپنے فن کے استاد کامل کہلائے۔ ان میں میر صاحب کی اکثر خصوصیات ہیں اور شوکت الفاظ اس پر طرہ امتیاز ہے۔ مرزا صاحب کے الفاظ زوردار تخیل بلند تشبیہات نئی اور مضامین تازہ ہوتے ہیں۔ آیاتِ قرآن کو خوب نظم کرتے ہیں نہایت پرگو اور زود گو شاعر ہیں اور ہر حیثیت سے انیس کے برابر کے ہیں۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

دبیر کو انیس کے مقابلے میں لانا انیسویں صدی کا سخت ظلم ہے۔

انیس و دبیر انیس اور دبیر کی طرفداری میں اہلِ لکھنؤ انیسیوں اور دبیریوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ اِن دونوں گروہوں کا بڑا زوردار مقابلہ رہتا تھا۔ لیکن انیس و دبیر آپس میں نہایت احترام سے ملتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ ایک سال کی کمی بیشی سے پیدا ہوئے اور ایک سال کی کمی بیشی سے فوت ہوئے۔ دونوں کی ایک سوسائٹی تھی اور ایک ہی صنف شاعری اور دونوں اپنے فن میں مسلم الثبوت استاد تھے۔

طرز دبیر و انیس انیس کو شاعری ورثہ میں ملی تھی اور دبیر نے اس میں خود کمال پیدا کیا تھا۔ دونوں صاحبوں کی طرز جدا جدا ہے۔ میر انیس زبان کی صفائی اور حلاوت۔ بندش کی چستی اور محاورے کی درستی کا خیال رکھتے تھے اور مرزا دبیر جدت خیال، بلندی تخیل، شوکت الفاظ، نادر استعارات اور نئی نئی تمثیلوں کو پسند کرتے تھے۔

بعض لوگ اس امتیاز کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ میر صاحب کو عربی درسیات پر عبور نہ تھا حقیقت

یہ ہے کہ یہی کتابی علمیت کی کمی میر صاحب کی شگفتگیٔ کلام کا باعث ہے۔ ان دونوں اُستادوں کے کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ایک دُوسرے پر ترجیح دینا سخت ظُلم ہے۔ دونوں اپنی جگہ پر مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔

مرثیہ کے اسباب مقبولیت لکھنؤ ہمیشہ سے اہلِ تشیع کا مرکز رہا ہے وہاں عشرۂ محرّم بڑی دُھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اظہارِ غم کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ مرثیہ خوانی ہے۔ شعراء مرثیہ گوئی کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہاں کے بادشاہ خود مرثیے کہتے تھے اور مرثیے کہنے والوں کو بڑے بڑے صلے دے کر ہمّت افزائی کرتے تھے۔ اس لیے اس زمانہ میں مرثیہ گوئی کو خوب عروج حاصل ہوُا۔

مرثیہ کے ادبی فوائد میر ضمیر پہلے شخص ہیں جنہوں نے مرثیہ میں نئی ایجادیں کیں اور میر انیس اور دبیر نے ان کو معراجِ ترقی تک پہنچایا۔ اِس دَور سے پہلے مرثیہ چو مصرعہ ہوتا تھا۔ لیکن اَب مسدس ہوگیا۔ حالی نے بھی اسلام کا مرثیہ مسدسِ حالی کے نام سے لکھا۔ سرور جہان آبادی نے اپنی قومی اور نیچرل نظمیں اسی طرز میں کہیں سیکسینا صاحب کے نزدیک آزاد۔ حالی، سرور کی قومی اور نیچرل نظمیں سب مرثیہ کی رہینِ منت ہیں۔

مرثیہ کا مضمون ہمیشہ بلند اور مقدس ہوتا ہے۔ اِس لیے انیس اور دبیر کی مرثیہ گوئی نے لکھنؤ کی قدیم مصنوعی اور مخربِ الاخلاق طرزِ شاعری میں انقلاب پیدا کیا، انیس اور دبیر کے چار پانچ لاکھ شعروں نے اُردو کو صاف اور پاکیزہ الفاظ و محاورات اور ترکیبوں سے مالامال کر دیا۔ اِس سے پہلے اُردو میں رزمیہ نظمیں نہیں ہوتی تھیں ان حضرات کی مرثیہ گوئی نے اِس کمی کو بھی بدرجہ اتم پُورا کر دیا۔

اس دَور میں اور مرثیہ گو بھی تھے جن میں دلگیر اور فصیح قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے پیشتر کے مرثیہ گو شعراء میں مسکین۔ افسردہ اور سکندر وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔

شجرۂ خاندانِ انیس اس خاندان میں شاعری اور علم و فضل کی دولت پشتوں سے نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی چلی آئی۔ میر انیس کے مورثِ اعلیٰ میر امامی موسوی ہروی تھے۔

- میر امامی
  - میر عزیز اللہ
    - میر ضاحک
      - میر حسن
        - خلق
          - انیس
            - نفیس
              - دولہا صاحب عروج
              - دختر
                - عارف
            - سلیس
              - جلیس
            - رئیس
        - خلیق
          - مونس
        - محسن
          - انس
            - وحید

مونس | میر محمد نواب میر انیس کے چھوٹے بھائی - گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے اور مرثیہ بہت خوب کہتے تھے - مگر انیس کی طرح مشہور نہیں ہوئے - مرثیہ نہایت موثر اور دلکش انداز سے پڑھتے تھے - راجہ امیر حسن خاں والئے ریاست محمود آباد ان کے شاگرد تھے، اور معقول مشاہرہ دیتے تھے - ۱۸۷۵ء / ۱۲۹۲ھ میں انتقال ہوا - کوئی اولاد نہیں چھوڑی -

نفیس | میر خورشید علی نام - انیس کے بڑے بیٹے، اپنے دوسرے بھائیوں سے زیادہ لائق تھے - باپ سے اصلاح لیتے تھے - بہت قابل اور خوشگو تھے - انہوں نے ایک بڑا ذخیرہ مراثی اور سلاموں کا چھوڑا - سنہ ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا اور پچاسی سال کی عمر پائی -

عارف | سید علی نام عارف تخلص، سید محمد حیدر کے بیٹے اور میر نفیس کے نواسے تھے - سنہ ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے - اور ۵۷ سال کی عمر میں انتقال کیا -

عارف نے اپنے نانا کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت پائی اور انہی سے اصلاح لی - مہاراجہ سر محمد علی خاں والئے ریاست محمود آباد ان کے شاگرد تھے - اور ایک سو پچیس روپے ماہوار وظیفہ دیتے تھے -

عارف کو زباندان کی حیثیت سے لکھنؤ میں بڑا مرتبہ حاصل تھا - ان کے مراثی بہت فصیح بلیغ

اور زوردار ہیں۔ وہ اپنے مرثیوں میں ساقی نامہ وغیرہ نہیں لکھتے۔ مرثیت کا زیادہ خیال کرتے ہیں۔

جلیس | سید ابو محمد نام، ابو صاحب عرف اور جلیس تخلص تھا۔ مرثیہ گوئی میں پیارے صاحب رشید کے شاگرد تھے۔ عین جوانی میں ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء میں انتقال کیا۔ مرثیہ اور غزل خوب کہتے تھے۔

انس | سید محمد مرزا انس سید علی مرزا کے بیٹے اور سید ذوالفقار علی کے پوتے، صاحب دیوان ہیں۔ مگر اب تک ان کا دیوان نہیں چھپا۔ ناسخ کے شاگرد اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ہر اتوار کو بڑے بڑے شاعر مثلاً قلق۔ بحر۔ اسیر وغیرہ ان کے مکان پر جمع ہوا کرتے تھے۔ سو روپے ماہوار خزانہ شاہی سے ملتا تھا۔ غدر کے بعد ملکہ نواب جہان کی ملازمت کر لی تھی۔ ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء میں نواب کلب علی خاں والئے رامپور نے اپنے استاد امیر مینائی کو بھیج کر انہیں بلایا لیکن تھوڑی مدت بعد وہاں سے واپس آگئے۔ ۹۵ سال کی عمر میں ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء میں لکھنؤ میں فوت ہوئے۔ عشق۔ تعشق۔ صبر صابر اور عاشق ان کے پانچ بیٹے تھے۔

عشق | حسین مرزا نام۔ لیکن میر عشق کے عرف سے خاص و عام مشہور تھے۔ اپنے زمانے کے نامی مرثیہ گو اور انیس و دبیر کے ہمعصر تھے۔ ان کا کلام استادانہ اور بے عیب ہے مگر کلام کی عمدگی کے باوجود انکی شہرت بہت کم ہے۔ ان کے پوتے عسکری مرزا مودب رشید کے شاگرد تھے۔

تعشق | سید مرزا تعشق مرثیہ اور غزل دونوں کے استاد تھے۔ لکھنؤ میں سید صاحب کے لقب سے مشہور تھے عرصہ دراز تک کربلا میں رہے۔ آخر اپنے بھائی میر عشق کے انتقال کے بعد واپس ہندوستان آگئے۔ ناسخ کے شاگرد تھے۔ ان کا کلام جذبات، حسن بندش۔ نزاکت خیال اور تاثیر کی وجہ سے مشہور ہے حقیقت میں وہ فطری شاعر تھے۔ کلام میں سوز و گداز بہت ہے۔ میر انیس ان سے کمال محبت رکھتے تھے۔ ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء میں ۷۰ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔

صابر | احمد میرزا نام، صابر تخلص۔ پیارے صاحب رشید انہی کے بیٹے تھے۔ ان کی شادی میر انیس کی لڑکی سے ہوئی۔ گویا اس رشتہ سے دو مشہور مرثیہ گو خاندانوں میں اتحاد ہوا۔ صابر واجد علی شاہ کے وظیفہ خوار اور نواب ملکہ بیگم کے داروغہ تھے۔ وہ منظوم خطوط جو واجد علی شاہ کلکتہ سے اپنی محبوب بیگم کو بھیجتے تھے۔ ان کا منظوم جواب صابر ہی لکھا کرتے تھے۔ ۷۲ سال کی عمر میں ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں انتقال کیا۔

رشید | سید مصطفیٰ میرزا نام تھا۔ لیکن پیارے صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔

ان کی شادی میر انیس کی پوتی سے ہوئی۔ اپنا کلام اپنے چچا میر عشق کو دکھاتے تھے اور کبھی کبھی میر انیس سے بھی اِصلاح لیتے تھے۔ عشق کے بعد تعشق سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ ان کی غزلوں اور مرثیوں میں زیادہ تر تعشق ہی کا رنگ ہے۔ زیادہ توجہ زبان پر صرف کرتے اور انیس کے قدم بقدم چلتے تھے۔ انہوں نے مرثیے غزلیں۔ سلام۔ رُباعیاں اور قصیدے بکثرت لکھے ہیں۔

غزلوں میں سلاست۔ حلاوت اور پابندیٔ محاورہ بہت ہے۔ جدت خیال اور تاثیر کم ہے، سلاموں میں بھی غزلیت کا اثر زیادہ ہے۔ رُباعیاں کثرت سے ہیں۔ اور بہت عمدہ ہیں، خاص طور پر بڑھاپے کی رُباعیاں بہت مؤثر اور قابل تعریف ہیں۔

رشید نے مرثیہ میں ساقی نامہ اور مناظر بہار کا اضافہ کیا۔ اس سے مرثیہ کی ادبی حیثیت بھی بڑھ گئی۔ اور مرثیہ کی شان میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔

رشید نے رام پور۔ پٹنہ عظیم آباد۔ کلکتہ اور حیدرآباد کا سفر کیا۔ اور ہر جگہ خراج تحسین وصول کیا۔ رشید کا ۷۰ سال کی عمر میں ۱۳۳۶ھ ۱۹۱۷ء میں انتقال ہوا۔ سید باقر حمید۔ موہوب۔ پروفیسر ناصری جلیس۔ اشہر۔ شدید۔ ناظم۔ فرہاد وغیرہ ان کے مشہور شاگرد ہیں۔

خاندانِ دبیر مرزا اوج مرزا دبیر کے صاحبزادے مرزا محمد جعفر اوج شاعری میں اپنے والد کی پیروی کرتے تھے۔ پٹنہ حیدرآباد اور رامپور وغیرہ میں ان کی بڑی قدر اور شہرت تھی۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی بڑے بھاری عروض داں اور زبان داں تھے۔ ایک رسالہ عروض ان سے یادگار ہے۔

(۱۱)

نظیر اکبر آبادی اور شاہ نصیر دہلوی

نظیر کا مرتبہ نظیر کے کلام کا سب شعراء سے الگ رنگ ہے۔ اِس لئے ان کا تعلق کسی خاص دور سے نہیں ہو سکتا۔ قدما کے مقابلہ میں ان کا کلام زمانہ حال کا معلوم ہوتا ہے متوسطین شعرا کی نسبت ان کے کلام میں آزادہ روی بہت ہے اور مضامین اور انداز بیان میں زمین آسمان کا فرق، لکھنؤ کی قدیم طرز یعنی تصنع اور بناوٹ سے بالکل پاک۔ دورِ جدید کے شعرا مومن۔ غالب اور ذوق

فارسی تراکیب کے دلدادہ تھے۔ لیکن نظیر کا کلام سادہ اور صاف ہے۔ اسی سبب سے ہم نے ان کیلئے علیحدہ باب قائم کیا ہے۔

نظیر اکبر آبادی متوفی ۱۲۴۶ھ

نظیر کا نام ولی محمد اور والد کا نام محمد فاروق تھا۔ وہ دہلی میں اُس وقت پیدا ہوئے جب نادر شاہ نے محمد شاہ پر حملہ کیا تھا چونکہ بارہ بچوں میں سے صرف یہی زندہ بچے تھے اِس لئے والدین کے بہت لاڈلے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے میں نظیر اپنی ماں اور نانی کو لے کر آگرے چلے آئے۔ وہیں ان کی شادی ہوئی۔ اور دو لڑکے ہوئے۔

نظیر فارسی کی معمولی استعداد رکھتے تھے۔ تھوڑی سی عربی بھی جانتے تھے۔ ان دنوں خوشنویسی کا بڑا چرچا تھا۔ اس لئے خوشنویسی بھی سیکھی تھی مزاج میں قناعت اس درجہ تھی کہ نواب سعادت علیخاں نے بلایا مگر نہ گئے۔ اسی طرح بھرت پور جانے سے بھی انکار کر دیا۔ اوائل عمر میں متھرا میں معلمی کی۔ پھر آگرہ میں لالہ بلاس رام کے لڑکے کو سترہ روپے ماہوار پر پڑھاتے رہے۔ اخیر عمر میں فالج میں مُبتلا ہوئے اور اسی مرض سے ۱۸۳۰ء میں اِنتقال کیا۔ نظیر نے بہت زیادہ عمر پائی۔ انشا۔ جرأت اور ناسخ کی مجلسیں انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔

نظیر بہت محبت کے آدمی تھے۔ ہر کس و ناکس سے بے تکلفانہ اور بغیر کسی تعصب کے ملتے تھے۔ خورد و بزرگ ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کی وسیع معلومات کا ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے۔ گانے اور سیر تماشے کا بہت شوق تھا۔ نہایت حلیم الطبع اور ظریف تھے۔ جوانی میں رنگین مزاج تھے۔ اور عشق و عاشقی کرتے تھے۔ اِس دور کے کلام میں فواحش بھی پائے جاتے ہیں۔ جوانی میں وہ موتی رنڈی پر عاشق ہو گئے تھے۔ ان کے کلام میں اکثر جگہ اس کا ذکر آیا ہے۔ بہت پُر گو شاعر تھے۔ کہا جاتا ہے' انہوں نے دو لاکھ سے زیادہ شعر کہے۔ انہیں اپنا کلام محفوظ رکھنے کا کبھی خیال نہیں آیا۔ موجودہ کلام لالہ بلاس داس کی یادداشتوں سے نقل کیا گیا ہے۔

نظیر بحیثیت ناصح

نظیر آخر عمر میں تائب ہو کر صوفی صافی بن گئے تھے۔ اِس دور کا کلام نہایت پُر اثر ہے۔ اگر ان کے کلام میں سے معمولی شعر نکال ڈالے جائیں تو وہ بہت بڑے فلسفی اور ناصح شاعر معلوم ہوتے ہیں ان کے اشعار ہم کو دُنیا کی بے ثباتی اور بے حقیقتی کا یقین دلاتے اور رذائل و معائب سے پاک زندگی کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کے اکثر اشعار فقرا خوش الحانی سے پڑھ کر مُنہ مانگی مراد پاتے ہیں۔

شیخ سعدی اور نظیر | نظیر کا مقابلہ شیخ سعدی سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ دونوں کا کلام صاف اور سلیس ہے دونوں میں تصوف کا رنگ ہے اور دونوں عاشقانہ رنگ کے اُستاد اور ناصح شاعر ہیں۔

نظیر بحیثیت ہندوستانی شاعر | نظیر ایک صوفی مشرب آدمی تھے۔ ان کو دنیا کے جھمیلوں اور مذہبی جھگڑوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ہندو اور مسلمانوں سے دلی محبت رکھتے تھے جب ان کا انتقال ہوا تو ہندو مسلمانوں کو برابر کا صدمہ پہنچا۔ ان کے جنازے کے ساتھ ہر مذہب کے آدمی انتہائی حزن و ملال کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔

نظیر بنی نوع انسان کی طرح حیوانات اور بے جان اشیا سے بھی اُنس رکھتے تھے۔ جانوروں کے متعلق ان کی نظمیں نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہیں ہندو مسلمانوں کے تہواروں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے تھے۔ اور اس سیر تماشے سے اخلاقی نتیجے نکالتے تھے۔ ان کی معلومات غیر محدود اور خزانہ الفاظ نہ ختم ہونے والا ہے۔ صفائی بیان نہایت دلکش ہے۔ ہر بات کو صاف صاف کہدیتے ہیں لیکن اس انداز سے کہ کسی کو بُرا نہیں لگتا۔ ہندوستانی شاعر کہنا بالکل درست ہے۔ ان کے خیالات، ان کی زبان، اور ان کے مضامین مقامی رنگ میں ڈوبے ہوتے ہیں۔

خدمات زبان | نظیر کی خدمات زبان بہت قابل قدر ہیں۔ انہوں نے بہت سے ایسے الفاظ لغات شعریہ میں داخل کئے جن کو شعرا سوقیانہ خیال کرتے تھے۔ نظیر کے مستعملہ لغات ذیل کی تین قسموں میں تقسیم ہو سکتے ہیں:-

(۱) ایسے الفاظ جو ان کے ابتدائی کلام میں ملتے ہیں اور اب خلاف تہذیب سمجھے جاتے ہیں۔

(۲) ایسے الفاظ جو عام طور پر اُردو شاعری میں استعمال ہوتے آئے ہیں۔

(۳) وہ الفاظ جن سے حُسن شعر بڑھ گیا ہے۔ اور زبان شعر میں وہ قابل قدر اضافہ ہیں۔

الزامات | کہا جاتا ہے نظیر پڑھے لکھے نہ تھے۔ ان کے اشعار بازاری لوگوں کو پسند تھے۔ ان کا کلام اکثر فحش ہے۔ انہوں نے بازاری الفاظ کی آمیزش سے زبان کا ستیاناس کر دیا۔

سیکسینا صاحب کہتے ہیں سچ پوچھئے تو یہی ان کی صفات اور خصوصیات ہیں۔ وہ ان چیزوں پر طبع آزمائی کرتے تھے۔ جو عوام کو پسند ہیں۔ اس لئے انہی کی زبان استعمال کرتے تھے۔ وہ ہر چیز کا سچا فوٹو پیش کرتے ہیں۔ اس پر اپنی طرف سے کوئی نکتہ چینی نہیں کرتے۔ بلکہ خود عوام کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں، اسی لئے ان کا کلام نیچر کے مطابق ہے اور تصنع اور بناوٹ سے پاک۔

نظیر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے نہ کسی کی ہجو لکھی اور نہ کسی کی تعریف لکھی۔ یہ دونوں

باتیں ان کے کلام کا بہت بڑا جوہر ہیں۔ اور سیکسینا صاحب کے نزدیک ان کے لغزشوں کی تلافی کر دیتی ہیں جو ابتدائے عمر میں ان سے سرزد ہوئی تھیں۔

جدید رنگ اور نظیر

موجودہ نیچر کی شاعری کے پیشرو حقیقت میں نظیر اکبر آبادی ہیں۔ جس طرح انیس و دبیر نے مناظر جنگ اور مناظر قدرت کے بے مثل مرقعے اپنے اشعار میں دکھائے ہیں۔ اسی طرح نظیر نے بھی ایسی معمولی معمولی چیزوں کی ہوبہو تصویر اپنے کلام میں کھینچی ہے۔ جن کا ان سے پہلے کہیں پتہ نہیں ملتا۔ وہ سیدھے سادے الفاظ میں قدرتی مناظر کو بے نقاب کرتے ہیں ان کے اشعار میں مشکل الفاظ، پیچیدہ ترکیبیں اور دوراز کار تشبیہیں بالکل نہیں۔ ان کی نظمیں برخلاف اردو غزلوں کے مسلسل ہیں۔ اور ان میں وہ گہرائی نہیں جو اس زمانہ کی طرز میں داخل ہے۔ غالباً یہی ان کی ہر دلعزیزی کا سبب ہے۔ آگے چل کر نظیر کی یہی طرز ہمارے ادب کی ترقی کا باعث ہوئی اور نیچر کی شاعری کی بُنیاد پڑی جس کے مُوجد آزاد اور حالی کہلاتے ہیں۔

نظیر کا ظریفانہ رنگ اور انشا سے مقابلہ

نظیر ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے مساوی تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ان کو انسانی فطرت کے مطالعہ کا خوب موقع ملتا تھا۔ ان کی ظرافت میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تکلیف دِہ نہیں۔

نظیر اور انشا دونوں اپنے رنگ میں ظرافت کے اُستاد ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انشا کی ظرافت درباری ظرافت ہے جو محض درباریوں اور آقائے نعمت کو خوش کرنے کے لئے اختیار کیگئی ہے گویا ان کا مذاق درباری مسخروں کا سا ہے۔ وہ اپنے آقا کو خوش کرنے کے لئے دوسروں کی عزت کا بھی خیال نہیں کرتے۔ برخلاف اس کے نظیر ایک آزاد روش ظریف ہیں۔ وہ اپنی پُرمذاق باتوں سے کسی کا دل نہیں دُکھاتے بلکہ ہنساتے اور خوش کرتے ہیں۔ باوجود اس فرق کے انشا اور نظیر میں کچھ مماثلت بھی ہے۔ دونوں نے مشکل مشکل ردیف قافیوں میں طبع آزمائی ہے۔ دونوں عربی الفاظ اپنے اشعار میں کامیابی سے موزوں کرتے ہیں۔ دونوں کے کلام میں مقامی رنگ ہے۔ دونوں نے مختلف زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ دونوں کے کلام میں تصوّف ہے۔ دونوں زبان کے بارے میں آزاد ہیں مگر انشا اپنی استعداد علمی کی وجہ سے عربی فارسی الفاظ درست استعمال کرتے ہیں۔ نظیر کی نسبت ان کے ہاں متروکات بہت کم ہیں اور ان کی ظرافت کا رنگ کسی قدر عالمانہ ہے۔

نظیر بحیثیت مصوّر نظیر کو موسیقی کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے اشعار میں بھی نہایت خوش آواز الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اور واقعات کی صحیح تصویر ایک کامیاب مصوّر کی طرح کھینچ دیتے ہیں۔ صنعت تجنیس کے بہت شائق ہیں۔ اکثر ایسے الفاظ لاتے ہیں جو معنوں کے ساتھ اپنی آواز سے بھی اظہار مطلب کرتے ہیں۔ دُور از کار تشبیہوں اور بیجا صنائع بدائع سے ان کا کلام پاک صاف ہے۔ غالباً اسی لئے وہ واقعات اور جذبات کی صحیح ترین تصویر کھینچنے میں زیادہ کامیاب ہیں۔

نظیر کا انیس و دبیر اور انشا و سودا سے مقابلہ اردو شعرا نے ڈرامہ نویسی کا فن اہل عجم سے لیا ہے سنسکرت سے اخذ نہیں کیا۔ سودا نے اپنی طباعی سے ہجو لکھنے کی بُنیاد ڈالی۔ اس لئے ان کو صرف "مذاحیہ نگار" کہہ سکتے ہیں۔ ان کا انسانی مطالعہ بہت کم معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کو "المیہ نگار" نہیں کہہ سکتے۔ میر کے ہاں سوز و گداز بہت ہے مگر کیریکٹر نویسی سے وہ ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔ انشا کے ہاں ظرافت بہت ہے اور وہ خود ایکٹر بننے کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔

انیس و دبیر فطرت کے شاعر ہیں۔ زبان پر پورے قادر اور کیریکٹر نویسی میں مشّاق۔ لیکن ان کی قوت عمل مرثیہ نویسی تک محدود ہے۔ یہ درست ہے کہ "پیشن پلے" یعنی نقل واقعات کربلا ڈرامہ سے بہت قریب ہے لیکن مذہبی جوش کی وجہ سے معمولی معمولی جذبات اِنسانی اس میں نظر انداز ہو جاتے ہیں۔

نظیر کو سودا، انشا اور انیس کی طرح زبان پر پوری قدرت حاصل تھی اور خصائل و جذبات اِنسانی کی معلومات اکثر شعرا سے زائد حاصل تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر سوسائٹی میں بیٹھتے تھے۔ انہوں نے مرد عورتوں اور بچوں کا پوری ہمدردی اور چھان بین سے مطالعہ کیا تھا۔ پردہ کی رسم کی وجہ سے وہ زنانہ فطرت کا اچھی طرح مطالعہ نہیں کر سکتے تھے۔ اِس لئے انہوں نے شاہدان بازاری کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ ان کے اکثر اشعار میں اس کے متعلق اشارے بھی پائے جاتے ہیں۔

نظیر کو کیریکٹر نگاری کا بڑا ملکہ تھا اور قوت بیانیہ بھی غضب کی پائی تھی لیکن ان میں نہ تو شیکسپیئر جیسے گہرے خیالات تھے، اور نہ اس جیسی اعلیٰ ذہانت۔ نظیر کی نظم "لیلیٰ مجنوں" میں المیہ اور "ھادیو کے بیاہ" کی نظم میں مذاحیہ رنگ پوری طرح موجود ہے۔ مگر سودا کا زور۔ میر کی بلند پردازی۔ انشا کی ظرافت اور انیس و دبیر کا جوش و خروش نہیں۔ ہاں یہ سب صفات مجموعی حیثیت سے ضرور پائی جاتی ہیں۔

نظیر کی بڑی صفت یہ ہے کہ وہ معمولی معمولی چیزوں میں غیر معمولی دلچسپیاں پیدا کرتے ہیں۔ انہوں نے شعر میں نئے نئے رنگ اختیار کر کے ادب اُردو کو وسعت دی۔ یہ سچ ہے کہ وہ فاضل شاعر نہیں۔ ان کے کلام میں متروکات و اغلاط بہت ہیں۔ زبان اور خیالات بھی شستہ نہیں لیکن پھر بھی وہ اصلی ہندوستانی شاعر ہیں اور ہر مذہب کے لوگوں کو مرغوب۔ وہ ایسے رنگ کے موجد ہیں جس کو آجکل نیچر کی شاعری کہتے ہیں۔ شعرائے اُردو میں ان کو ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔

شاہ نصیر
متوفی سنہ ۱۸۴۰ء

شاہ نصیر دہلوی کا شمار نظیر اکبر آبادی کی طرح زمانہ اور زبان کے اعتبار سے طبقۂ متقدمین میں کیا جا سکتا ہے مگر ان کو شہرت شعرائے متوسطین کے زمانہ میں حاصل ہوئی اس لئے ان کو دور متقدمین اور متوسطین کی درمیانی کڑی سمجھنا چاہئے۔

نصیر الدین نام۔ نصیر تخلص کرتے تھے۔ کالا رنگ ہونے کی وجہ سے میاں کلو کے عرف سے مشہور تھے۔ ان کے والد شاہ غریب گوشہ نشین فقیر تھے۔ جاگیر کی آمدنی پر بسر اوقات تھی۔ نصیر کی تعلیم و تربیت میں والد نے بہت کوشش کی۔ لیکن ان کو سوائے شاعری کے کچھ نہ آیا۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ شاہ محمدی مائل کے شاگرد ہوئے جو شیخ قیام الدین قائم کے شاگرد تھے۔ گویا اس نسبت سے سودا اور درد سے شاگردی کا تعلق تھا۔ نصیر اپنی شاعری اور خاندانی وجاہت کی بدولت دربار میں پہنچے اور خاطر خواہ انعام پائے۔

شاہ نصیر کو سیر و سفر کا بہت شوق تھا۔ لکھنؤ اور حیدر آباد متعدد مرتبہ گئے۔ دہلی میں اپنے مکان پر مشاعرہ کرتے تھے۔ ان مشاعروں میں ان کے شاگرد ذوق خوب جوہر دکھاتے تھے۔

جب دہلی تباہ ہوئی تو وطن سے باہر نکلے۔ دو مرتبہ لکھنؤ اور چار دفعہ حیدر آباد گئے۔ جب پہلی بار لکھنؤ گئے تو مصحفی۔ انشا اور جرأت سے مقابلے رہے۔ دوسری مرتبہ گئے تو ناسخ اور آتش کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ دیوان چندو لال حیدر آباد میں شعرا کی بہت قدر کرتے تھے۔ انہوں نے ناسخ اور ذوق کو بلایا۔ لیکن وہ دونوں نہ گئے۔ ہاں شاہ نصیر چلے گئے۔ وہاں ان کی شاعری کا بازار خوب گرم ہوا جب چوتھی مرتبہ حیدر آباد گئے تو ۱۲۵۴ھ ۱۸۴۰ء میں وہیں انتقال کیا۔

شاہ نصیر نہایت متین سنجیدہ۔ بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج حنفی مذہب۔ غیر متعصب بزرگ تھے۔ لکھنؤ۔ دہلی اور حیدر آباد میں سینکڑوں شاعر ان کے شاگرد ہوئے۔ آخر زمانہ میں وہ اپنے مایۂ ناز

شاگرد ذوق سے بگڑ گئے تھے کیونکہ انھوں نے زورِ طبع میں میر اور سودا کی غزلوں پر غزلیں لکھنے کی جسارت کی تھی۔

تصانیف شاہ نصیر ایک پُر گو شاعر تھے۔ ساٹھ برس شعر و شاعری کرتے رہے۔ بہت سا کلام تلف ہو گیا آخر کار ان کے شاگرد مہاراج سنگھ نے ان کے کلام کو ترتیب دیا ہے۔ جو ایک لاکھ اشعار پر مشتمل ہے۔

خصوصیاتِ کلام بڑی سنگلاخ زمینوں اور مشکل قافیہ ردیفوں میں غزلیں کہتے اور ان میں لطفِ سخن پیدا کرتے ہیں۔ شکوہِ الفاظ کے عاشق تھے۔ نادر تشبیہیں اور استعارات نکالتے تھے۔ صائب کی پیروی میں مثالیہ اور اخلاقی مضمون خوب باندھتے تھے۔ فی البدیہہ کہنے میں مشّاق تھے علمی استعداد کم تھی۔ کہیں کہیں متروک الفاظ بھی استعمال کرتے تھے۔ کلام میں زور اور اثر ہے لیکن بلند اور اعلیٰ خیالات کم ہیں۔ دوسرے درجہ کے شعرا میں ممتاز درجہ کے شعرا ہیں۔

(۱۲)

طبقۂ متوسطین شعرائے دہلی

ذوق و غالب کا زمانہ

دہلی کی شاعری کا دوبارہ عروج اُردو شاعری کا مرکز نادر شاہی حملوں اور مرہٹوں کی بغاوتوں سے لکھنؤ میں منتقل ہو گیا تھا۔ لیکن تھوڑی مدّت بعد دہلی میں شاعری کو پھر عروج ہوا۔ ظفر۔ ذوق۔ غالب، مومن وغیرہ اس دور کے مشہور شعرا ہیں۔ اِس دَور کے شعرائے دہلی لکھنؤ کی طرزِ جدید کے پیرو نہ تھے، ان کے کلام کی خصوصیات حقیقی شاعری اور صحیح جذبات پر مشتمل تھیں۔

غالب اور مومن کے کلام میں فارسی الفاظ اور محاورات کثرت سے ہیں۔ انہوں نے قدما کی سیدھی سادی ترکیبیں اور محاورے نکال کر ان کی جگہ فارسی الفاظ کو دی۔ مومن اور غالب کے بعد فارسی کا اثر اُردو شاعری پر سے دُور ہو کر شعروں میں صفائی اور روانی پیدا ہو گئی۔ غالب و مومن کے شاگردوں کا کلام دیکھ لیجئے کس قدر صاف اور سہل ہے۔

مومن
سنہ ۱۲۱۵ھ تا سنہ ۱۲۶۸ھ
۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۲ء

حکیم مومن خاں مومن غلام نبی خاں کے بیٹے تھے، ان کے دادا نجبائے کشمیر میں سے تھے۔ وہ سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں آئے اور شاہی حکیموں میں داخل ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں چند موضع انہیں جاگیر میں ملے۔ انگریزی دور میں ان کو پنشن ملتی تھی، اسی پنشن کا کچھ حصّہ مومن خاں کو بھی ملا کرتا تھا۔

مومن ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ حافظہ بہت زبردست تھا۔ عربی فارسی خوب پڑھی تھی۔ طب اپنے باپ اور چچا سے سیکھی تھی۔ نجوم میں بڑی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ شاطر بھی بہت زبردست تھے لیکن ان مشاغل کو انہوں نے ذریعہ معاش کبھی نہیں بنایا۔ خوبصورت، خوش وضع اور عاشق مزاج تھے۔ ایامِ شباب کے بعد توبہ کر کے نماز روزہ کے سختی سے پابند ہو گئے تھے۔

جوانی کا کلام عشق میں ڈوبا ہوا ہے۔ آخری زمانہ کا کلام پختہ اور سنجیدہ ہے۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو کلام دکھلاتے تھے۔ بعد میں اپنی ذہانت خداداد پر بھروسہ کرنے لگے۔ وہ دہلی سے پانچ دفعہ باہر گئے لیکن وطن کی محبت پردیس میں رہنے نہ دیتی تھی۔ جب مرزا غالب نے دلّی کالج کی پروفیسری لینے سے انکار کیا تو یہی جگہ مومن کو اس شرط پر دی گئی کہ وہ دہلی سے باہر جائیں لیکن مومن نے دہلی چھوڑنی قبول نہ کی۔ کپور تھلے تین سو روپے ماہوار پر صرف اس لئے نہیں گئے کہ وہاں اتنی ہی تنخواہ ایک گویئے کو ملتی تھی۔ والیٔ ٹونک نے ایک مرتبہ ان کو بلایا لیکن دہلی کی پُر لطف صحبتیں چھوڑنے کو ان کا جی نہ چاہا۔ ان کے کیریکٹر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ رئیسوں کی خوشامد نہیں کی۔ اُن کے دیوان میں محض ایک قصیدہ ملتا ہے۔ جو مہاراجہ پٹیالہ کی شان میں انہوں نے اُس وقت لکھا تھا جب انہیں ایک ہتھنی تحفۃً دی گئی تھی ؎

صُبح ہوئی تو کیا ہوا، ہے وہی تیرہ اختری
کثرتِ دُود سے سیاہ شعلۂ شمعِ خاوری

مومن اپنی قابلیت اور جوہرِ ذاتی کے مقابلہ میں سب کو ہیچ سمجھتے تھے۔ گلستان سعدی کو ایک معمولی کتاب جانتے تھے۔ تاریخ گوئی میں ان کو کمال حاصل تھا، نئے نئے انداز سے تاریخیں نکالتے تھے۔ تخرجہ اور تعمیہ ہمیشہ سے بُرا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ان کے کمال نے اس کو نہایت درجہ مرغوب و مقبول بنا دیا۔

ان کا دیوان ان کے مشہور شاگرد مصطفےٰ خاں شیفتہ نے مرتب کیا۔ اس میں تمام

اصناف سخن موجود ہیں۔

خصوصیات مومن | مومن خاں نازک خیالی اور بلند پردازی کے لئے شہرۂ آفاق ہیں۔ انکی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں۔ کلام میں بلند پردازی اور صحیح جذبات نگاری ایسے خوبصورت انداز سے جلوہ نما ہے کہ طرز لکھنؤ سے ان کو علیحدہ کر دیتی ہے۔ عاشقانہ رنگ کے اُستاد ہیں اور غالب کی طرح فارسیت کے دلدادہ یعض اوقات یہ فارسیت اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ ان کی مثنویاں سر تیز نشتر ہیں۔ البتہ ان میں عشق بازاری ہے اور طرز ادا بلند نہیں شاعری میں مومن نے الفاظ کا ایسا طلسم باندھا ہے کہ اس سے تخیل کے نئے نئے راستے کھل گئے ہیں۔

اِنتخاب کلام | روزِ جزا جو قاتلِ دلجو خطاب تھا ۔ میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا
پس از شکستنِ خم زجرِ محتسب معقول ۔ گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے
نقدِ جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف ۔ خونِ فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا

مرتبۂ مومن | مومن شعرائے اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں، وہ صاحب طرز تھے۔ نسیم دہلوی، امیر اللہ تسلیم۔ حسرت موہانی وغیرہ انہی کے پیرو ہیں۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ۔ میر حسن تسکین۔ میر غلام علی وحشت۔ اصغر علی خاں وغیرہ ان کے مشہور شاگرد ہیں۔

مومن ۱۸۵۲ء میں کوٹھے سے گر گئے۔ انھوں نے حساب کر کے خود حکم لگایا کہ پانچ دن، پانچ مہینے یا پانچ برس میں مروں گا چنانچہ پانچ مہینے بعد مر گئے۔ دست و بازو بشکست (۱۲۶۸ھ) اپنے گرنے کی تاریخ کہی۔ وہی مرنے کی تاریخ ہو گئی۔

شیفتہ ۱۲۳۱ تا ۱۲۸۶ھ ۱۸۱۵ء تا ۱۸۶۹ء | نواب مصطفٰے خاں شیفتہ۔ ان کے والد نواب مرتضیٰ خاں نے لارڈ لیک کے ساتھ بڑے بڑے کام کئے تھے اور اس کے صلے میں ہوڈل پلول کا علاقہ جاگیر میں پایا تھا۔ شیفتہ ۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ غدر کے بعد وہ اپنے علاقے جہانگیر آباد ضلع بلند شہر میں جا رہے تھے۔ اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں غالب سے اور اُردو میں مومن سے اصلاح لیتے تھے۔ شاید وہ اپنا کلام مومن کے بعد غالب کو دکھانے لگے ہوں۔

شیفتہ نے امام بخش صہبائی۔ عبداللہ خاں علوی۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ۔ شاہ نصیر۔ غالب، ذوق۔ احسان۔ تسکین اور حکیم آغاجان عیش جیسے لوگوں کی صحبتوں میں پرورش پائی تھی۔ ان کے ہاں خود بھی مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ بڑے سخن سنج اور سخن فہم تھے۔ یہ سمجھ لیجئے غالب جیسا صاحب کمال اپنے کلام کی کسوٹی شیفتہ کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے ؎

غالب بفنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

شیفتہ حج کرنے کے بعد شعر کی طرف سے بے توجہ ہو گئے تھے۔ لغو باتوں سے توبہ کر کے عبادت میں اپنا وقت صرف کرتے تھے۔ ان کی شہرت ناقد کی حیثیت سے بہت ہے۔ ان کا تذکرہ گلشن بیخار آزادانہ تنقیدوں سے مالامال ہے۔ اُردو شاعری میں وہ مومن کے پیرو ہیں۔ اخلاق و تصوف ان کے کلام کی جان ہے۔ اُردو اشعار اگرچہ بہت اعلیٰ نہیں۔ مگر بلند مضامین۔ صاف اور بامحاورہ زبان اور پاکیزہ خیالات کی بدولت دُوسرے درجے کے شعرا میں ان کا مرتبہ ممتاز ہے۔ ان کا کلام ان کے صاحبزادے نے چھپوا دیا ہے۔

تسکین
سنہ ۱۲۱۸ تا سنہ ۱۲۶۸ھ
۱۸۰۳ – ۱۸۵۱ء

میر حسین نام۔ میر احسن عرف میرن صاحب کے بیٹے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ درسی کتابیں امام بخش صہبائی سے پڑھیں۔ شاہ نصیر سے اصلاح سخن لی۔ شاہ صاحب کے انتقال کے بعد مومن کے شاگرد ہوئے۔ تلاش معاش میں لکھنؤ سے میرٹھ گئے۔ وہاں سے ناکام رامپور آئے۔ نواب یوسف علی والئے رامپور نے بڑی قدردانی کی۔ آخر کچھ مدّت بعد سنہ ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء میں وہیں انتقال کیا۔

کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کے شاگردوں میں ان کا خاص رُتبہ تھا۔ وہ اس طرح اُستاد کے قدم بقدم چلتے ہیں کہ دونوں کے کلام میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ تسکین کے بیٹے میر عبدالرحمٰن آسی بھی نامور شاعر ہوئے ہیں۔

نسیم دہلوی
سنہ ۱۷۹۴ تا سنہ ۱۸۶۴ء

مرزا اصغر علی خاں نام۔ نواب آقا علی خاں کے بیٹے، دہلی میں سنہ ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوئے، اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ باپ کے بعد بڑے بھائی سے ناموافقت ہو گئی اور لکھنؤ چلے آئے۔ بعد میں معافی مانگ کر بھائیوں نے ملنا چاہا۔ لیکن وہ

نہ مانے اور پھر کبھی دہلی نہ آئے۔ تمام عمر لکھنؤ میں فقر و فاقہ سے بسر کی، اور کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ احکام مذہب کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ غدر کے بعد منشی نولکشور کے ہاں الف لیلیٰ کو نظم میں لکھنا شروع کیا۔ پہلا دفتر ختم کرنے کے بعد مطبع والوں نے جلدی مچائی اور یہ ان کو ناگوار گزری، اس لئے اس کام سے دست کش ہو گئے۔

اس وقت طرز لکھنؤ بہت زوروں پر تھی۔ لیکن پھر بھی نسیم کو اپنی خاص طرز میں شہرت حاصل تھی۔ وہ اپنے کلام کو احتیاط سے نہیں رکھتے تھے اس لئے بہت کچھ تلف ہو گیا۔ ان کے شاگرد عبدالواحد خاں نے ان کا کلام چھپوایا۔ لیکن وہ اس کو اپنے لئے باعثِ ننگ سمجھتے تھے۔ مرزا غالب بھی نسیم کی غزلوں کو پسند کرتے تھے۔ وہ طرز اور زبان میں دہلی کے پیرو تھے۔ مگر پھر بھی بہت سے اہل لکھنؤ ان کے شاگرد ہوئے۔ جن میں عبداللہ خاں مہر، منشی اشرف علی اشرف اور امیراللہ تسلیم مشہور ہیں۔

طرز کلام نسیم کے کلام میں مومن کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ ان کی لطیف طرز میں نازک خیالی کی آمیزش ہے اور یہ مومن کا فیض ہے۔ صحت محاورات اور تازگی مضامین کا بہت خیال تھا لکھنؤ کی تصنع اور لفاظی نہ تھی۔ اپنے اُستاد کی طرح فارسی ترکیبیں کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا رتبہ دوسرے درجے کے شعرا میں بہت بلند ہے۔

ذوق
۱۷۸۹ء تا ۱۸۵۴ء

شیخ ابراہیم نام۔ ایک غریب سپاہی شیخ محمد رمضان کے بیٹے تھے ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول سے پائی تھی۔ حافظ صاحب شعر کا ذوق رکھتے تھے اور محلے کے لڑکے ان سے پڑھتے تھے۔ بچپن میں ذوق اپنا کلام حافظ صاحب ہی کو دکھاتے رہے۔ اس وقت شاہ نصیر کی دہلی میں بہت شہرت تھی ان کے ہم سبق میر کاظم حسین شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ ان کی وساطت سے ذوق بھی شاہ صاحب کے شاگرد ہو گئے۔

ذوق کی طباعی دیکھ کر شاہ نصیر کو خیال ہوا۔ کہیں ہونہار شاگرد اُستاد سے نہ بڑھ جائے، اس لئے وہ اکثر ان کا کلام بغیر اصلاح کے پھیر دیتے اور کہتے طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ ایک دفعہ ذوق نے سودا کی غزل پر غزل کہی۔ اس پر شاہ نصیر بہت ناراض ہوئے اور غزل اُٹھا کر پھینک دی غرض انہی باتوں نے ذوق کی طبیعت کو اُبھارا اور سلسلۂ شاگردی ختم کر دیا۔ اب ذوق اپنے کلام کو

خود ہی دیکھتے تھے۔ ان کے کلام کی بہت جلد شہرت ہو گئی۔ اس زمانہ میں ظفر ولیعہد تھے اور قلعہ میں بڑے زور کے مشاعرے ہوا کرتے تھے ذوق بھی وہاں جاتے اور اپنے جوہر دکھلاتے تھے۔ اتفاق سے شاہ نصیر دہلی سے باہر گئے ہوئے تھے اور ولیعہد بہادر کے کلام کی اصلاح میر کاظم حسین بیقرار کے سپرد تھی اتفاقاً ان کو بھی کہیں باہر جانا پڑا۔ اب اصلاح کی خدمت ذوق کے سپرد ہوئی اور چار روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہو گئی۔ آہستہ آہستہ تمام شعرا ان کو اُستاد ماننے لگے۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے، نواب الٰہی بخش خاں معروف مرزا غالب کے خسر اعلیٰ خاندان، عالی ہمت اور کہنہ مشق شاعر پہلے شاہ نصیر کے شاگرد تھے، اب وہ بھی ذوق سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ تذکرۂ گل رعنا کے مُصنف لکھتے ہیں۔ مولانا آزاد نے جوشِ عقیدت میں یہ لکھ دیا ہے۔ ورنہ نواب صاحب کی عُمر اس وقت چھیاسٹھ برس کی تھی اور ذوق بمشکل اٹھارہ برس کے ہوں گے۔ سوچنے کی بات ہے آخر ذوق میں کچھ تو جوہر ایسے تھے۔ کہ وہ اتنی چھوٹی عمر میں ولیعہد بہادر کے اُستاد اور خاقانی ھند کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ انہی لوگوں کی شاگردی نے ذوق کی طبیعت پر جلا کی۔ نواب صاحب سودا جرأت اور درد کی طرز میں شعر لکھتے تھے اور اُستاذ ذوق بھی اسی رنگ میں اصلاح دیتے تھے۔

شاہ نصیر سے معرکہ جب شاہ نصیر دکن سے واپس آئے تو ذوق خاص و عام سے اُستادی کی سند لے چکے تھے اور مشکل بحروں اور ردیف قافیوں میں آسانی سے غزلیں کہہ لیتے تھے۔ شاہ نصیر نے دکن میں کسی کی فرمائش سے نو شعر کی ایک غزل لکھی تھی جس کی ردیف "آتش و آب و خاک باد" تھی ایک دن انہوں نے وہی غزل مشاعرے میں سُنائی اور کہا اگر کوئی اس طرح میں غزل کہدے تو اُس کو اُستاد مانتا ہوں۔ ذوق نے اسی طرح پر ایک غزل اور تین قصیدے لکھ کر ایک مشاعرے میں پیش کئے۔ شاہ صاحب کو یہ بات ناگوار گزری۔ ایک شاگرد سے اعتراض کروا دیئے۔ ذوق نے بھی خاطر خواہ جواب دیئے اور کہا۔ آپ نے تو ایک غزل کے لئے کہا تھا۔ مَیں نے ایک غزل اور تین قصیدے لکھ ڈالے ہیں، اب بھی آپ اُستاد تسلیم نہیں کرتے۔ اس واقعے کے بعد سے ذوق کی اُستادی مسلّم ہو گئی۔

۱؎ اس زمانے کے چار روپے آجکل کے حساب سے چار سو روپے کے برابر ہوتے ہیں ۱۲

ذوق کے پُر زور قصائد کے صلے میں اکبر شاہ ثانی نے خاقانیٔ ہند کا خطاب دیا تھا۔ جب ظفر بادشاہ ہوئے تو ان کی تنخواہ سَو روپے ہو گئی۔ اس کے علاوہ ہمیشہ خلعت گاؤں اور انعام وغیرہ ملتے رہتے تھے۔ لیکن ذوق ہمیشہ اپنے اسی تنگ و تاریک مکان میں رہے۔ ۶۸ سال کی عمر میں ۱۸۵۴ء میں انتقال کیا۔

اُستاد ذوق کا حافظہ بہت تیز اور دل میں خوف خدا بیحد تھا۔ شروع میں موسیقی۔ نجوم اور طب وغیرہ سے بھی دلچسپی رہی۔ لیکن کمال شعر گوئی میں حاصل کیا۔ فقہ۔ تصوّف۔ تفسیر۔ حدیث۔ تاریخ پر بہت عبور تھا۔ روزے نماز کے سختی سے پابند تھے۔ دہلی سے بہت محبت تھی۔ راجہ چندولال نے حیدر آباد کی دعوت دی لیکن انہوں نے یہ لکھ کر ٹال دیا ؎

اِن دِنوں دکن میں ہے گرچہ بڑی قدر سخن کون جائے ذوقؔ پر دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر

تصانیف اُستاد ذوق تقریباً پچاس سال تک شعر و شاعری کرتے رہے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا سارا کلام ہنگامۂ غدر میں ضائع ہو گیا۔ ان کے شاگرد رشید مولانا آزاد نے باقی ماندہ کلام دیوان ذوق کے نام سے مرتب کیا۔

خدمات زبان ذوق نے زبان کو خوب صاف کیا۔ وہ الفاظ کی نشست اور مناسب استعمال سے کما حقہٗ واقف تھے۔ محاورات اور امثال کے استعمال میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔

انداز کلام ذوق کی شاعری میں تصنع اور تکلف بالکل نہیں۔ استعارے تشبیہیں اور صنائع بدائع انہوں نے اِس احتیاط سے صرف کئے ہیں کہ حسن شعر دوبالا ہو گیا ہے۔ کلام میں روانی اور ترنم خوب ہے۔ اعلیٰ تخیل اور بلند مضامین الفاظ کی خوبصورتی اور برمحل استعمال میں مزاحم نہیں ہوتے۔ کلام حشو زوائد سے پاک ہے زور کلام اور تنوع کو مدِنظر رکھ کر ان کا مقابلہ صرف سوداؔ سے ہو سکتا ہے۔ ویسے ان کے ہاں دردؔ۔ جرأتؔ اور مصحفیؔ کا رنگ بھی موجود ہے۔ قصیدہ گوئی میں وہ اُستاد کامل تھے۔ اس صنف میں آپ ہی اپنی نظیر ہیں۔ ان کی غزلیں تازگیٔ مضامین، خوبیٔ محاورہ، سادگی اور صفائی کے لئے مشہور ہیں۔

وہ نازک خیالی اور معنی آفرینی میں خواہ غالب سے کم ہوں مگر سادگی صفائی اور مترنم الفاظ کے لحاظ سے، غالب سے بہت آگے ہیں اور قصیدے میں تو ان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتا۔

شاگرد ان کے شاگرد تو سینکڑوں تھے۔ لیکن داغؔ۔ ظفرؔ۔ آزادؔ۔ ظہیرؔ اور انورؔ بہت مشہور ہیں۔ ان کے

اکلوتے بیٹے خلیفہ محمد اسمٰعیل غدر سے پہلے انتقال کر چکے تھے۔

ظہیر متوفی ۱۹۱۱ء سید ظہیر الدین نام تھا۔ ان کے والد سید جلال الدین حیدر ابو المظفر بہادر شاہ کے خوشنویسی میں اُستاد اور مرصع رقم اور خان بہادری کے خطابات سے سرفراز تھے۔ ظہیر بچپن ہی سے شاہی مُلازم تھے اور شعرو شاعری کا شوق رکھتے تھے۔ کہتے ہیں چودہ برس کی عمر میں اُستاد ذوق کے شاگرد ہوئے تھے۔

ظہیر غدر میں دہلی سے نکل کر جھجر۔ سونی پت۔ نجیب آباد۔ بریلی اور لکھنؤ گئے، وہاں بھی ابتری دیکھی تو رامپور پہنچے۔ چار برس رہ کر رامپور سے دہلی آئے اور محکمہ چُنگی میں ملازمت کر لی۔ پھر اخبار جلوۂ طور کے ایڈیٹر ہو گئے جو بلند شہر سے نکلتا تھا۔ مہاراجہ الور ان کے مضامین کو بہت پسند کرتے تھے انہوں نے الور بُلا لیا۔ جہاں وہ چار برس رہے۔ آخر وہاں کی سازشوں سے تنگ آکر دہلی چلے آئے۔ پھر نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کی سفارش سے جے پور پولیس میں مُلازم ہو گئے وہاں انیس برس بعد والئے ریاست کا انتقال ہو جانے سے ملازمت جاتی رہی چند روز پریشانی میں گُذرے پھر نواب ٹونک نے بُلا لیا۔ جب تک نواب زندہ رہے انکے ساتھ وابستہ رہے۔ نواب کے مرنیکے بعد ان کے بیٹے نے ظہیر کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس طرح پندرہ سولہ برس ٹونک میں بھی رہے۔ آخر عمر میں ٹونک سے رُخصت لے کر حیدر آباد گئے۔ جہاں آٹھ مہینے بعد باریابی ہوئی اور ابھی تنخواہ مقرر نہ ہونے پائی تھی کہ انتقال فرما گئے۔

ظہیر پُرگو شاعر تھے[۱] ان کے چار دیوان ہیں۔ پہلے تین چھپ چکے ہیں۔ اگرچہ ذوق کے شاگرد تھے لیکن کلام میں مومن خاں کا رنگ ہے۔ خود کہتے ہیں ؎

طرز مومن سے نہ آگاہ تھا جبتک کہ ظہیر — سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

ظہیر آخری دور کے بڑے نامور شاعر تھے اور اُستاد مانے جاتے تھے۔ ان کے مشہور شاگرد نجم الدین ثاقب بدایونی پہلوان سخن کے لقب سے مشہور ہیں۔

انور سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا ظہیر دہلوی کے چھوٹے بھائی اُستاد ذوق کے شاگرد تھے ذوق کے بعد اپنا کلام غالب کو دکھانے لگے۔ نہایت قابل اور ہونہار شاعر تھے۔ ۳۸ سال کی عمر میں جے پور میں انتقال کیا۔

---

[۱] داستان غدر کے نام سے انکی ایک اور تصنیف بھی چھپی ہے اسمیں غدر کے چشمدید حالات نہایت دردناک پیرائے میں بیان کئے ہیں۔

انور غدر کے بعد اُن مشاعروں میں شریک تھے جن میں داغ۔ حالی۔ ظہیر۔ مجروح اور سالک وغیرہ چہچہاتے تھے۔ ان کے کلام میں ذوق۔ غالب اور مومن کا رنگ ہے۔

غالب
۱۷۹۶ء تا ۱۸۶۹ء

مرزا اسداللہ خاں نام پہلے اسد اور پھر غالب تخلص کرتے تھے۔ آگرہ میں پیدا ہوئے اپنی ذاتی قابلیت اور عالی خاندانی پر بہت ناز تھا۔ سلسلۂ خاندان ایبک ترکمانوں سے ملتا ہے۔ اپنے آپ کو سلاطین سلجوقیہ کی وساطت سے فریدوں کی نسل سے بتاتے تھے مرزا کے دادا ہندوستان آکر شاہ عالم کے دربار میں ملازم ہوئے۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں متلون مزاج تھے۔ وہ پہلے حیدر آباد کی فوج میں رہے۔ پھر الور میں نوکر ہوئے۔ اور وہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کا سن پانچ سال کا تھا مرزا کی والدہ خواجہ غلام حسین رئیس آگرہ کی لڑکی تھیں۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا کو ان کے چچا نصیراللہ بیگ خاں نے تعلیم و تربیت دی۔ خاں صاحب انگریزی فوج میں رسالدار تھے۔ اپنی خدمات کے صلے میں انہوں نے جاگیر بھی پائی تھی۔ مرزا نو ۹ برس کے تھے کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ سرکار انگریزی سے مرزا کی پنشن مقرر ہو گئی، اور تعلیم و تربیت ننہیال کے سپرد ہوئی۔ سارا بچپن آگرہ میں گذرا۔ کہتے ہیں انہوں نے نظیر اکبر آبادی سے بھی کچھ کتابیں پڑھی تھیں۔

چودہ ۱۴ برس کی عمر تھی کہ مرزا کی ملاقات ہرمز نام ایک پارسی سے ہوئی۔ بعد میں وہ پارسی مسلمان ہو گیا اور عبدالصمد نام رکھا۔ مرزا نے دو ۲ سال اس سے اکتساب کیا۔ کہتے ہیں۔ اسی کے فیضان صحبت سے مرزا صحیح اور با محاورہ فارسی بولنے اور لکھنے کے قابل ہوئے۔

مرزا پہلی مرتبہ ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء میں دہلی آئے اس وقت ان کا سن تیرہ ۱۳ برس کا تھا۔ مرزا کی شادی ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے ہوئی۔ معروف نواب لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ اس وقت دہلی میں شعر و شاعری کا بہت چرچا تھا۔ اگرچہ مرزا فارسی میں کہتے تھے، لیکن ماحول کے اثر سے اُردو میں بھی کہنے لگے۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے لیکن جب کسی شخص کا یہ شعر سنا

اسد تم نے غزل اچھی سنائی ۔۔۔ ارے اُو شیر رحمت ہو خدا کی

تو اس تخلص سے نفرت ہو گئی۔ ۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۹ء میں غالب تخلص اختیار کیا۔ لیکن جن غزلوں میں اسد بندھ چکا تھا اُن کو اسی طرح رہنے دیا۔

مرزا کی پنشن بند ہو چکی تھی - اس کے لئے وہ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گئے۔ ولایت میں بھی اپیل کی مگر ناکام رہے
واپسی پر لکھنؤ اور بنارس کی سیر کی - انہوں نے ایک قصیدہ بادشاہ اودھ نصیر الدین حیدر شاہ کی
خدمت میں پیش کیا - جہاں سے پانسو روپے سال مقرر ہو گئے - دو سال بعد سلطنت اودھ کا
خاتمہ ہوا اور یہ وظیفہ بند ہو گیا - ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۷ء میں کوتوال شہر کی عداوت سے غالب تین ماہ قید رہے -
لیکن ان کے مرتبے کے مطابق قید خانے بھی ان کا احترام ہوتا تھا -

۱۸۴۲ء میں دہلی کالج میں فارسی کے پروفیسر کی جگہ خالی تھی - ٹامسن صاحب سیکرٹری گورنمنٹ انگریزی نے
ان کو بلا بھیجا - مرزا ان سے ملنے گئے لیکن وہ حسب دستور استقبال کے لئے باہر نہ آئے - یہ بات مرزا نے کسر شان
خیال کی اور یہ کہکر نوکری سے انکار کر دیا کہ میں نوکری کر کے اپنی عزت بڑھانی چاہتا ہوں گھٹانا نہیں چاہتا -
۱۸۴۹ء میں بادشاہ دہلی نے ان کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کا خطاب دیا - پچاس روپے ماہوار
مقرر کئے اور تاریخ خاندان تیموری لکھنے کا حکم دیا - ذوق کی وفات کے بعد اصلاح کا کام بھی انہی کے سپرد
ہوا - غدر کے بعد ان کی پنشن بند ہو گئی تھی لیکن بے گناہ ثابت ہونے پر عزت اور پنشن بحال ہو گئی -
غالب نواب یوسف علی خاں والئے رامپور کے بھی استاد تھے - اور سو روپے ماہوار ان کی سرکار سے پنشن
پاتے تھے - آخر ۷۳ سال کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں دہلی میں انتقال کیا اور درگاہ نظام الدین اولیا کے قریب
چونسٹھ کھمبے میں دفن ہوئے -

عام حالات | غالب نہایت ملنسار اور خلیق تھے - اپنے احباب کے ساتھ نہایت وضعداری اور محبت سے
خط و کتابت کرتے تھے - ان کے خطوط کا مجموعہ اردوئے معلی اور عود ہندی کے نام سے بارہا چھپا ہے -
مذہبی تعصبات سے بالاتر تھے - منشی ہر گوپال تفتہ ان کے خاص شاگرد تھے - مرزا کبھی آسودہ حال اور
فارغ البال نہیں رہے - باوجود اس کے ان کی آمدنی اپنے احباب اور ارباب احتیاج کے لئے وقف تھی
نہایت صاف گو اور پاک باطن تھے - اپنے عیوب کبھی نہ چھپاتے تھے - خلق اور تواضع کے ساتھ
خودداری بہت تھی - دہلی کالج کی پروفیسری سے انہوں نے صرف اس لئے انکار کر دیا تھا - کہ
ٹامسن صاحب نے بدستور سابق ان کا استقبال نہ کیا تھا -

مرزا کی شادی تیرہ ۱۳ برس کی عمر میں ہوئی - بیوی سے ان کے تعلقات کچھ شگفتہ نہ تھے لیکن ظاہرہ
رکھ رکھاؤ میں کبھی فرق نہ آیا - ان کی اولادیں بچپن ہی میں ضائع ہو گئیں - چھوٹے بھائی فاتر العقل تھے -

اپنی بیوی کے بھانجے عارف سے محبت تھی۔ اس کے جوان مرجانے سے مرزا کو بہت صدمہ ہوُا۔ ان کا چھوٹا بھائی یوسف غدر میں مرا تھا۔

سیکسینا صاحب لکھتے ہیں۔ آخر عمر میں مرزا کی زندگی آلام و امراض کے لئے وقف ہو گئی تھی۔ ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ اپنے افکار و مصائب کو شراب نوشی سے ہلکا کرتے ہوں لیکن کیا فرماتے ہیں سیکسینا صاحب مرزا کی ایام شباب کی شراب نوشی کے متعلق ؟

چونکہ مرزا نے میر تقی کی طرح ہمیشہ درد اور دُکھ پائے تھے اس لئے ان کے کلام میں سوز اور درد کی ہر جگہ جھلک موجود ہے۔ ان کے کلام میں تفاخر بیجا نہیں بلکہ اس سے حسن شعر میں اضافہ ہوتا ہے مثلاً

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

مرزا کی نمایاں خصوصیت لطیف ظرافت اور شگفتہ مزاجی ہے۔ وہ ہر دُکھ کو ہنسی خوشی کاٹ دیتے ہیں۔ کس فلسفیانہ انداز سے کہتے ہیں ؎

رنج سے خوگر ہوُا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مرزا کی ظرافت اور لطافت سخت سے سخت موقعوں پر بھی کم نہیں ہوتی وہ اپنی بیوی کے متعلق لکھتے ہیں "ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے"۔

غالب بحیثیت شاعر مرزا کی شاعری کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ ایک وسیع النظر اور کثیر المعلومات شاعر تھے۔ فارسی کے ساتھ ان کو خاص دلچسپی تھی۔ وہ خود کہا کرتے تھے میری قابلیت کا اندازہ میرے فارسی کلام سے لگانا چاہیئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان کی فارسی شاعری کی طرف ابھی تک کسی نے توجہ نہیں کی۔ اس وقت تک ان کی شہرت صرف اُردو کلام کی وجہ سے ہے اُردو میں وہ احباب کے اصرار پر یا تبدیل ذائقہ کے لئے کہتے تھے، حافظہ بہت اچھا پایا تھا۔ کتابیں مانگ کر پڑھتے اور ان کو اپنے دماغ میں محفوظ رکھتے تھے۔ فی البدیہہ کہنے کی بھی عادت تھی۔ کلکتہ میں چکنی ڈلی پر فی البدیہہ قطعہ کہا تھا۔ فن عروض کے اُستاد تھے۔ نجوم میں بھی دخل تھا۔ تصوف سے خوب واقف تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بہت بڑے فلسفی شاعر تھے۔

تصانیف یوں تو ان کی بارہ[12] تیرہ[13] تصانیف ہیں۔ لیکن دیوان اُردو۔ اُردوئے معلّٰی۔ قاطع برہان، اور مہر نیم روز وغیرہ بہت مقبول ہیں۔

فارسی کلام غالب نظم و نثر فارسی کے اُستاد تھے۔ ان کی فارسی دانی کا اندازہ ان کی تصنیف قاطع برہان سے ہو سکتا ہے جس میں انہوں نے فارسی کی مشہور لُغت برہان قاطع پر فاضلانہ اعتراض کئے ہیں۔ فارسی شاعری میں ان کا مقابلہ خسرو۔ بیدل۔ نظیری۔ فیضی اور حزیں وغیرہ سے کیا جا سکتا ہے۔

غالب کی شاعری کے تین دور

(۱) مرزا کی شاعری کا دورِ اوّل اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب سے انہوں نے شعر کہنا شروع کیا تھا۔ یہ دور پچیس سال کی عمر میں ختم ہو جاتا ہے۔ مرزا کے مکمل اُردو دیوان کو دیکھ کر ان کے ابتدائی رنگ کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

مرزا کے ابتدائی کلام میں ایسی عجیب و غریب تشبیہیں اور بلند پروازیاں ہیں جن سے شعر کے معنی مبہم ہو جاتے ہیں۔ فارسی کی مخصوص بندشیں اور غیر مانوس الفاظ شعر کی روانی اور فصاحت کلام کو خراب کر دیتے ہیں۔ وہ اثر اور عمق جو ان کے بعد کے کلام میں ہے۔ ابتدائی کلام میں نہیں شروع کے اشعار میں فارسی کی اس قدر آمیزش ہے کہ ان کو مشکل سے اُردو اشعار کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ ادنیٰ تغیّر سے وہ بالکل فارسی شعر بن جاتے ہیں۔ ایسے اشعار سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ آیندہ زمانہ میں بہت ترقی کریں گے۔ اصل میں وہ مرزا بیدل کی پیروی کرتے تھے اور اُردو میں یہ طرز کچھ چلتی نہ تھی۔ حکیم آغا جان عیشؔ نے کیا خُوب کہا ہے ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا ہے جب اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ہمیں مولانا فضل حق خیرآبادی مفتی صدرالدین آزردہ کا شکرگزار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے غالب کو سمجھا بُجھا کر یہ رنگ ترک کرا دیا۔

(۲) دُوسرے دَور میں غالب کے کلام میں فارسیت کا وہ غلبہ اور نازک خیالیوں کا وہ انداز نہیں جو پہلے دور میں تھا۔ اس دور میں زبان صاف ہے۔ الفاظ پر قدرت بڑھ گئی ہے۔ فارسی بندشوں اور محاورات کے استعمال میں احتیاط ہے۔ فارسی خیالات موجود ہیں۔ لیکن وہ طبع سلیم پر

گراں نہیں گزرتے اِس قسم کے اشعار تھوڑی سی کاوش سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ ان گتھیوں کو سلجھا کر دل و دماغ کو ایک قسم کی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

(۳) مرزا کی شاعری کا تیسرا دور ان کی شاعری کا ارتقائی دور ہے۔ اِس دور کے بعض اشعار اپنی جامعیت اور اختصار میں بے مثال ہیں۔ ندرت خیال کے ساتھ لطافت زبان اور شستگی کلام عجیب لطف دیتی ہے، انہی خصوصیات کی بدولت غالب کو شعرائے اردو کی صفِ اوّل میں ممتاز جگہ ملی ہے۔

خصوصیات غالب

(۱) جدت پسندی — غالب کے ہاں تخیل طرز ادا۔ تشبیہات۔ استعارات۔ محاکات۔ تراکیب الفاظ غرض ہر چیز میں جدت ہے۔ پامال مضامین کو وہ ایسے انداز سے بیان کرتے ہیں کہ بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اسلوب بیان سے نہایت ادنیٰ مضامین کو بے انتہا بلند کر دیتے ہیں۔ بیشک شعر ایک معما بن جاتا ہے۔ لیکن اس کا حل کرنا دماغ کو بہت لطف دیتا ہے۔ غالب کے ہاں الفاظ خیالات کے تابع ہیں۔ اور دوسرے شعرا کے ہاں معاملہ برعکس ہے۔ وہاں الفاظ کی متابعت سے اشعار میں تصنع اور بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ غالب کے کلام میں محض قافیہ پیمائی نہیں بلکہ خیال آفرینی ہے

غالب بنود شیوہ من قافیہ بندی ظلمے ست کہ بر کلک و ورق میکنم امشب

(۲) نظر فریب طرز تحریر — غالب کے کلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی چیز کا تفصیلی ذکر نہیں کرتے بلکہ پڑھنے والے کا خیال خود اس کے لوازمات جمع کر لیتا ہے۔ گویا ان کے ہاں بات سے بات پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

(۳) ذاتی جذبات کا ادا کرنا — ان کے اشعار انکے خیالات کا صحیح فوٹو گراف ہیں۔ وہ زندگی اور اس کی مختلف کیفیات کو نہایت دلکش پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

(۴) فلسفہ اور حقیقت — مرزا بہت بڑے فلسفی شاعر تھے۔ وہ حقائق فلسفہ کو اپنے اشعار میں نہایت آسان و سادہ طریقہ سے بیان کرتے ہیں۔ رموز و حقائق تصوف سے پوری طرح واقف اور تعصبات سے آزاد ہیں ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

(۵) جذبات نگاری — جذبات انسانی کو نہایت مؤثر اور دلکش الفاظ میں بیان کرتے ہیں ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ظرافت و شوخی مرزا کے کلام میں درد اور شوخی دونوں نہایت عمدہ نسبت سے ملے ہوئے ہیں متین سے متین آدمی بھی اس سے لُطف اندوز ہوتا ہے۔

غالب اور معاصرین علوئے خیال۔ فلسفۂ حیات اور ذہانت وطباعی میں غالب اپنے معاصرین ذوق و مومن سے بڑھے ہوئے ہیں۔ روزمرہ سادگی بیان اور محاورہ بندی میں ذوق ان سے بہت آگے ہیں۔

(۱) یورپ میں رابرٹ براؤننگ غالب کا ہمعصر تھا۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ رُوح کا تجزیہ کرتا تھا۔ غالب کا کلام اِس قدر تجزیہ نہیں کرتا۔ لیکن رموز رُوحانی کے عمق کو خُوب دریافت کرتا ہے ان کا کلام سراپا تصوّف نہیں۔ مگر اس میں جا بجا تصوّف کی جھلک ضرور ہے۔

(۲) جرمن کے شاعر ”ہین“ سے مرزا غالب کا مقابلہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

(۳) جرمن کا مشہور فلسفی شاعر گوئٹے غالب کا مدِمقابل ہے۔

غالب کے شاگرد یُوں تو غالب کے شاگرد بکثرت تھے۔ لیکن نواب ضیاء الدین نیّر درخشاں۔ میر مہدی مجروح۔ مرزا قربان علی بیگ سالک۔ حالی۔ منشی ہرگوپال تفتہ۔ نواب علاء الدین خاں علوی وغیرہ ان کے شاگردوں میں بہت مشہور ہیں۔

مجروح
متوفی ۱۹۰۲ء

میر مہدی نام۔ میر حسین کے بیٹے۔ مجروح تخلص۔ غالب کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ غدر میں پانی پت چلے گئے تھے۔ جب غدر کا طوفان دُور ہوا تو پھر دہلی آ گئے اور شعر و شاعری میں مشغول رہے۔ تلاش روزگار میں الور گئے۔ وہاں کے راجہ شیو دھان سنگھ نے ان کی بہت قدر و منزلت کی۔ آخر عمر میں نواب رامپور کے دربار سے وابستہ ہوئے اور آرام کی زندگی بسر کرنے لگے۔

خصوصیات کلام زبان نہایت صاف سادہ اور شیریں ہے۔ چھوٹی بحروں میں خُوب شعر نکالتے ہیں۔ خیالات اور مضامین میں جدّت نہیں۔ مگر کلام عیوب سے پاک ہے۔ انہوں نے اُردو کی روایات قدیمہ کو خُوب نبھایا۔ مرزا غالب ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔

سالک
متوفی ۱۸۹۳ء

مرزا قربان علی بیگ سالک، نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے۔ بعض حیدرآباد اور بعض دہلی کی پیدائش بتاتے ہیں۔ بہرحال نشو و نما دہلی میں پائی۔ پہلے قربان تخلص تھا۔ اور مومن سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے اور سالک تخلص کیا۔ غدر میں الور جا کر وکالت شروع کر دی۔ وہاں سے حیدرآباد گئے اور محکمۂ تعلیم کے سررشتہ دار ہو گئے۔ کچھ مدّت مخزن الفوائد

(رسالہ اُردو) حیدر آباد کے ایڈیٹر بھی رہے ۱۸۹۳ئہ میں حیدر آباد میں انتقال کیا۔
غالبؔ کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔ کلام جدّت سے خالی ہے۔ مگر خیالات عمدہ اور زبان اچھی ہے۔ ان کا شہر آشوب دہلی اور مرثیہ غالبؔ بہت دردانگیز ہے۔

زکی متوفی ۱۹۰۳ئہ	نواب سید محمد زکریا خاں رضوی ۱۸۳۹ئہ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ نہایت عالی خاندان تھے۔ ان کے والد اور نانا دونوں مشہور شاعر گزرے ہیں۔ زکی کو عربی فارسی پر خوب عبور تھا۔

حدیث۔ فقہ۔ تصوّف اور نجوم میں بھی کامل دستگاہ تھی۔ موسیقی اور خوشنویسی بھی جانتے تھے۔ صہبائی اور پنڈت رام کشور بسمل کے علوم درسیہ میں شاگرد تھے۔ مرزا غالبؔ سے کچھ قرابت داری تھی۔ اپنا کلام بھی انہی کو دکھاتے تھے اور وہ نہایت محبت سے پیش آتے تھے۔

زکی کو شعر و شاعری کا بہت شوق تھا۔ وہ طرز غالبؔ کی پیروی کرتے تھے۔ خیال آفرینی اور جدّت تخئیل ان کے کلام کا اصلی جوہر ہیں لیکن درد و اثر بہت کم ہے۔ سلسلۂ معاش میں وہ میرٹھ، گورکھپور اور الٰہ آباد میں بھی رہے۔ آخر ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے سے بدایوں میں پنشن پائی اور ۱۹۰۳ئہ میں وہیں انتقال کیا۔ زکی طرز قدیم کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ اور پنڈت جوہر ناتھ کول ساقی بہت مشہور ہیں۔

رخشاں متوفی ۱۸۸۳ئہ	نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر اور رخشاں تخلّص کرتے تھے۔ نواب احمد بخش رئیس لوہارو کے چھوٹے بیٹے اور غالبؔ کے رشتہ دار تھے۔ غالبؔ ان کو اپنا خلیفہ کہا کرتے تھے۔

اپنے زمانے کے اہلِ علم اور اہلِ ثروت میں درجۂ امتیاز رکھتے تھے۔ شعر و سخن کو خوب پرکھتے تھے۔ تاریخ سے بہت دلچسپی تھی۔ الیٹ صاحب نے ہندوستان کی تاریخ لکھنے میں ان سے بہت مدد لی تھی۔

نیّر کے بڑے بیٹے ثاقبؔ غالبؔ کی بیوی کے بھتیجے تھے۔ وہ اُردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کا انتقال عین شباب میں ہوا۔

ان کے دُوسرے بیٹے طالبؔ اپنے بھائی ثاقبؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے بعد مجروحؔ۔ سالکؔ اور حالیؔ سے اصلاح لینے لگے۔ وہ کچھ مُدّت تک دہلی میں آنریری مجسٹریٹ رہے۔ پھر پنجاب میں ای۔ اے۔ سی ہو گئے۔ اپنے والد کے بعد اس عُہدہ سے بھی مستعفی ہو گئے۔

ثاقبؔ کے بیٹے شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ داغؔ کے شاگرد ہوئے۔ ان کے دو دیوان بھی ہیں۔

دہلی کے مشہور شاعر نواب سراج الدین خاں سائل جانشین داغ انہی تاباں کے صاحبزادے ہیں۔

آزردہ
۱۷۸۹ء تا ۱۸۶۸ء

مفتی صدر الدین خاں آزردہ۔ مولوی لطف اللہ کشمیری کے صاحبزادے تھے۔ آزردہ نے فیض تربیت شاہ عبد العزیز محدث اور فضل امام سے حاصل کیا تھا۔ عہدۂ صدر الصدور کے ممتاز عہدہ پر سرفراز تھے اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور۔ صدیق حسن خاں صاحب رئیس بھوپالی ان کے شاگرد تھے۔ سر سید بھی انہی کے شاگرد تھے۔ غالب۔ مومن۔ ذوق وغیرہ ان کے احباب میں سے تھے۔ غدر کے بعد ان کی نصف جاگیر ضبط ہو گئی تھی۔

آزردہ عربی فارسی اُردو میں خوب کہتے تھے۔ اردو میں پہلے شاہ نصیر پھر مجرم اکبر آبادی اور آخر میں میر ممنون سے اصلاح لی۔ اشعار نہایت سلیس اور پُر اثر ہیں۔ دیوان مرتب نہیں ہوا۔ ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا بھی لکھا تھا۔ لیکن دستیاب نہیں ہوا۔ ان کی شہرت بحیثیت عالم وفاضل کے بہت ہے۔

(۱۳)

دربار رامپور اور حیدرآباد

امیر اور داغ کا زمانہ

لکھنؤ اور دہلی کے درباروں میں مدت دراز سے شعرا کی سرپرستی اور قدردانی ہو رہی تھی، لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر نے ان دونوں سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا۔ واجد علی شاہ کلکتہ اور شہنشاہ دہلی رنگون بھیج دیئے گئے۔ دہلی اور لکھنؤ ویران ہو گئے اور شعرا ادہر ادہر بکھر گئے۔

مٹیا برج کلکتہ کے شعرا

واجد علی شاہ کے دامن دولت سے بہت سے شعرا وابستہ تھے۔ انہیں سے بعض ان کے ساتھ کلکتہ چلے گئے اور بعض غدر دور ہونے کے بعد ان سے جا ملے۔ جو شعرا مٹیا برج میں جمع تھے۔ بادشاہ نے ان کو بڑے بڑے دلفریب خطابات دے رکھے تھے۔ سچ یہ ہے کہ شعرا کی گرم صحبتوں نے مٹیا برج کو

لکھنؤ بنا دیا تھا۔ واجد علی شاہ اپنے ہمراہی شعرا کو سبعہ سیّارہ کہتے تھے۔ فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا برق۔ مہتاب الدولہ کوکب الملک ستارہ جنگ درخشاں صولت۔ بہار۔ عیش۔ ہنر وغیرہ کی شاعری سے بنگال میں شعر و شاعری کا بہت چرچا ہوا۔ چنانچہ داغ اور طباطبائی بھی کلکتہ گئے۔ وہاں کے مقامی شعرا میں مولوی عبد الغفور نساخ ڈپٹی کلکٹر راج شاہی بہت ممتاز شخصیت کے مالک تھے نہایت عمدہ شاعر اور سخن شناس تھے۔ ان کی بہت سی تصانیف بھی موجود ہیں۔

شعرائے دہلی جب مرہٹوں کی بغاوتوں اور افغانوں کے حملوں سے دہلی کی سلطنت کا دبدبہ کم ہوا۔ اور شعرا کی بیقدری ہونے لگی تو وہاں کے شعرا تلاش روزگار میں دہلی سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ فرخ آباد اور فیض آباد۔ عظیم آباد۔ مرشد آباد اور شہروں کی نسبت دہلی سے زیادہ قریب ہیں۔ اس لئے پہلے سب وہیں جاتے تھے۔ فرخ آباد میں رئیس کم تھے اس لئے فیض آباد کی طرف سب کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں جب فیض آباد سے دار الخلافہ لکھنؤ میں منتقل ہوا تو سب اِدھر رجوع ہو گئے۔

فرخ آباد فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رند بڑے بلند مرتبہ شاعر اور موسیقی دان تھے وہ سودا اور سوز کے شاگرد تھے۔ سودا نے ان کی مدح میں قصیدے بھی لکھے ہیں۔ جب ان کے خاندان کا اقتدار جاتا رہا تو فرخ آباد میں شعر و شاعری کا چرچا بھی کم ہو گیا۔

عظیم آباد مہاراجہ شتاب رائے اس زمانہ میں بنگال کے حاکم اعلیٰ تھے وہ شاعروں کے قدردان اور خود شاعر تھے۔ ان کے بیٹے راجہ تخلص میر ضیاء الدین ضیاء معاصر سودا کے شاگرد ان دنوں عظیم آباد میں تھے۔ اشرف علی خاں فغاں بھی مہاراجہ موصوف کے دربار سے وابستہ تھے۔ میر باقر حزیں شاگرد مظہر جانجاناں نواب سعادت جنگ رئیس عظیم سے متعلق تھے۔ گویا ان دنوں بہار میں شعرائے دہلی کی بہت قدر تھی۔

مرشد آباد نوابان مرشد آباد بھی شعرائے دہلی کے بہت قدردان تھے۔ میر قدرت اللہ قدرت مرشد آباد ہی میں فوت ہوئے۔ سوز بھی وہاں گئے۔ محمد شاہ کے زمانے کے مشہور مرثیہ گو مرزا ظہور علی خلیق۔ نواب نوازش محمد خاں شہاب جنگ کے بلائے مرشد آباد پہنچے۔

ٹانڈہ ٹانڈہ رامپور اور بریلی کے قریب واقع ہے۔ یہ نواب محمد یار خاں امیر کی قیام گاہ تھی۔ نواب صاحب والئے رامپور کے چھوٹے بھائی شاعر اور شاعر نواز تھے۔ انہوں نے سودا اور سوز کو بلوایا۔

مگر وہ نہیں آئے۔ وہ قائم چاند پوری کو جو سودا اور سوز کے شاگرد تھے سنو روپیہ ماہوار دیتے تھے، اور خود بھی انہی کے شاگرد تھے مصحفی۔ فدوی لاہوری۔ میر محمد نعیم پروانہ اور عشرت وغیرہ بھی ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔

حیدر آباد | شروع شروع میں شعرا اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ کیونکہ ایک تو حیدر آباد بہت دور تھا۔ دوسرے مرہٹوں اور پنڈاریوں کی لوٹ مار سے راستہ بہت خطرناک تھا پھر بھی بہت سے باہمت شعرا وہاں پہنچ گئے۔ شاہ نصیر کئی دفعہ حیدر آباد گئے۔

فیض آباد اور لکھنؤ | انتخاب فیض آباد کے وجوہ:۔

(۱) دہلی سے فیض آباد اور مقامات کی نسبت زیادہ قریب ہے۔

(۲) شعرا کی قدر اور جگہوں کی نسبت وہاں زیادہ ہوتی تھی۔

(۳) نواب شجاع الدولہ کی بیوی بہو بیگم صاحبہ محمد شاہ بادشاہ دہلی کی بہت لاڈلی لے پالک تھیں وہ اپنے وطن (دہلی) کے شعرا کی بڑی قدر کرتی تھیں۔

(۴) بہو بیگم کے صاحبزادے نواب آصف الدولہ بہادر سے دہلی کے رئیس اعظم خان خاناں کی بیٹی منسوب تھیں اس لئے دہلی کے آدمی کی فیض آباد میں بڑی قدر تھی۔ بلکہ مشہور تو یوں ہے کہ بہو بیگم صاحبہ کی سخاوت کا شہرہ سن کر آدھی دہلی فیض آباد پہنچ گئی تھی۔ جب نواب آصف الدولہ نے اپنا دار السلطنت لکھنؤ میں منتقل کیا تو یہ سب لوگ بھی لکھنؤ چلے گئے۔ سودا۔ میر۔ سوز۔ ضاحک۔ یکین۔ ضیاء۔ فغاں۔ قائم۔ مصحفی۔ انشا۔ جرات۔ رنگین اور قتیل وغیرہ سب اسی زمانہ میں لکھنؤ آئے تھے مرزا جواں بخت ولی عہد شاہ عالم بھی تھوڑے دنوں لکھنؤ آکر رہے۔ مرزا جواں بخت کے چھوٹے بھائی مرزا سلیمان شکوہ بھی بڑے احتشام سے لکھنؤ میں رہتے اور شعرا کی حد سے زیادہ ہمت افزائی کرتے تھے۔

شعرائے لکھنؤ کا منتشر ہونا | لکھنؤ میں اردو شاعری پر جدید ضرب یہ پڑی کہ واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ بھیجدیا گیا۔ ادھر دہلی سے بہادر شاہ کو قید کر کے رنگون روانہ کر دیا۔ لکھنؤ اور دہلی برباد ہو گئے، اور ایسا غدر پڑا کہ جان مال عزت آبرو کچھ محفوظ نہ رہا۔ شعرائے دہلی اور لکھنؤ اپنی آرامگاہیں چھوڑ چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے۔ اکثر رامپور چل دیئے۔ رامپور دہلی اور لکھنؤ سے قریب تھا۔ اور وہاں کے نواب شعرا کے قدردان بھی تھے۔ کچھ باہمت لوگ حیدر آباد بھی پہنچے۔ باقی قریب قریب کی ریاستوں میں

چلے گئے۔ ان شعرا کی قدردانی کے لئے الور۔ جے پور۔ بھرت پور۔ پٹیالہ۔ کپورتھلہ۔ ٹونک۔ بھوپال۔ منگرول۔ مالیر کوٹلہ اور بہاولپور کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

الور میں مہاراجہ شیودھان سنگھ حکمران تھے۔ ظہیر۔ تصویر۔ تشنہ۔ شاگردانِ ذوق اور مجروح، سالک غالب کے شاگرد اُن کے دربار میں بڑی عزت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

ٹونک نواب محمد علی خاں ۱۸۶۶ء میں معزول ہوئے اور ان کے بیٹے نواب محمد ابراہیم علی خاں مسند حکومت پر بیٹھے، ان کا تخلص خلیل تھا۔ پہلے بسمل خیرآبادی شاگرد امیر مینائی سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مضطر خیرآبادی کے شاگرد ہوئے۔ ان کے دربار میں بہت سے شاعر تھے۔ جن میں ظہیر اور نواب سلیمان خاں اسد بہت مشہور ہیں۔ یہ دونوں صاحب دیوان بھی ہیں۔ اسد میر مظفر علی کے شاگرد تھے۔ نواب صاحب نے انہیں بڑے شوق سے بلایا تھا۔ ان کے اکثر شاگرد اب تک وہاں موجود ہیں۔ نواب صاحب موصوف کے صاحبزادے خود بھی شاعر ہیں اور اپنے والد کی طرح شاعر نواز بھی۔

منگرول کاٹھیاوار میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست ہے مرکز اُردو سے اس قدر دُور ہونے کے باوجود والئے ریاست نواب حسین میاں بہادر کی عنایات سے اُردو شاعری کا وہاں خوب چرچا ہوا۔ اس وقت کے مشہور شعرا داغ۔ تسلیم۔ جلال اور شمشاد[1] اکثر نواب صاحب کے دربار میں آتے جاتے رہتے لیکن دُوری اور آب و ہوا کی ناسازگاری کے باعث وہاں زمین گیر نہ ہوئے۔ پھر بھی نواب صاحب ماہانہ تنخواہ ان کے گھر بھیج دیتے تھے۔

بھوپال ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ تمام ہندوستان کے تعلیمی معاملات میں بیحد دلچسپی لیتی تھیں مُسلم یونیورسٹی اور بہت سی درسگاہوں کے قیام کے لئے انہوں نے شاہانہ عطئے عطا کئے۔ مختلف علوم و فنون میں کافی دستگاہ رکھتی تھیں۔ بہت سی کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔ اکثر مُصنّفین کو جو اپنی تصانیف خود شائع نہیں کر سکتے تھے نہایت فراخدلی سے بڑی بڑی رقوم مرحمت فرماتی تھیں سیرۃ نبویؐ مصنفہ مولانا شبلی کے لئے جس کے باقی حصّے مولانا سلیمان ندوی نے لکھے ہیں ایک معقول رقم ماہانہ عطا فرماتی تھیں۔ انکی والدہ نواب شاہجہاں بیگم مرحومہ بھی بہت اچھی شاعرہ تھیں، اُردو میں پہلے شیریں اور بعد میں تاجور تخلص کرتی تھیں۔ فارسی میں شاہجہاں تخلص تھا سلطان

---

[1] جلال اور شمشاد ناسخ کے شاگرد لکھنؤ میں اُستاد مانے جاتے تھے ۱۲

جہاں بیگم صاحبہ نے نواب صدیق حسن خاں سے عقد ثانی کر لیا تھا۔ نواب صاحب عربی فارسی کے بڑے عالم اور اپنے زمانہ کے مشہور محدّث اور مفسّر تھے۔ مفتی آزردہ کے شاگرد تھے اور تقریباً دو سو کتابوں کے مُصنّف۔ شعرا اور علماء کے بہت قدردان تھے۔ اُردو میں توفیق اور فارسی میں نواب تخلص کرتے تھے۔ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کے والد ماجد نواب جہانگیر محمد خاں دولت تخلص خُوب شعر کہتے تھے۔ ان کا دیوان بھی چھپ چُکا ہے۔ ان کی علم نوازی کی بدولت مشہور شعرا اور علماء کا وہاں ہمیشہ اجتماع رہا۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے انتقال کے بعد ہز ہائینس نواب حمید اللہ خاں صاحب مسند آرائے حکومت ہوئے۔ وہ بھی نہایت علم دوست اور قدرشناس نواب ہیں۔

رامپور — نواب یُوسف علی خاں، نواب محمد سعید خاں کے بیٹے بڑے علم دوست اور شاعر نواز تھے۔ اُردو میں ناظم تخلص کرتے تھے۔ ابتدا میں مومن سے اصلاح لی۔ ان کے بعد غالب اور پھر مظفر علی اسیر کو کلام دکھانے لگے۔ دہلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد اکثر بڑے بڑے شعرا نے رامپور ہی میں پناہ لی مثلاً مرزا غالب۔ میر حسین تسکین۔ مظفر علی اسیر اور بہت سے باکمال علماء دربار رامپور سے فیضیاب ہوئے۔ مثلاً مولانا فضل حق خیر آبادی

نواب صاحب موصوف نے شعرائے دہلی و لکھنؤ کو یکجا کر کے ایک نئی طرز کی بُنیاد ڈالی جو نواب صاحب کے صاحبزادے نواب کلب علی خاں کے زمانہ میں پروان چڑھی۔

نواب کلب علی خاں ۱۲۵۰ھ تا ۱۳۰۴ھ / ۱۸۳۴ء تا ۱۸۸۶ء — نواب کلب علی خاں کے عہد میں اُردو شاعری نے بہت ترقی کی۔ نواب صاحب بڑے فیاض اور قدردان تھے ان کی قدردانیوں نے رامپور میں بڑے بڑے ارباب کمال کو کھینچ بُلایا۔ ایسی قدردانی کی نظیر ہندوستان کی کسی اور ریاست میں نہیں ملتی۔ عُلماء، حکما۔ فضلا۔ محدّث۔ مفسّر۔ مہندس۔ نثار۔ شعرا۔ خوشنویس غرض ہر قسم کی صنعت کے اہلِ کمال ان کے ہاں موجود تھے۔

شعرا میں اسیر۔ بحر۔ امیر۔ داغ۔ جلال۔ تسلیم۔ منیر۔ قلق۔ عروج۔ صبا۔ حیا۔ جان صاحب۔ آغا حجو شرف۔ انس شاگرد ناسخ۔ شاغل۔ شاداں۔ غنی۔ ضیاء۔ خواجہ محمد بشیر۔ رضا۔ وغیرہ کے علاوہ سینکڑوں مشاہیر اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے۔

مولانا ارشاد حسین۔ مولوی عبد الحق اور منشی امیر مینائی کے علاوہ کسی کی ننانوے سے زاید

تنخواہ نہ تھی یہ لوگ محض شاعر ہی نہ تھے۔ اپنی قابلیت کے مطابق کسی نہ کسی عہدے پر بھی مامور تھے۔ اکثر موقعوں پر نواب صاحب ان کو انعام و اکرام سے سرفراز کرتے اور کبھی کسی کو بددل نہ ہونے دیتے۔

نواب کلب علی خاں نے درسیات مولانا فضل حق خیرآبادی سے پڑھیں اور اکثر کتابیں خود تصنیف کیں۔ فارسی میں ان کا دیوان تاج فرخی کے نام سے مشہور ہے۔ اُردو کا کلام امیر مینائی کو دکھاتے تھے۔ چار دیوان ان سے یادگار ہیں۔ نواب تخلص کرتے تھے۔ تحقیق لفظی کا بہت شوق تھا۔ ان کا بیشتر کلام متروکات اور غیر فصیح الفاظ اور تراکیب سے پاک ہے۔

نئی طرز ناسخ کی طرز کے علمبردار بحر، منیر، قلق اور اسیر تھے لیکن ان کے کلام میں طرز ناسخ کی خوبیوں کی بجائے اس کے تمام عیوب پائے جاتے تھے۔ طرز دہلی کے پیرو داغ اور تسلیم تھے۔ داغ ذوق کے شاگرد تھے۔ انہوں نے نہایت دلکش طرز اختیار کی تھی۔ جس میں جرأت کے رندانہ رنگ کی آمیزش تھی۔ اس وقت طرز داغ بہت مقبول تھی۔ تسلیم اگرچہ لکھنوی تھے لیکن وہ بھی نسیم اور مومن کی پیروی میں طرز دہلی کے پیرو تھے۔

لکھنؤ اور دہلی کے یہ دونوں سکول آپس میں ہمیشہ مباحثے کرتے رہتے تھے۔ ان مباحثوں کی بدولت ایک نئی طرز کی بُنیاد پڑی۔ جس میں مندرجہ ذیل خصوصیات تھیں :۔

(۱) طرز ناسخ کی بیجا لفظی اور تصنّع نہ تھی۔

(۲) لفظی تحقیق کی بدولت ایسے الفاظ اور ترکیبیں جو قدما کی یادگار تھیں متروک قرار دی گئیں۔

(۳) شعرا صحیح جذبات اور مناسب الفاظ کا خیال رکھتے تھے۔

(۴) اہلِ لکھنؤ نے طرز لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر طرز دہلی کی سادگی اور صفائی اختیار کر لی اور یہ داغ کی شاعری کا اثر تھا۔

اگرچہ امیر داغ کے مدِمقابل اور طرز لکھنؤ کے مدعی تھے لیکن ان کا دوسرا دیوان داغ ہی کے رنگ میں ہے۔ ان کے دیوان "جوہر انتخاب" میر اور "گوہر انتخاب" درد کے رنگ میں ہیں۔ امیر کے شاگرد ریاض اور جلیل نے بھی داغ کا تتبع کیا۔ جلال پُورے لکھنوی تھے۔ مگر ان کا بھی ایک دیوان بالکل طرز دہلی میں ہے۔ امیر و جلال اپنے اصلی رنگ کو بھولے نہ تھے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ وہ طرز دہلی کو ترجیح دیتے تھے اس قدیم رنگ کا قطعی خاتمہ اس وقت ہوا جب "انجمن معیار" لکھنؤ میں قائم ہوئی۔

اس انجمن کے ماہواری رسالوں کی تحقیقات نے طرز قدیم کو لوگوں کے دلوں سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔

فرمانروائے رامپور نواب سید حامد علی خاں صاحب نہایت روشن خیال اور علم دوست فرمانروا تھے اپنے اسلاف کی طرح علماء فضلا اور شعرا کی سرپرستی کرتے تھے۔ ان کی فیاضی سے تمام قومی درسگاہیں اور مفید تحریکیں فیضیاب ہوتی رہتی تھیں۔ ان کے جانشین بھی مردم شناس اور علم دوست ہیں۔

امیر مینائی
۱۲۴۴ھ تا ۱۳۱۸ھ
۱۸۲۸ء تا ۱۹۰۰ء

منشی امیر احمد مینائی امیر تخلص خلف مولوی کرم محمد۔ نصیر الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ حضرت مخدوم شاہ مینا کے خاندان سے تھے۔ جن کا مزار لکھنؤ میں سرچشمۂ فیض عام ہے۔ درسی کتابیں مفتی سعد اللہ اور علمائے فرنگی محل سے پڑھی تھیں۔ بڑے منکسر المزاج۔ عابد۔ زاہد اور صوفی مشرب بزرگ تھے۔ خاندان صابریہ چشتیہ کے جانشین حضرت امیر شاہ سے بیعت تھے۔ طب جفر اور نجوم وغیرہ سے واقف۔ نہایت ذکی طباع۔ محنتی۔ جفاکش اور وضع دار تھے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد تھے۔ بہت جلد قابلیت میں اُستاد سے آگے نکل گئے۔ اس وقت لکھنؤ کی فضا شعر و شاعری سے معمور تھی۔ ایکطرف شاگردان آتش و ناسخ کے مناظرے شروع تھے۔ جن میں صبا خلیل۔ رند اور سحر وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ دوسری جانب انیس و دبیر کے معرکے گرم تھے۔ ان تمام چیزوں نے امیر کی شاعری کو بہت جلد ترقی کے منازل طے کرا دیئے۔ ۱۸۵۲ء میں واجد علی شاہ نے اپنے دربار میں بُلا کر ان کا کلام سُنا اور ان کو ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان تصنیف کرنے کا حکم دیا۔ جس کے صلے میں انہوں نے خلعت اور انعام بھی پایا۔ اسی وقت سے امیر مینائی کی شہرت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

غدر کے بعد یہ تعلق منقطع ہو گیا۔ امیر نے سرکاری مُلازمت کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن عہدۂ صدر اعلیٰ کے لئے جج کو درخواست دینی پڑتی تھی۔ ان کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی اس لئے مُلازمت کے خیال کو ترک کر دیا۔ تھوڑے دنوں کی بیکاری کے بعد نواب یوسف علی خاں والئے رامپور نے ان کو طلب کیا۔ نواب یُوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں کی حکومت ہوئی۔ ان کی فیاضیوں نے ہندوستان کے تمام شعرا کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہی زمانہ امیر کی شاعری اور اقبال کا تھا۔ وہ نواب صاحب کے اُستاد تھے۔ ادبی حلقوں میں ان کی شخصیت بڑی بلند سمجھی جاتی تھی۔ تنخواہ بھی معقول ملتی تھی۔ مزے سے آزادانہ زندگی بسر کرتے اور شعر و شاعری میں مشغول رہتے تھے۔ یہاں ۴۳ برس بڑی عزت آبرو سے بسر کئے۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں نظام حیدرآباد کلکتہ سے واپسی پر بنارس میں ٹھہرے وہاں امیر نے ایک قصیدہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا جو نواب صاحب کو بہت پسند آیا۔ نواب صاحب نے حیدرآباد کی دعوت دی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۰ء میں امیر حیدرآباد گئے۔ وہاں کچھ دنوں بعد بیمار رہ کر ۷۳ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ علالت کے زمانہ میں داغ۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور مہاراجہ سرکشن پرشاد اکثر عیادت کو آتے جاتے تھے۔ قمر۔ آرزو۔ ضمیر۔ اختر چار بیٹے چھوڑے۔

تصانیف امیر بہت پر گو شاعر تھے۔ انہوں نے بعض کتابیں نثر میں بھی لکھی ہیں۔ ایک دیوان غدر میں تلف ہو گیا۔ پھر سنہ ۱۸۹۵ء میں آتش زدگی سے اکثر تصانیف جل کر خاک ہو گئیں۔ ان کے دو دیوان "مرآۃ الغیب" اور "صنم خانہ" عاشقانہ رنگ میں ہیں۔ "محامد خاتم النبیین" نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے "امیر اللغات" ان کی مشہور اور قابل قدر تصنیف ہے افسوس کہ نامکمل رہ گئی۔ اس کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں۔ لغات کی تصنیف نواب کلب علی خاں کے عہد میں شروع ہوئی تھی۔ ممالک متحدہ کے گورنر اس کے سرپرست تھے۔ امیر کی تصانیف کی تعداد تاریخ ادب اردو میں ۲۲ لکھی ہے۔

شاگرد ناظم۔ نواب۔ صفدر۔ جاہ۔ محسن کاکوروی۔ ثاقب۔ سرشار وغیرہ سینکڑوں شاگرد تھے۔ شاگردوں میں ریاض۔ جلیل۔ مضطر اور حفیظ بہت مشہور ہیں۔

امیر کی شاعری پہلے دیوان "مرآۃ الغیب" میں ابتدائی کلام ہے۔ اس لئے بے مزہ اور پھیکا ہے اس میں ناسخ کی طرز کے مخصوص نقص یعنی جا و بیجا لفظی رعایت۔ بدنما اور رکیک تشبیہیں۔ عورتوں کی آرائش کے سامان کا کثرت سے ذکر ہے مضمون وہی فرسودہ ہیں مگر عبارت خوب رنگین ہے۔

دوسرا دیوان داغ کی طرز میں ہے اس میں اعلیٰ تخیل۔ سلاست روانی اور دلکش عاشقانہ رنگ ہے منشی صاحب کے نعتیہ اشعار اگرچہ طرز قدیم میں ہیں۔ مگر فصاحت و بلاغت۔ بلندیٔ تخیل اور جوشِ اعتقاد کے بہترین نمونے ہیں ان کو ہر قسم کے اصناف پر عبور ہے۔ حشو و زوائد اور صنائع بدائع کی کثرت سے ان کا کلام پاک ہے۔ اشعار میں شگفتگی۔ نزاکت خیال۔ بلند پردازی شیرینی۔ زور اور قادر کلامی بدرجہ احسن موجود ہے۔ کہیں کہیں تصوف کی چاشنی بھی ہے۔

اخلاق و عادات منشی صاحب نہایت متین سنجیدہ۔ راستباز۔ ہمدرد متقی۔ پرہیزگار۔ سادہ مزاج اور محبت والے صوفی مشرب بزرگ تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کہی۔ ان کے تقدس علم و فضل اور

کمالات شاعری کی بیحد شہرت تھی۔ نہایت منکسر مزاج تھے۔ اور اپنے ہمعصروں سے نہایت خلوص سے پیش آتے تھے۔ داغ سے کبھی مسابقت کی کوشش نہیں کی۔ ادبی مسائل کا نہایت آزادی اور بغیر پاسداری کے جواب دیتے تھے۔ منشی صاحب نے زبان کی بے مثال خدمات انجام دیں۔ ان کا مرتبہ اس دور کے شعرا میں بہت بلند ہے۔

نمونہ کلام | ان کے اس شعر کو جسٹس محمود نے اپنے ایک فیصلہ میں لکھا تھا ؎

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اُلفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذّت ہے اگر دل میں مزا ہو

آئے جو مری لاش پہ وہ طنز سے بولے
اب ہم ہیں خفا تم سے کہ تم ہم سے خفا ہو

خود ترے ہونٹ یہ کہتے ہیں کہ بوسہ لیلو
اور معشوقوں کی ہوتی ہے نزاکت کیسی

تجھ کو مانگوں میں تجھی سے کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

داغ دہلوی
۱۸۳۱ء تا ۱۹۰۵ء

نواب مرزا خاں نام، دہلی میں پیدا ہوئے، ان کے والد نواب شمس الدین خاں نواب ضیاء الدین خاں والئے لوہارو کے بھائی تھے، مرزا خاں چھ سات برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی والدہ نے مرزا محمد سلطان عرف مرزا فخرو خلف بہادر شاہ سے نکاح کیا اور شوکت محل کا خطاب پایا۔ ماں کے ساتھ یہ بھی لال قلعہ میں پہنچے وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ان دنوں قلعہ میں شعر و شاعری کا بہت چرچا تھا۔ اس ماحول سے انکی طبیعت بہت متاثر ہوئی انہوں نے بھی شاعری شروع کر دی اور داغ تخلص اختیار کیا۔ ذوق بہادر شاہ اور مرزا فخرو کے اُستاد تھے یہ بھی ان کے شاگرد ہو گئے۔ فارسی کی تعلیم مولوی غیاث الدین مُصنّف غیاث اللغات سے پائی۔ خوشنویسی شہسواری وغیرہ باقاعدہ سیکھی تھی۔

شعر کا شوق فطری تھا۔ اِس لئے تھوڑے سے دنوں میں پُختہ کار شاعر ہو گئے۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو نے انتقال کیا۔ ابھی یہ ملال کم نہ ہونے پایا تھا کہ غدر پڑ گیا اور داغ دہلی چھوڑ کر نکل گئے۔ جب ہنگامۂ غدر فرو ہوا تو رامپور پُہنچے۔ اس وقت نواب یُوسف علی خاں کا دور تھا انہوں نے داغ کو داروغۂ اصطبل اور نواب کلب علی خاں ولیعہد بہادر کا مصاحب مقرر کیا۔ اس فرض کو انہوں نے نہایت قابلیت سے انجام دیا۔ داغ نے اپنی عُمر کے ۲۴ سال نواب کلب علی خاں کی

ملازمت میں نہایت عزت آبرو اور عیش و آرام سے گذارے۔ وہ رامپور کو "آرام پور" کہا کرتے تھے۔ نواب صاحب کے ساتھ حج و زیارات کو بھی گئے۔ انہوں نے دہلی۔ لکھنؤ۔ پٹنہ اور کلکتہ کے متعدد سفر کئے اور ان شہروں میں بڑی عزت پائی۔

۱۸۸۶ء میں نواب کلب علی خاں کا انتقال ہو گیا اور داغ کو رامپور چھوڑ کر دہلی آنا پڑا۔ دہلی میں کچھ دنوں قیام کے بعد مختلف مقامات کی سیر کرتے ہوئے ۱۸۸۸ء میں حیدر آباد پہنچے۔ راستے میں جہاں کہیں ٹھہرتے تھے سینکڑوں شاعر شاگرد ہوتے تھے۔ لیکن اس وقت حیدر آباد میں کوئی صورت نہ بنی اور داغ کو بے نیل و مرام دہلی واپس آنا پڑا۔ تھوڑے عرصے بعد سر عثمان جاہ کی طلبی پر پھر حیدر آباد گئے اور اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کے اُستاد مقرر ہوئے۔ بیش قرار تنخواہ اور انعام و اکرام کے علاوہ "مقرب السلطان بُلبل ہندوستان جہان اُستاد ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ۔ فصیح الملک" کے معزز خطابات عنایت ہوئے۔

تھوڑے دنوں بعد ساڑھے چار سو سے ایک ہزار اور پھر پندرہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی بیش بہا صلے اور انعامات اس کے علاوہ ملا کرتے تھے۔ اس غیر معمولی اور عدیم النظیر عزت افزائی سے اکثر لوگ حسد کرنے لگے۔ داغ اٹھارہ سال حیدر آباد میں اسی شان و شوکت سے رہے۔ حضور نظام سے لیکر ہر فرد بشر ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتا تھا۔

شاہ نصیر کی وفات کے بعد حیدر آباد میں شاعری کا بازار سرد پڑ گیا تھا۔ اب داغ کے دم قدم کی برکت سے پھر گرم ہو گیا مشاعرے کثرت سے ہونے لگے۔ سینکڑوں شعراء ان کے شاگرد ہوئے۔ داغ کے عروج کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ ریاست کی سیاسیات سے ہمیشہ علیحدہ رہے اور کسی پارٹی میں شامل نہ ہوئے۔ اسی لئے وہ ہر ایک کو دل سے عزیز تھے۔ امیر مینائی بھی جب حیدر آباد گئے تو داغ ہی کے پاس ٹھہرے۔ مگر شومیٔ قسمت سے نظام کی مُلاقات سے پہلے ہی انتقال فرما گئے۔

۱۹۰۵ء میں داغ نے فالج میں مبتلا ہو کر وفات پائی اور حیدر آباد ہی میں دفن ہوئے۔

عادات و اخلاق داغ نہایت خوش طبع۔ رنگین مزاج اور بذلہ سنج انسان تھے۔ مزاج میں خودداری تھی، اور خوشامد درآمد کو ناپسند کرتے تھے، کثیر الاحباب تھے اور ہر دوست سے محبت سے ملتے تھے۔ اپنے

معاصر شعراء سے بھی نہایت شگفتہ تعلقات تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کہی۔ ہاں معاصرین سے شاعرانہ نوک جھوک رہتی تھی۔ حضور نظام بھی ہمیشہ ان سے خوش رہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ سیاسیات میں کبھی دخل نہ دیتے تھے۔

داغ کی شاعری داغ کی زبان میں سادگی۔ بیان میں شوخی اور بانکپن ہے اسی وجہ سے وہ اپنے معاصرین امیر جلال اور تسلیم سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کی طرز خاص و عام کو مرغوب تھی۔ ان کے شاگرد پندرہ سو سے زیادہ تھے۔ شاگردوں کے کلام کی اصلاح کے لئے ایک باقاعدہ دفتر کھول رکھا تھا۔ جس میں تنخواہ دار منشی اور بعض شاگرد کام کرتے تھے۔

تصانیف داغ کے چار دیوان ہیں۔ ایک مثنوی فریاد داغ کے نام سے لکھی تھی۔ گلزار داغ اور آفتاب داغ میں زیادہ تر غزلیں ہیں جو رامپور کے مشاعروں میں امیر مینائی تسلیم اور جلال وغیرہ کے مقابلہ میں لکھی گئی ہیں۔ اس زمانہ کا کلام بڑی جانفشانی اور بے انتہا مشاقی ظاہر کرتا ہے۔ مہتاب داغ اور یادگار داغ دکن کی تصنیف ہیں۔ اس وقت کے کلام میں بھی روانی اور فصاحت خوب ہے۔ آفتاب داغ اور گلزار داغ میں جوانی کا کلام ہے۔ اس میں عشقیہ جذبات اور واردات قلبی کی بالکل اصلی تصویریں کھینچی ہیں۔ مہتاب داغ اُس وقت کی تصنیف ہے۔ جب شباب رُخصت ہو کر مزاج میں سنجیدگی اور سکون پیدا ہو گیا تھا۔ مثنوی فریاد داغ میں اپنے عشق کی داستان نہایت عمدہ شاعرانہ پیرایہ میں بیان کی ہے۔ بعض اشعار تہذیب سے گرے ہوئے ہیں۔

داغ قصائد میں ذوق اور سودا سے بہت پیچھے ہیں بلکہ امیر مینائی سے بھی کم ہیں۔ اعلیٰ تخئیل اور بلند مضامین کی کمی اور تغزل کا رنگ غالب ہے۔ جو قصیدے کی شان کے خلاف ہے۔ رُباعیاں بھی عموماً عاشقانہ رنگ میں ہیں۔ البتہ تاریخیں بہت اچھی اور اُستادانہ ہیں۔

طرز کلام (۱) زبان۔ زبان نہایت صاف اور سادہ ہے۔ عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور تراکیب ڈھونڈھے سے نہیں ملتے۔ عبارت نہایت عام فہم ہوتی ہے۔ دُور از کار تشبیہوں۔ مبالغوں اور حشو و زوائد سے ان کا کلام قطعی طور پر پاک ہے۔

(۲) جذبات۔ داغ کے اشعار اصلی واقعات اور انسانی جذبات کا بالکل صحیح فوٹو گراف ہیں۔ اِس لئے وہ دلوں پر تیر و نشتر کا کام کرتے ہیں۔

(۳) تصنّع۔ سارا کلام تصنّع سے پاک ہے۔ جو بات کہتے ہیں اس صفائی اور سادگی سے کہتے ہیں۔ کہ دلوں میں اُتر جاتی ہے۔ جرأت کی معاملہ بندی اور رند کی صفائی ملی جُلی ہے۔ خوبی محاورہ اور لطافت زبان اس پر طرۂ امتیاز۔ ان کو عاشقانہ شاعری کا مسلم الثبوت اُستاد مانا جاتا ہے۔

اعتراضات بعض لوگ کہتے ہیں۔ داغ ارباب نشاط کے شاعر تھے۔ ان کے اکثر و بیشتر اشعار مخرب الاخلاق ہیں۔ لیکن انصاف شرط ہے۔ ان کے ہزاروں اشعار ایسے نکلیں گے جو اعلیٰ درجہ کے کہے جا سکتے ہیں۔

بیشک ان کے ہاں فلسفہ بالکل نہیں۔ ان کا معشوق ایک بازاری معشوق ہے۔ اور ان کے عشق کا روحانیت اور حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اکثر اشعار عشق و عاشقی کے سطحی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ نہ ان میں میر کا سا درد ہے۔ نہ غالب و مومن جیسی معنی آفرینی اور نازک خیالی۔ تشبیہیں بھی نادر اور اعلیٰ نہیں۔ مگر با ایں ہمہ وہ ایک بلند مرتبہ شاعر ہیں۔ انہوں نے زبان کی ایسی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ کہ ہر شخص کو اس کی قدر کرنی چاہیئے۔

داغ نے عربی فارسی کے مشکل الفاظ کو ترک کر کے سادے اور شیریں الفاظ اور دلپسند محاورے اپنے کلام میں موزوں کئے۔ طویل اور مشکل بحروں میں نہایت برجستہ اور بے حشو و زوائد اشعار نکالے۔ یہی وجہ ہیں کہ شعرائے متاخرین میں داغ کا مرتبہ بلند ہے۔

شاگرد ان کے شاگرد پندرہ سو سے زائد ہیں۔ جن میں حضور نظام نواب محبوب علی خاں آصف۔ سر اقبال۔ سائل دہلوی۔ بیخود دہلوی۔ آغا شاعر دہلوی۔ احسن مارہروی۔ نوح ناروی۔ جگر مراد آبادی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

امیر اور داغ کا مقابلہ امیر اور داغ دونوں اپنے اپنے رنگ میں مسلم الثبوت اُستاد ہیں۔ دونوں اُستادوں نے ہم طرح غزلوں پر زور آزمائی کی۔ دونوں کے شاگرد بکثرت تھے۔ دونوں کا حلقہ احباب وسیع تھا۔ دونوں وسیع الاخلاق۔ حلیم الطبع۔ ذہین اور بلند مرتبہ شاعر تھے لیکن داغ دُنیاوی اقتدار میں امیر سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔

داغ کے کلام کو پڑھ کر عالم و عامی یکساں طور پر محظوظ ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو داغ کے سطحی جذبات پسند نہیں آتے۔ وہ امیر کے کلام کو پسند کرتے ہیں۔ امیر کے ہاں تہذیب و متانت کیساتھ

بلند خیالی بھی ہے۔ بات یہ ہے منشی صاحب ایک تقدس مآب بزرگ تھے۔ اور داغ نے قلعۂ دہلی کے رنگین ماحول میں پرورش پائی تھی۔ منشی صاحب کی اوائل عمر کا جس قدر کلام ہے وہ ناسخ کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن جب منشی صاحب نے دیکھا کہ لوگوں کو داغ کا رنگ مقبول ہے، تو انہوں نے بھی وہی رنگ اختیار کر لیا۔ اس سے ان کے کلام میں صفائی اور روانی پیدا ہو گئی۔ مگر پھر بھی داغ سے بہت کم رہے۔

داغ کا رنگ اگرچہ دہلی کا رنگ تھا۔ لیکن انہوں نے خود اس میں بہت سی جدتیں پیدا کیں۔ انہوں نے جرأت کی معاملہ بندی کو آتش کی صفائی زبان کے ساتھ سمو دیا۔ اور اسی سے اپنی خاص طرز پیدا کر لی۔ یہ طرز خاص و عام کو مرغوب تھی۔ اس طرز میں اگر کچھ کمی ہے تو یہی ہے کہ خیالات بہت سطحی ہیں۔

حقیقت امر یہ ہے کہ حقیقی شعریت دونوں اُستادوں کے ہاں کم ہے۔ شکوہ الفاظ۔ متانت اور نازک خیالی میں امیر کو داغ پر فوقیت حاصل ہے۔ قصیدہ گوئی میں بھی وہ داغ سے بہت آگے ہیں۔ عروض اور ضروریات شعری کو پوری طرح جانتے ہیں۔ شاعر کے علاوہ نثار بھی ہیں۔ سیکسینا صاحب نے ان کو سودا اور ذوق کا ہم پلہ لکھا ہے۔ لیکن قصیدے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے امیر ان دونوں بزرگوں سے بہت پیچھے ہیں۔

امیر اور داغ میں ایک فرق یہ بھی ہے۔ کہ امیر کی شاعری ہمیشہ ترقی کرتی رہی۔ لیکن داغ کا رنگ آخر عمر میں کچھ پھیکا پڑ گیا۔ یہ شاید اس لئے کہ وہ حیدر آباد پہنچ کر عیش و آرام کے عادی ہو گئے تھے۔ گویا قیام رامپور کا زمانہ داغ کی شاعری کے معراج کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔

داغ امیر کی طرح علم عروض کے اُستاد نہ سہی وہ ایک عدیم المثال غزل گو اور اپنی خاص طرز کے مُوجد تھے۔

انتخاب کلام

وعدے پہ مری ان کی قیامت کی ہے تکرار — اور بات ہے اتنی کہ اِدھر کل ہے اُدھر آج

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد — ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اُڑ گئی یوں وفا زمانے سے — کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

رُخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں — اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم　　بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

جلال لکھنوی
۱۲۵۰ھ تا ۱۳۲۵ھ
۱۸۳۴ء تا ۱۹۰۹ء

حکیم سید ضامن علی جلال حکیم سید اصغر علی داستان گو کے بیٹے لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور وہیں آصف الدولہ کے مدرسے میں فارسی عربی پڑھے۔ پھر حکمت کی تکمیل کی۔ لیکن شعر و شاعری کا ایسا شوق ہوا کہ اس کو اپنا مستقل فن قرار دیا۔ ابتدا میں امیر علی خاں ہلال سے اصلاح لیتے تھے۔ پختہ مشق ہونے کے بعد انہی کے توسط سے ان کے استاد رشک کے شاگرد ہوئے رشک ناسخ کے بہت ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ ناسخ اپنے شاگردوں کی غزلیں انہی کو اصلاح کے لئے دیا کرتے تھے۔ رشک نے عراق جاتے وقت جلال کو نواب فتح الدولہ برق کے سپرد کیا۔ برق کی شاعری ان دنوں بہت زوروں پر تھی۔ روزانہ مشاعرے ہوتے اور بحر۔ سحر۔ اسیر۔ امیر۔ قلق وغیرہ طبع آزمائیاں کرتے تھے۔ ان پر لطف صحبتوں کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے درہم برہم کر دیا۔ آخر گذر اوقات کے لئے جلال نے ایک دواخانہ کھول لیا۔ لیکن شوق شاعری کو پھر بھی پس پشت نہ ڈالا۔ رامپور میں ان دنوں نواب یوسف علی خاں حکمران تھے اور جلال کے والد انکے داستان گو کی خدمات انجام دیتے تھے نواب صاحب کی قدردانیوں نے جلال کو بھی رامپور کھینچ بلایا۔ تھوڑے دنوں بعد نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔ انہوں نے جلال کو سو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ جلال بہت تنک مزاج اور نازک دماغ تھے۔ کئی بار ملازمت سے کنارہ کش ہوئے۔ لیکن نواب صاحب کی قدردانیوں نے کبھی رامپور سے باہر نہ جانے دیا۔ تقریباً بیس سال رامپور میں رہے۔ داغ تسلیم اور امیر مینائی ان کے ہمعصر تھے۔ یہ لوگ برابر مشاعروں میں شریک ہوتے اور ہم طرح غزلیں لکھتے تھے۔ نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد کونسل آف ریجنسی قائم ہونیسے یہ صحبتیں منتشر ہو گئیں۔ منگرول (کاٹھیاوار) کے رئیس نواب حسین میاں صاحب بھی شعرا کے بہت قدردان تھے۔ انہوں نے جلال کو اپنے دامن دولت سے وابستہ کر لیا۔ آب و ہوا کی ناموافقت کے باعث وہ لکھنؤ واپس چلے آئے۔ لیکن نواب صاحب پچیس روپے ماہوار اور سو روپیہ ہر مہینے قصیدے کا صلہ گھر بیٹھے بھیجتے رہے۔ جلال آخر عمر تک شعر و شاعری کرتے رہے آخر ۷۶ سال کی عمر [۱۹۰۹ء] میں انتقال کیا۔

تصانیف (۱) چار دیوان (۲) سرمایۂ زبان اردو یعنی محاورات و اصطلاحات اردو (۳) افادۂ تاریخ

یعنی فن تاریخ گوئی پر ایک رسالہ (۴) منتخب القواعد یعنی ہندی الفاظ کی تحقیق (۵) تنقیح اللغات اور گلشن فیض یعنی اُردو کے دو لغات (۶) رسالہ دستور الفصحا یعنی فن عروض پر رسالہ (۷) مفید الشعرا یعنی تذکیر و تانیث کی تحقیق پر رسالہ۔

مندرجہ بالا تصانیف سے جلال کی خدمات زبان کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے۔ اگرچہ یہ کتابیں ابتدائی حیثیت رکھتی ہیں لیکن علم دوست ارباب نے ان سے بہت کافی فائدہ اُٹھایا ہے۔

مزاج جلال مغرور اور ہمچو ما دیگرے نیست کے خیال کے آدمی تھے۔ غرور ان کو مشاعروں میں شرکت کی اجازت نہ دیتا تھا۔ برابر کے شعراء سے ملنا عار سمجھتے تھے کسی کے اشعار کی تعریف نہیں کرتے تھے۔ بچپن سے حُجت و تکرار کی عادت تھی۔ اساتذۂ وقت کی غلطیاں ان کے مُنہ پر نکالتے تھے۔ اس لئے معاصرین سے مناظرے اور مباحثے ہمیشہ جاری رہتے تھے۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں سے محبت سے پیش آتے اور بڑی محنت سے اصلاح دیتے تھے۔ تسلیم کے شاگرد ظہیر احسن نیموی نے جلال کی بیشمار غلطیاں نکالیں، اور ان سب کو دو کتابوں کی صُورت میں چھپوا دیا۔

خصوصیات کلام جلال طرز لکھنؤ کے آخری چراغ تھے۔ وہ ہمیشہ اسی طرز پر قانع رہے۔ ان کے متعدد دیوانوں میں کوئی دلآویزی اور خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ ہاں زبان بے تکلف اور بے عیب ہے۔ پھڑکتے ہوئے اشعار بھی کہیں کہیں مل جاتے ہیں۔ عام طور پر کلام پھیکا ہے۔ جذبات کی تصویریں کہیں نہیں ملتیں۔ خیال آفرینی بہت کم ہے۔ بعض اشعار اُستادی کے درجہ سے گرے ہوئے ہیں۔ عورتوں کی آرائش کے سامان کا بیان طرز لکھنؤ کی امتیازی خصوصیت ہے۔ لیکن یہ بات ان کے ہاں نہیں۔ صُورت الفاظ اور محاورے کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں۔ تعقید اور نامناسب الفاظ سے ان کا کلام پاک ہے۔ بہت پُرگو شاعر ہیں۔ شاید اسی لئے کلام پھیکا ہے۔ مشہور ہے، روز پچیس غزلوں کی اصلاح اور تین چار غزلیں کہنا ان کا معمول تھا۔ صحت الفاظ اور صفائی محاورہ کا اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتے تھے۔ حق یہ ہے کہ وہ بہت اچھے ناقد تھے۔ دُوسرے درجے کے شعرا میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

شاگرد شاگردوں میں ان کے بیٹے کمال [جو رامپور میں ملازم تھے] میرزا ذاکر حسین یاس اور ان کے صاحبزادے آرزو۔ احسان شاہجہانپوری اور سردار اودھم سنگھ مشہور ہیں۔

آرزو لکھنوی | سید انور حسین صاحب آرزو سید ذاکر حسین یاسؔ کے بیٹے۔ باپ بیٹے دونوں جلال کے شاگرد تھے۔ پہلے امید تخلص کرتے تھے۔ لکھنؤ کے بہت نامور شاعروں میں سے ہیں، اور کمال کے بعد وہی جلال کے جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ فن عروض کے پورے ماہر اور تمام اصناف سخن میں شعر کہنے پر قادر تھے۔ مرثیے بھی کہتے تھے، اور ڈرامہ نویسی کا بھی شوق تھا۔ اگرچہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے لیکن طرز دِلّی والوں کی ہے۔ کلام میں سادگی۔ روانی۔ حلاوت اور جذبات وغیرہ موجود ہیں۔ ان کا کلام جلال کے رنگ کا اچھا نمونہ ہے۔

احسان | احسان علی خاں احسانؔ قاسم علی خاں کے صاحبزادے، اودھ ضلع بریلی میں پیدا ہوئے۔ شاہجہانپور میں رہنے کی وجہ سے شاہجہانپوری کہلاتے ہیں۔ سولہ ۱۶ برس کی عمر سے شعر کہتے تھے۔ ابتدا میں حافظ نثار احمد خاں تائبؔ کو اپنا کلام دکھایا۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں جلال کے شاگرد ہوئے۔ محکمہ بندوبست میں ملازم تھے۔ بعد میں قانونگوئی منصرمی اور پیشکاری بھی کی۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں ملازمت چھوڑ کر شاہجہانپور میں مختار عدالت ہو گئے۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے گلدستہ ارمغاں کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ جو کچھ مدت بعد بند ہو گیا۔ دیوان یعنی خمکدۂ خیال اور مختلف کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔ وہ ایک خوشگو شاعر ہیں۔ لیکن کوئی خصوصیت ان کے کلام میں نہیں۔ جلال کے مشہور شاگردوں میں سے ہیں۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں منگرول اور پھر حیدرآباد بھی گئے تھے۔

تسلیم
سنہ ۱۸۲۰ء تا ۱۹۱۱ء

منشی امیر اللہ تسلیم منگلسی نام گاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں فیض آباد کے نزدیک ہے ان کے والد مولوی عبد الصمد نے فیض آباد ہی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ لیکن محمد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ آ گئے۔ اور فوج میں تیس ۳۰ روپیہ ماہوار پر ملازم ہوئے۔ جب والد نوکری سے علیحدہ ہوئے تو تسلیم ان کی جگہ قائم ہو گئے۔ تسلیم نے عربی فارسی اپنے والد اور مولوی سلامت اللہ رامپوری سے پڑھی شاعری میں نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ اور طرز دہلی کا بڑے فخر سے تتبع کرتے تھے۔ خود کہتے ہیں ؎

میں ہوں اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی — مجھ کو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

جب سلطنت کا خاتمہ ہوا تو تسلیم رامپور چلے گئے۔ کچھ عرصہ تک وہاں ملازمت کا موقعہ نہ ملا۔ غدر کے بعد پھر لکھنؤ آ گئے۔ اور مطبع منشی نولکشور میں بیس ۲۰ روپیہ ماہوار پر مصححوں میں ملازم ہو گئے۔ خوشنویس بہت اعلیٰ درجے کے تھے۔ لکھنؤ میں نواب محمد تقی خاں ان سے اصلاح لیتے، اور دس روپے ماہوار دیتے تھے۔

۱۸۳۲ء میں نواب کلب علی خاں رامپور کے نواب ہوئے۔ انہوں نے تسلیم کو بُلا کر تیس روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی، جو بعد میں پچاس تک پہنچی۔ تسلیم عُہدۂ نظارت اور پیشکاری سے ترقی کرتے کرتے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوگئے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد ٹونک اور منگرول پہنچے لیکن کچھ مدّت نواب حامد علی خاں والیٔ رامپور نے ان کو پھر بُلا لیا اور چالیس روپے ماہوار پنشن مقرر کردی۔ جو مرتے دم تک ملتی رہی۔ تسلیم نے اکانوے برس کی عُمر میں انتقال کیا۔

تصانیف | پہلا دیوان غدر میں ضائع ہوگیا تھا۔ تین دیوان چھپ چکے ہیں۔ چوتھا نامکمل کسی شاگرد کے پاس ہے۔ انہوں نے آٹھ مثنویاں کہیں اور نواب صاحب رامپور کا سفرنامہ تقریباً پچیس ہزار اشعار میں لکھا۔

انداز کلام | کلام نہایت سلیس بے تکلف اور زوردار ہے۔ مثنوی کہنے میں اپنے ہمعصروں پر فائق ہیں۔ بعض قصیدے بھی بہت زوردار ہیں۔ غزلیں اکثر پُرمعنی اور پُرلطف ہیں۔ ان کا پہلا دیوان "نظم ارجمند" دوسرے دیوانوں سے بہتر ہے۔ پُرگوئی نے کلام کو پھیکا کردیا ہے۔

تسلیم کی شہرت کے تین وجوہ (۱) اُستادانہ غزلیں اور مثنویاں (۲) مومن کا کامیاب تتبع (۳) موجودہ دور کے قابل فخر شاعر حسرت موہانی کے اُستاد۔

عام حالات | تسلیم نے طویل عُمر پائی جو مصائب و آلام کے لئے شروع سے آخر تک وقف رہی۔ تنگدستی نے اکثر فقر و فاقہ تک نوبت پہنچائی۔ لیکن قابل شاگردوں اور قدردان دوستوں نے ہمیشہ مدد کی۔ لُطف یہ ہے کہ ان مُصیبتوں نے نہ تو ان کے مزاج پر کوئی بُرا اثر ڈالا۔ اور نہ رشک و حسد کے جذبات کو مشتعل کیا۔ نہایت ملنسار اور قانع تھے۔ ان کے ساتھ اُردو شاعری کے قدیم رنگ کا خاتمہ ہوگیا۔

شاگرد | شاگرد بکثرت ہیں۔ لیکن حسرت موہانی۔ عرش گیاوی۔ حاجی محمد اسمٰعیل خاں صبر معروف بہ بُلبلِ تسلیم بہت مشہور ہیں۔

نمونہ کلام |

آبرو گر چاہتا ہے کُنج خلوت کر قبول — قطرۂ نیساں صدف میں آکے گوہر ہوگیا

کچھ کہدو جھوٹ سچ کہ توقع بندھی رہے — توڑو نہ آسرا دل اُمیدوار کا

پیناستم چرخ سے اُف مُنہ سے نہ کرنا — یہ بات مرے دل میں ہے یا برگ حنا میں

کعبے کا ارادہ کئے نکلے ہیں تو گھر سے — آجائے وہ بُت سامنے اس دم تو مزہ ہو

عرش گیاوی — ضمیرالدین عرش، منشی بندہ علی وکیل گیا کے بیٹے۔ شروع میں اکثر اخبارات ورسائل سے تعلق تھا،
پھر ریلوے کی ملازمت کرلی۔ پہلے شمشاد شاگرد ناسخ کے شاگرد تھے۔ پھر تسلیم کو اپنا کلام دکھانے لگے۔
ان کی اکثر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔ پہلا دیوان داغ کے رنگ میں ہے جو طبع نہیں ہوا۔ دوسرا دیوان تسلیم
کے رنگ میں کہا اور انہی سے اصلاح لی۔ ایک تیسرا دیوان بھی ہے۔ دو رسالے فن عروض پر اور ایک
تاریخ دہلی و آگرہ "بارگاہ سلطانی" کے نام سے لکھی۔ کچھ مدت بہار پنچ کی ایڈیٹری بھی کی۔ غزلیں
نیچر کے رنگ میں خوب لکھتے ہیں اور اسی رنگ کی بدولت مشہور ہیں۔

دربارِ حیدرآباد

حیدرآباد دکن کے فرمانرواؤں اور رئیسوں کی سخاوت کا شہرہ سن کر ہر علم وفن کے اہل کمال وہاں
جمع ہوتے رہے۔ حق یہ ہے کہ ہند اور بیرون ہند کے ارباب کمال کی وہاں بڑی قدردانیاں ہوئیں،
اور خاص کر شاعری کو اس لئے عروج نصیب ہوا کہ وہاں کے اکثر فرمانروا خود بھی شاعر تھے۔

نظام الملک آصف جاہ اول
١٦٧١ء تا ١٧٤٨ء
یہ بانی خاندان ہیں۔ ان کا نام میر قمر الدین خاں تھا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔
دو دیوان ان کی یادگار ہیں۔ شاکر تخلص تھا، اور عبدالقادر بیدل کے شاگرد۔
کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ مشہور ہے کئی زبانوں میں نظم ونثر لکھنے پر قادر تھے۔ انکا کلام دستیاب نہیں ہوا۔

میر محبوب علی خاں
١٨٦٩ء تا ١٩١١ء
١٢٨٦ھ تا ١٣٣٠ھ
نواب محبوب علی خاں ١٨٦٦ء میں پیدا ہوئے۔ کچھ کم تین برس کی عمر میں مسند ریاست پر بیٹھے
ان کی تعلیم مختلف اُستادوں کے سپرد ہوئی۔ فارسی، عربی، انگریزی پر پورا عبور تھا۔ شہسواری
اور سپہ گری میں بھی طاق تھے۔ ان کی قدردانی علوم وفنون کی وجہ سے سینکڑوں اہل کمال حیدرآباد میں وارد ہوئے۔
نواب صاحب اہل علم کی بہت قدر کرتے، اور ان کی ہمت بڑھاتے تھے۔ مولوی سید احمد مؤلف
فرہنگ آصفیہ کا پچاس روپے ماہوار وظیفہ مقرر تھا۔ اس کے علاوہ زر کثیر فرہنگ کی طباعت اور
اشاعت کے لئے عنایت فرمایا۔ مولوی سید علی بلگرامی سے تمدن عرب اور تاریخ دکن وغیرہ لکھوائی۔
مولانا شبلی۔ حالی۔ مولوی عبدالحق مصنف تفسیر حقانی۔ قدر بلگرامی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ مولانا عبدالحلیم شرر۔
پروفیسر شہباز وغیرہ سینکڑوں ارباب علم نے ان کی سرپرستی کی بدولت اپنی زندگی آرام سے بسر کی۔
داغ ان کی سرکار سے پندرہ سو تنخواہ پاتے تھے۔ امیر مینائی رسائی ہونے سے پہلے انتقال کر گئے۔ مگر

ان کے صاحبزادے اختر مینائی اور ان کے شاگرد جلیل اب تک درباری شاعر ہیں۔ بلکہ جلیل تو حضور نظام کے استاد بھی ہیں۔

میر محبوب علی خاں آصف تخلص فرماتے اور اپنے استاد داغ کی طرز میں کہتے تھے۔ انکے ہاں حسن الفاظ کے ساتھ حسن معنی بھی جلوہ گر ہے۔ کلام نہایت فصیح با محاورہ اور پر لطف ہے۔

سر عثمان علی خاں موجودہ فرمانروائے دکن

عثمان تخلص شعر و شاعری میں اپنے والد کے پیرو ہیں۔ اہل سخن کے قدردان ہونیکے علاوہ بہت بڑے ناقد ہیں۔ آپ کے دربار میں نہایت بلند مرتبہ شاعر جمع رہتے ہیں۔ آپنے عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ قائم کرکے اردو زبان کی بے اندازہ خدمات انجام دی ہیں۔ حضرت جلیل کے شاگرد ہیں۔ ایک دیوان بھی چھپ چکا ہے۔ کلام میں صفائی۔ سادگی۔ بے تکلفی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور حشو و زوائد سے پاک ہے۔ کبھی کبھی عربی فارسی میں طبع آزمائی فرماتے ہیں۔

مہاراجہ چندو لال ۱۷۶۶ء تا ۱۸۴۵ء

مہاراجہ صاحب قوم کے کھتری تھے اور شاداں تخلص کرتے تھے۔ شعرا کے بہت بڑے سرپرست تھے۔ مدت تک ریاست کے وزیر اعظم رہے۔ انکی فیاضیوں اور قدردانیوں سے ایران اور ہندوستان کے اکثر اہل کمال شاعر ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ مشہور ہے اس زمانہ میں تین سو سے زائد شاعر دکن میں جمع تھے۔ جن کی سو سے لیکر ہزار تک تنخواہیں تھیں۔ ان کے محل میں ہر رات مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ شاہ نصیر نے بھی اس دربار سے بیش بہا انعامات لئے تھے۔ مہاراجہ موصوف نے ذوق اور ناسخ کو بھی دعوت دی تھی۔ لیکن حب وطن نے ان کا دامن نہ چھوڑا۔ مہاراجہ صاحب کے اردو، فارسی کے دیوان ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنے سوانح عمر بھی کتاب کی صورت میں لکھے ہیں۔

مہاراجہ گردھاری پرشاد ۱۸۴۰ء تا ۱۹۰۰ء

باقی تخلص کرتے تھے، اور محبوب نواز راجہ بنسی دھر کے نام سے مشہور تھے۔ قوم کے سیکسینا کائستھ تھے۔ فارسی، سنسکرت اور عربی کے عالم تھے شعر و شاعری اور شعرا کی سرپرستی کا بہت شوق تھا جب داغ حیدرآباد پہنچے تو انہوں نے ان کی بہت مدد اور قدر کی۔ اکثر کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔ بھگوت گیتا کو بھی فارسی میں نظم کیا تھا۔

کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ فلسفہ اور مذہب سے بہت دلچسپی تھی۔ رباعیات بہت دلچسپ اور موثر ہیں۔ جن سے ان کی علمی قابلیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ شمس الدین فیض ان کے مشہور شاگرد تھے۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد | ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ مہاراجہ چندولال کے خاندان کے درخشندہ ستارے، حیدرآباد کے وزیر اعظم۔ نہایت ممتاز شاعر اور زبردست عالم۔ شاد تخلص کرتے تھے سلسلہ نسب دہلی کے ایک نہایت قدیم اور معزز خاندان سے ملتا ہے۔ ان کے دادا مہاراجہ نریندر پرشاد نواب محبوب علی خاں کے ایام طفولیت میں کونسل آف ریجنسی کے رکن تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے عربی فارسی کی تعلیم بڑے قابل اُستادوں سے پائی۔ انگریزی، تلنگی، مرہٹی میں بھی خوب مہارت رکھتے تھے۔ شاعری میں حضور نظام نواب علی خاں کے شاگرد تھے۔ حضور نظام نے ان کو شاگرد خاص کا لقب دیا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں عہدۂ وزارت اور راجۂ راجگان مہاراجہ بہادر کا خاندانی خطاب عنایت ہوا۔ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۱۰ء میں کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ اور جی۔ سی۔ آئی۔ ای کے معزز خطابات سے سرفراز ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں عہدہ وزارت سے دست بردار ہو گئے۔ مگر تھوڑے عرصے بعد پھر یہی عہدہ آپ کے سپرد ہو گیا۔

دبدبۂ آصفیہ اور محبوب الکلام کے ایڈیٹر بھی رہے۔ کلام تصوف سے لبریز ہے۔ وہ خود ایک نہایت صاف دل صوفی تھے۔ تعصبات سے ان کا دل قطعی پاک تھا۔ دیوان اُردو اور فارسی شائع ہو چکے ہیں۔ ایک دیوان محض نعتیہ ہے جس سے ان کے حقیقی جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ مہاراجہ چندولال کی طرح خوب فیاض تھے۔ تقریباً ۷۰ تصانیف یادگار ہیں۔

طرز کلام | نہایت دلچسپ اور بے تکلف۔ فارسی عربی اشعار کا اُردو اشعار میں ترجمہ اور تضمین بہت خوب کرتے ہیں۔ اکثر تصوف کا رنگ غالب ہے اور کلام حُسن صوری و معنوی سے مزین۔

انجمن ترقی اُردو | یہ مشہور معروف انجمن حیدرآباد میں[1] قائم ہوئی۔ شروع سے مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے اس کے سیکرٹری ہیں۔ وہ نہایت تن دہی اور جانفشانی سے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔ حضور نظام کی سرپرستی کی بدولت یہ انجمن زبان اُردو کی نہایت شاندار خدمات انجام دے رہی ہے۔ ہر علم و فن کی قدیم و جدید کتابیں ترجمہ ہو کر اس انجمن کے اہتمام میں شائع ہو رہی ہیں۔ اُردو رسم الخط کی اصلاح اور ترقی کیلئے بھی قابل اور تجربہ کار حضرات کی سب کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ انجمن ایک نہایت موقر سہ ماہی رسالہ "اُردو" بھی نکالتی ہے۔ جس کے ایڈیٹر مولوی عبدالحق صاحب خود ہیں۔ اس میں نہایت کارآمد تحقیقی مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ انجمن نے ایک اور رسالہ سائنس بھی جاری کیا ہے۔ اس میں محض سائنس کے متعلق مفید مضامین چھپتے ہیں۔

[1] چند سال سے یہ انجمن ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں آ گئی ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی | عثمانیہ یونیورسٹی حضور نظام نے ۲۲ ستمبر ۱۹۱۸ء کو قائم کی۔ اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ ہر قسم کی تعلیم اُردو میں ہوتی ہے۔ انگریزی بطور ثانوی زبان کے لازمی مضمون ہے تاکہ طلبا انگریزی بولنے والی دُنیا سے بے خبر نہ رہیں۔ یہ یونیورسٹی ہندوستان میں اپنی وضع کی پہلی یونیورسٹی ہے اور برابر ترقی کر رہی ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے بھی اس کی حیثیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ گویا وہاں کی ڈگریوں کو وہی رُتبہ حاصل ہے۔ جو ہندوستان کی دُوسری منظور شدہ یونیورسٹی کی ڈگریوں کو۔

دارالترجمہ | عثمانیہ یونیورسٹی کے لئے درسی کتابیں تصنیف کرنے کے واسطے دارالترجمہ قائم ہے۔ یہ ادارہ یونیورسٹی کی نگرانی میں بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ بہت قلیل مُدت میں اس ادارہ نے وہ تمام کتابیں اُردو میں منتقل کر دی ہیں۔ جو ایف۔ اے اور بی۔ اے کی جماعتوں کیلئے درکار تھیں۔ اس میں نہایت لائق مترجم اور مصنف قابل تحسین کام کر رہے ہیں۔ ترجمہ کرنیوالونکی آسانی کے لئے اصطلاحات کی لُغت بھی بہت محنت سے تیار کرائی گئی ہے۔

دارالترجمہ یونیورسٹی کے کورس تیار کرنے کے علاوہ تاریخ۔ فلسفہ۔ اقتصادیات۔ ریاضی طبیعیات کیمیا۔ فن تعلیم طب اور انجنیری وغیرہ کی کتابیں بھی تیار کر رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ دارالترجمہ زبان اُردو کی توسیع اور اشاعت کے لئے بہت مفید ادارہ ہے۔

(۱۴)

جدید اُردو شاعری

آزاد اور حالی کا زمانہ

طرز جدید کے پیشرو | قدیم زمانہ کے مرثیہ نویسوں نے موجودہ طرز جدید کے لئے ایک شارع عام طیار کر دیا تھا۔ لیکن نیچر کی شاعری ان کے ہاں بطور فرع کے تھی۔ اس لئے وہ اپنی طرف لوگوں کو متوجہ نہیں کر سکی۔ دُوسرے ایک نئی چیز کچھ آسانی سے مقبول نہیں ہوتی۔ تیسرے بڑے بڑے وضعدار اور قدامت پرست بزرگوں کے سامنے ایک بدعت کا پھولنا پھلنا کچھ آسان نہ تھا۔

نظیر اکبرآبادی سب سے پہلے شاعر ہیں۔ جنہوں نے مناظر قدرت۔ واقعات اور جذبات کے سچے

فوٹو کھینچے - ایک مضمون کو اصلی رنگ میں ادا کرنے کے لئے انہوں نے کسی قدیم بندش اور قواعد کی پروانہ کی - لیکن قدامت پرستوں نے ایک جدید رنگ کو قدر کی نگاہوں سے نہ دیکھا - حقیقتاً اس پرانے رنگ کے بدلنے کے لئے کسی زبردست قوت کی ضرورت تھی - جو خداوند تعالیٰ نے آزاد اور حالی کی زبردست شخصیتوں کے لئے امانت رکھ چھوڑی تھی -

غدر کا اثر | غدر نے لکھنؤ اور دہلی کی سلطنتیں مٹا دیں - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعرا منتشر ہو گئے - جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں باقی رہیں اُن کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ شعرا کی سرپرستی کر سکتیں - اس انقلاب نے عوام کے مذاق تبدیل کر دیئے - لوگ نظم کی نسبت نثر کو پسند کرنے لگے - ریاستوں اور سلطنتوں کی تباہی نے عیش و عشرت کی انجمنیں سرد کر دیں - مادہ پرستی اور کاروبار کا زمانہ آگیا - لوگوں کی آنکھیں خواب غفلت سے کُھل گئیں - ان انقلابات سے شعرا کے مزاج میں بھی ایک گونہ تبدیلی پیدا ہو گئی -

انگریزی تعلیم کا اثر | انگریزی تعلیم نے اُردو نظم و نثر پر بہت گہرا اثر ڈالا - اس انقلاب کی ابتدا ترجموں سے ہوئی - انگریزی میں ڈرامہ نظم و نثر اور ہر قسم کے اصناف موجود ہیں - اس وقت کے لوگ زبان انگریزی سے بہت کم واقف تھے - لیکن ان کی دُوربین نگاہوں نے محض ان چند تراجم سے جو انگریزوں کے ایماء سے ہوئے تھے اس بات کا پتہ لگا لیا کہ ہماری زبان انگریزی زبان سے بہت کچھ حاصل کر سکتی ہے - چنانچہ ان کو اُردو کی خامیاں اور خرابیاں دُور کر کے جدتیں پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا - یہ اصلاح بہت آہستہ آہستہ عمل میں آئی - کیونکہ یہ کام ایک دن کا نہ تھا - آفرین ہے ہمارے رہنماؤں پر کہ انہوں نے اپنے قدیم شعرا کے احترام میں بھی فرق نہ آنے دیا - اس دعویٰ کی دلیل میں سکسینا صاحب نے "یادگار غالب" اور "دیوان ذوق مرتبہ آزاد" پیش کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ان کتابوں کے مصنف جدید رنگ کی تلقین کرنے کے باوجود قدامت پرست تھے کیونکہ انکا مقصد اصلی اُردو ادب کا دائرہ وسیع کرنا اور اس کی خرابیاں دُور کرنا تھا -

جدید رنگ کی خصوصیتیں | (۱) نیچر کے مضامین - تاریخی - اخلاقی - سیاسی - موسمی - رزمی بزمی وغیرہ وغیرہ -

(۲) ردیف قافیے کی پابندی سے غزلوں کا دائرہ جدید خیالات کے اظہار کیلئے تنگ تھا - اس لئے مثنوی اور مسدس کا استعمال زیادہ مرغوب ہوا -

(۳) تصنع اور تکلف والے مضامین اور مبالغہ آمیز باتوں کو ترک کر کے صفائی سادگی اور واقعیت کو

شعر کی جان قرار دیا گیا۔

(۴) رُباعی اور قطعات کو پسند کیا گیا کیونکہ ان میں ہر قسم کا مضمون ادا ہو سکتا ہے۔

(۵) غزلوں کے پُرانے عشق و عاشقی کے مضامین جن میں زُلف و کاکل کا ذکر ہوتا تھا، معیوب سمجھے جانے لگے۔ اور ان کی جگہ جذبات حقیقی اور واقعات اصلی کو دی گئی۔

اصناف سخن میں جدتیں

انگریزی بے قافیہ نظمیں دیکھ کر اُردو میں بھی بے قافیہ نظمیں لکھی گئیں۔ لیکن یہ طرز مقبول نہ ہوئی۔ ابتداءً مولوی علی حیدر طباطبائی، مولانا شرر، مولانا آزاد اور محسن کاکوروی نے اس قسم کی بے قافیہ نظمیں لکھیں، اور اب بھی بہت لوگ لکھتے ہیں لیکن یہ طرز اُردو سے کچھ میل نہیں کھاتی۔

مولوی عظمت اللہ نے ہندی دوہروں کی پیروی میں اُردو دوہرے لکھنے شروع کیے۔ ان میں الفاظ اور مضامین بھی ہندی ہوتے ہیں اور خوب لطف دیتے ہیں۔ مولانا حالی نے مسدس کو مسدس حالی لکھ کر اِس قدر مقبول بنایا کہ اب ہر قسم کی نظمیں اسی صورت میں لکھی جاتی ہیں۔ مسدس کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بحریں نہایت زوردار اور خوش آیند ہوتی ہیں۔ اور سلسلۂ بیان کو چار مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا اور زیادہ دلچسپ اور مترنم بنا دیتا ہے۔

جدید رنگ کے اثرات

انگریزی تعلیم نے نظم اُردو کی اس افسردگی کو دُور کر دیا جو فرسودگی اور قدامت سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اب نظم نے ایک نیا اسلوب اختیار کیا۔ نثر میں بھی جا بجا فن تنقید اور ڈراما شامل ہو گئے اُردو زبان کا دائرہ بے انتہا وسیع ہو گیا۔ قدامت کی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ اِس سے نقصان یہ پہنچا کہ مقررہ قواعد عروض کی پابندیاں بھی اُٹھ گئیں۔ لیکن مقابلتاً فوائد نقصانات سے کہیں زیادہ ہوئے۔

جدید ادب اُردو کے تین طبقے

پہلا طبقہ

پہلا طبقہ قدامت پسند لوگوں کا ہے۔ یہ طرز قدیم کو پسند کرتے اور طرز جدید سے متنفر ہیں۔ گویا قدما کے نقال ہیں۔ پُرانے مضامین۔ بحریں اور الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ شعر اس لئے کہتے ہیں کہ شاعری دلیل قابلیت ہے۔ ایسے لوگ سچے شاعر کہلانے کے مستحق ہیں نہ کوئی مفید خدمت زبان انجام دے سکتے ہیں۔ ہاں یہ کہنا درست ہے کہ ان کے وجود سے شاعری کا لنگر حرکت میں ضرور ہے۔

دُوسرا طبقہ

یہ طبقۂ اوّل کی ضد ہے۔ اِس کے پیرو اپنے مُلک کی ہر چیز کو نفرت کی نظر سے دیکھتے اور ہر مغربی چیز کے عاشق ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ مغربیت کہاں تک مشرقیت میں سما سکتی ہے۔

نقالی ان کا اصول ہے۔ ایسے لوگوں نے بے انتہا ترجمے کر ڈالے جو غلط اور غیر معتبر ہیں۔ ان میں سے اکثر ترجمہ در ترجمہ ہیں۔ اس لئے اصلیت بالکل باقی نہیں رہی۔ نیز ترجمے کرنے میں کسی اصول کو بھی مدِ نظر نہیں رکھا گیا۔ اس قباحت سے ایک نامکمل اور ناقص زبان پیدا ہو گئی جس کا انداز بیان بالکل غیر مستقل ہے۔

تیسرا طبقہ یہ طبقہ اُن اعتدال پسندوں کا ہے جو قدیم و جدید دونوں طرزوں کی خوبیوں کو ملانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ روایات قدیم کو وقعت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اپنے خیالات اپنے ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کے کلام میں صداقت اور واقعیت ہے۔

اِس طبقے کے مشہور شعراء میں حالی۔ آزاد۔ شرر۔ سرشار۔ سرور۔ اسمٰعیل میرٹھی۔ اکبر الہ آبادی سر اقبال اور حسرت موہانی وغیرہ کا نام سُنہری حرفوں میں لکھنے کے قابل ہے۔

حالی ۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پت کے رہنے والے۔ انصاریوں کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ننھیال سیادت تھی۔ پدری سلسلہ خواجہ ملک علی سے ملتا ہے جو ایک مشہور عالم اور بزرگ تھے۔ وہ غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور پانی پت کے قریب چند گاؤں ان کو جاگیر میں ملے۔ وہ پانی پت کے قاضی تھے اور اجناس بازاری کے نرخ کا تقرر اور عیدین کی نمازیں پڑھانا بادشاہ کی طرف سے ان کے سپرد تھا۔ حالی کے والد خواجہ ایزد بخش عسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک قسم کے جنون کی کیفیت ان پر ہر وقت طاری رہتی تھی۔ حالی نو برس کے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بڑے بھائی اور بہن نے تعلیم و تربیت دی۔ قرآن حفظ کرنے کے بعد سید جعفر علی [میر ممنون دہلوی کے بھانجے] سے فارسی اور مولوی ابراہیم حسین انصاری سے عربی پڑھی۔ ابھی سترہ برس کی عمر تھی اور درسیات ختم نہیں ہوئے تھے۔ کہ ان کی مرضی کے خلاف شادی کر دی گئی۔ تحصیل علم کے شوق میں ۱۸۵۴ء میں دہلی بھاگ آئے۔ اور مولوی نوازش علی سے ڈیڑھ سال تک عربی پڑھی۔ ۱۸۵۵ء میں اعزا کے اصرار سے پانی پت واپس چلے گئے۔ ۱۸۵۶ء میں حصار میں ملازم ہوئے۔ وہاں سے غدر کی وجہ سے واپس آ گئے اور چار پانچ برس پانی پت میں مطالعہ میں صرف کئے۔ پھر نواب مصطفٰے خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر نے اتالیق کے طور پر رکھ لیا۔ نواب صاحب ایک زبردست عالم تھے۔

اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ حالی نے بھی ان سے اصلاح لی۔ اس بات کا حالی نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ نواب صاحب کی مصاحبت اور مُلازمت سے ان کو بہت فائدہ پہنچا ۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

نواب صاحب کی پُرلطف صحبتوں نے حالی کے شوق شاعری کو پھر زندہ کر دیا۔ اور وہ اپنی غزلیں مرزا غالب کو بغرض اصلاح بھیجنے لگے۔ حالی نواب صاحب کے پاس بحثیت مصاحب اور ان کے لڑکوں کے آتالیق تقریباً آٹھ برس رہے۔ ان کے انتقال کے بعد گورنمنٹ ٹیکسٹ بک ڈپو لاہور میں انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت درست کرنے پر ملازم ہو گئے یہاں انہیں انگریزی انشاپردازی اور جدید خیالات سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی۔ اب اپنی زبان اور شاعری کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ لاہور میں چار برس رہے۔ پھر دہلی عربک سکول میں مُلازم ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ لاہور میں آٹھ مہینے چیفس کالج میں بھی پڑھا چکے تھے۔ مگر وہ مُلازمت ان کو پسند نہ تھی۔ دہلی میں سرسید سے مُلاقات ہوئی۔ ان کی فرمایش سے مسدس حالی لکھی ۱۸۷۹ء میں سرسید نے علی گڑھ میں سر آسمان جاہ سے ان کی مُلاقات کرائی جنہوں نے ازراہ قدردانی پچھتر روپیہ ماہوار نظام گورنمنٹ سے وظیفہ مقرر کرا دیا۔ جب حالی علیگڑھ ڈیپوٹیشن کے ساتھ حیدرآباد گئے تو یہی وظیفہ سو روپے ماہوار ہو گیا۔ اس کے بعد مُلازمت سے دستکش ہو کر پانی پت میں زندگی بسر کی اور تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کر لیا۔ ۱۹۰۴ء میں تعلیمی خدمات کے صلہ میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ آخر ستر برس کی عمر [۱۹۱۴ء] میں فوت ہوئے۔

حالی نہایت خلیق اور ملنسار بزرگ تھے۔ سچے قومی جذبات ان کے دل میں ہمیشہ موجزن رہتے تھے۔ دُنیاوی جاہ و جلال کا خیال مطلق نہ تھا۔ فرقہ دارانہ جذبات سے بھی ان کا دل پاک تھا۔ وہ ایک فطری انشاپرداز کی طرح سادہ اور بے ریا زندگی بسر کرتے تھے۔

حالی کی شاعری پر غالب اور شیفتہ کا اثر

شادی ہونے کے بعد حالی چھپ کر دہلی بھاگ آئے تھے۔ اس زمانہ میں اکثر مرزا غالب کے پاس آتے جاتے اور مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ وہ جو کچھ کہا کرتے صرف

۱؎ حالی لاہور ٹیکسٹ بک کمیٹی میں مُلازم تھے۔

غالب ہی کو دکھاتے تھے۔ غالب ان کا کلام دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ دہلی چھوڑنے کے بعد شیفتہ کے پاس تقریباً آٹھ برس رہے۔ گویا انہیں کی صحبت سے کلام میں پختگی پیدا ہوئی۔ وہ مرزا غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ اور انہیں کا رنگ ان پر غالب تھا۔ شیفتہ کا رنگ بھی ان کے کلام میں بہت کچھ پایا جاتا ہے۔ اکثر ادیبوں کا خیال ہے۔ کہ حالی کے کلام میں نواب صاحب کی صحبتوں کی بدولت جدت اور تنوع پیدا ہو گیا تھا۔

نواب صاحب کے انتقال کے بعد حالی لاہور آکر ملازم ہوئے۔ یہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا لیکن یہی زمانہ تھا جس نے حالی کی شاعری کا رخ نیچر کی شاعری کی طرف موڑ دیا۔ وہ انگریزی شاعری کے بڑے مداح تھے، اور اس کی سادگی صفائی اور بلند تخیل کو بہت پسند کرتے تھے۔

اسی زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی سرپرستی میں ایک ادبی انجمن قائم کی۔ اس انجمن کی طرف سے ہر مہینے مختلف مضمونوں کا اعلان کر دیا جاتا تھا۔ شعرا ان پر اشعار کہہ کر لاتے تھے۔ حالی اگرچہ اس انجمن کے بانیوں میں سے نہ تھے۔ لیکن اس کے جلسوں میں بہت شوق سے حصہ لیتے تھے۔ مثنوی برکھا رت۔ نشاط امید۔ مناظرۂ رحم و انصاف اور حب وطن وغیرہ اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

سرسید کا اثر سرسید اس زمانہ میں مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔ انہوں نے حالی سے کہا، مسلمانوں کے زوال کے متعلق کوئی نظم لکھو۔ مسدس حالی اسی درخواست کا نتیجہ ہے۔ یہ مسدس اس قدر مقبول ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ اس کے بعد حالی قومی شاعر کہلانے لگے۔ انہوں نے دہلی کی تباہی اور حکیم محمود خاں کا مرثیہ بھی لکھا۔ ان نظموں سے وہ ایک ایسے ریفارمر اور خطیب بن گئے، جو اپنی قوم کو قعر مذلت سے نکالنے کی کوشش میں تھا۔

تصانیف منظوم تصانیف (۱) مثنویاں (۲) مسدس حالی (۳) شکوہ ہند (۴) کلیات حالی مع مقدمہ شعر و شاعری (۵) مناجات بیوہ اور چپ کی داد (۶) مراثی غالب حکیم محمود خاں و تباہی دہلی (۷) مجموعہ نظم حالی (۸) مجموعہ نظم فارسی۔

نوٹ۔ نثر کی تصانیف نثر کے حصے میں دیکھئے۔

مثنویاں مناظرہ تعصب و انصاف۔ رحم و انصاف۔ برکھا رت۔ نشاط امید اور حب وطن بہت مقبول مثنویاں ہیں۔ ان کی عبارت صاف اور سلیس ہے نیز صنائع بدائع اور مبالغوں وغیرہ سے پاک ہیں۔ یہ اس زمانہ کی

تصانیف ہیں جب مولانا آزاد نے لاہور میں نئی طرز کا مشاعرہ قائم کیا تھا۔ گویا یہ اس نئے رنگ کی ابتدائی تصنیف ہیں جن میں حالی نے کمال حاصل کیا۔ پرانے شعرا کے نقطۂ نظر کے مطابق زبان و تخیل کے اعتبار سے وہ اعلیٰ درجہ کی نہ سہی، مگر نئے رنگ کی رہبر ضرور ہیں۔

مسدس حالی | مولانا حالی کی یہ ایسی تصنیف ہے۔ جس کو ابھی تک روزِ اول جیسی مقبولیت حاصل ہے۔ اسی سے ہندوستان میں قومی شاعری کی بُنیاد پڑی ہے۔ مسدس حالی نے اصناف نظم میں مسدس کو مقبول کرایا۔ بہت لوگوں نے اس کی نقل کی لیکن ویسا جوش اور زور کوئی پیدا نہیں کر سکا۔ اس لحاظ سے اس کو الہامی کتاب کہنا بیجا نہیں۔ سر سید کہتے تھے اِس کتاب نے صنف نظم میں ایک نیا دور پیدا کر دیا ہے۔ کئی زبانوں میں اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

مسدس حالی میں مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کے کارنامے اور موجودہ پستی کا ذکر ایسے انداز میں ہے کہ پتھر کا دل بھی موم ہو جاتا ہے۔ اس کے آخر میں یہ اپیل کی گئی ہے۔ کہ اُٹھو اور کھوئی ہوئی عظمت کو پھر حاصل کرو۔

شکوہ ہند | یہ بھی مسدس ہی کی طرز میں ہے یعنی اس میں بھی اِسلام کی کھوئی ہوئی عظمت اور موجودہ پستی کا ذکر ہے۔ نیز ہندوستان سے شکوہ کیا ہے کہ تُو نے مسلمانوں کو عیش پسند بنا کر ان کی قوّتِ عمل چھین لی۔

مراثی | مرزا غالب اور حکیم محمود خاں صاحب کے مراثی بہت زوردار اور دردانگیز ہیں۔ شاعر کی دِلی کیفیات کی سچّی تصویر ہیں، اور مبالغہ اور اغراق وغیرہ سے بالکل معرّا۔

مناجات بیوہ | یہ کتاب شکوہ ہند اور مسدس حالی سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس کی بحر ذرا مشکل ہے۔ بیوہ عورتوں کی حالت ایسے دردناک پیرائے میں بیان کی ہے۔ کہ دل پھٹتا ہے۔ اس کا ترجمہ بھی مسدس حالی کی طرح مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔

چُپ کی داد | یہ نظم مولانا نے حیدر آباد کے کسی جلسہ میں پڑھی تھی۔ زبان صاف اور سلیس ہے اور انداز بیان نہایت لطیف۔ اس میں عورتوں کی خُوبیوں اور منصبی فرائض کا ذکر ہے۔

دیوان حالی | دیوان میں قدیم و جدید دونوں رنگ کی نظمیں ہیں۔ جو مبالغہ اور اغراق سے معرّا ہیں۔ غزلیں دیگر اصناف سخن سے زیادہ ہیں۔ طرز جدید کی غزلیں الگ پہچانی جاتی ہیں۔ سب غزلیں جذبات حقیقی سے لبریز ہیں قطعات مُسلسل۔ رُباعیات اخلاقی اور ناصحانہ ہیں۔ رُباعیات کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے قصائد نئی شان کے ہیں۔ ان میں ممدوح کو اپنے فرائض منصبی سے آگاہ کرتے ہوئے گراں بہا نصیحتیں کی ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری اس میں شعر و شاعری پر نہایت فاضلانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ماہیت شعر کے متعلق مشرقی اور مغربی ناقدوں کی رائیں لکھ کر ان میں بحث و تمحیص کی ہے مصنف کا اصلی منشا اصناف سخن میں اصلاح کرنا ہے۔ دائرہ غزل کو وسیع کرنے کے لئے اس میں عاشقانہ فلسفیانہ مضامین کے علاوہ اخلاقی قومی اور نیچرل شاعری کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ زبان غزل کو بھی تبدیل کرنے کے حامی ہیں کہ زبان کا دائرہ وسیع ہو۔ اور ان قیود عروض کو بھی اٹھا دینا چاہتے ہیں۔ جو ترقی کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہو رہی ہیں۔

غزل گوئی میں ردیف و قافیہ کو مختصر کرنا چاہتے ہیں۔ اور ردیف کو چھوڑ کر محض قافیہ پر قناعت کرنے کی صلاح دیتے ہیں کہ شعرا اپنے خیالات کا اظہار زیادہ آزادی سے کریں۔ اور سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف قافیوں میں الجھ کر نہ رہ جائیں۔

ادبیات حالی حالی کا مرتبہ اردو ادب میں نہایت ممتاز ہے۔ سب سے پہلے انہی نے غزل اور قصیدہ میں نیا رنگ اختیار کیا۔ سیاسی اور قومی نظمیں لکھیں طرز قدیم یعنی تکلف تصنع اور خلاف واقعہ باتوں کو ترک کیا۔ مولانا آزاد کے ساتھ حالی کو بھی اردو شاعری کے جدید رنگ کا بانی سمجھنا چاہئے۔

خصوصیات کلام (۱) نیچر کی پیروی (۲) تعلی، مبالغہ اور اغراق سے احتراز (۳) زبان اور خیالات میں سادگی اور صفائی (۴) جذبات اور اثر زیادہ (۵) صنائع اور بدائع کم (۶) آخر زمانہ کا کلام فلسفیانہ اور عمیق ہے

نقائص کلام حالی کہیں کہیں قواعد عروض۔ صحت الفاظ و محاورات کا خیال نہیں رکھتے۔ بعض اوقات انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ شاید ان سے اپنے کلام میں امتیاز پیدا کرنا مطلوب ہو۔ ان کا تخیل کبھی بہت اعلیٰ اور کبھی محض تک بندی ہوتی ہے۔ ایک ریفارمر اور نیشلسٹ کی حیثیت بھی اکثر ان کے کلام کو بدمزہ کر دیتی ہے۔ لیکن ان نقائص سے ان کے مرتبۂ شاعری میں فرق نہیں آتا۔

آزاد دہلوی شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کو جدید شاعری کا بانی اور ادب اردو کا مجدد سمجھنا چاہئے۔ زمانہ حال کے بہت بڑے ادیب مشہور شاعر۔ نامی گرامی نقاد۔ فن تعلیم کے بہت بڑے ماہر اور ایک مشہور انشا پرداز تھے۔ جدید فارسی کے استاد کامل اور فلالوجی (علم الالسنہ) کے بڑے ماہر تھے۔ زبان اردو پر ان کے احسانات بیحد ہیں۔ اردو شاعری اور انشا پردازی میں نئی روح پھونکنے والا اگر فی الحقیقت کوئی شخص تھا تو وہ مولانا ہی تھے یہاں ان کی شاعری کا مختصر حال لکھا جاتا ہے۔ باقی حالات حصہ نثر میں درج ہیں۔

آزاد کی شاعری آزاد فطری شاعر تھے۔ ان کی نثر بھی نظم کی طرح شاعرانہ تخیل رکھتی ہے۔ اور کسی طرح شعر سے

کم نہیں کہی جا سکتی۔ اُستاد ذوق ان کے والد مولانا محمد باقر مرحوم کے بہت گہرے دوست تھے اِس لئے آزاد انہی کی صحبت میں پلے بڑھے اور انہی کے شاگرد ہوئے۔[۱] وہ اپنے اُستاد کے ساتھ بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوتے اور اُستادوں کے کلام کے حسن و قبح پر تنقیدیں سُنتے تھے۔ گویا انہی صحبتوں کی برکت سے آزاد کے دل میں جذبہ شاعری برانگیختہ ہوا۔ آزاد تقریباً تیس برس کے تھے۔ کہ غدر کے ہنگامے نے ان جلسوں کو منتشر کر دیا۔ دہلی سے نکل کر وہ مدتوں شمال اور جنوب میں مارے مارے پھرے۔ آخر لاہور آکر ڈاک خانہ میں مُلازم ہوئے۔ کچھ مدت بعد اپنی تعلیمی دلچسپیوں کی بدولت محکمہ تعلیم میں آ گئے۔ ان دنوں کرنل ہالرائڈ انسپکٹر تعلیمات تھے۔ آزاد نے ان کے ایما سے ایک ادبی انجمن قائم کی جس کے جلسے ہر مہینے ہوا کرتے تھے۔ اس انجمن کے مقاصد بالکل نئے تھے۔ بجائے مصرعہ طرح کے مختلف مضامین کا اعلان کیا جاتا تھا۔ اور اردو شاعری سے بیجا مبالغہ تکلف اور فرسودہ خیالات کا نکالنا اس کا مقصد اصلی تھا۔ پُرانی رسم چھڑانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جونہی اس نئی قسم کے مشاعرے اور اس کے مقاصد کا اعلان ہوا۔ سارے ہندوستان میں مخالفت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ آخر مولانا نے اِس قسم کے مشاعرے شروع کرنے سے پہلے مختلف جلسوں میں اپنے فاضلانہ لکچروں اور دلچسپ نظموں سے پہلے لوگوں کو تیار کیا اور ثابت کیا کہ یہ رنگ مقبول عام ہو سکتا ہے۔ ۱۸۷۴ء میں نیچرل شاعری کے مشاعروں کے افتتاح کے موقعہ پر انہوں نے ایک نہایت عالمانہ ایڈریس پڑھا جس میں پُرانی شاعری کے عیوب دکھا کر صاف صاف بتا دیا۔ کہ اگر اُردو شاعری کی بقا چاہتے ہو تو عروس شاعری کو تیرہ و تار جلوں سے نکالو اور موجودہ زمانہ کی روشنی میں لاؤ۔ سادگی۔ واقعیت اور درد و اثر بھاشا سے سیکھو اور صاف بیانی اور وسعت نظر مغربی شاعری سے مستعار لو۔

افسوس کہ یہ مشاعرہ ایک سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ لیکن پھر بھی آزاد کے خیال اور کوششوں میں کوئی چیز سدراہ نہ ہوئی۔ وہ اکثر اُردو نظمیں انگریزی نظموں کی طرز پر لکھتے رہتے۔ اور مغربی خیالات کو اُردو کے سانچے میں اس طرح ڈھالتے۔ کہ ان کو انگریزی کا ترجمہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔

آخر محنت شاقہ اور صدمات رُوحانی نے آزاد کے دماغ کو اُلٹ دیا۔ اس زمانہ میں پُرانے خیالات پھر عود کر آئے۔ اور اکثر عاشقانہ غزلیں کہتے رہتے۔ اس وقت کے کلام کو وہ اکثر یہ کہہ کر دریا بُرد کر دیا

---

[۱] اُستاد ذوق کے انتقال کے بعد حکیم آغا جان عیش کو اپنا کلام دکھاتے تھے ۱۲

کردیا کرتے تھے کہ جا اُستاد کے پاس جا۔ پھر بھی جس قدر کلام فراہم ہوسکا وہ مجموعہ نظم آزاد اور حکدۂ آزاد کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

جدید رنگ اختیار کرنے سے قبل آزاد پرانے رنگ میں کہا کرتے تھے۔ جدید رنگ میں "الوالعزمی کے لئے کوئی سدراہ نہیں"۔ ایک تارے کا عاشق۔ محنت کرو، محنت کرو۔ معرفت الٰہی۔ شب قدر وغیرہ قابل تعریف اور پڑھنے کے قابل نظمیں ہیں۔

انداز کلام (۱) مثنوی شب قدر۔ یہ ان کا شاہ کار ہے۔ اس میں مختلف قسم کے لوگوں کے اشغالِ شبانہ نہایت خوش اسلوبی سے بیان کئے ہیں۔

شاعر

اِس تیرہ شب میں شاعرِ روشن دماغ ہے بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے اُڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پر خیال کے
لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اُتار کر جاتا زمین کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر
پڑھتا ہے ذرے ذرے پہ افسوں نئے نئے
ہو جاتے ہیں وہی دُرِ مضموں نئے نئے

آزاد

عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں
پھیلائے ہاتھ صورتِ اُمیدوار ہے اور کرتا صدق دل سے دعا بار بار ہے
مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض
یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

(۲) مثنوی حُبِّ وطن۔ اس میں بعض سچے اور فرضی واقعات کو نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کر کے اپنے مطالب کو ثابت کیا ہے۔

(۳) مثنوی خواب امن۔ نہایت زوردار مثنوی ہے۔ اس میں یہ دکھایا ہے کہ تمدنی ترقیاں محض امن کے زمانہ میں ہو سکتی ہیں۔

(۴) **مثنوی ابر کرم** - حالی کی برکھارت کی طرز پر ہے - اس میں ہندوستان کی برسات کا سماں باندھا ہے -

(۵) **صبح اُمید** - اس میں یہ دکھایا ہے - کہ زراعت - تجارت اور تعلیم وغیرہ کی کامیابی اُمید سے وابستہ ہے -

آزاد اور حالی کا فرق آزاد حالی کی طرح صرف شاعری کے دلدادہ نہ تھے - ان کی طبیعت عالمانہ تھی - ایک کامل نثار اور شاعر ہونے کے علاوہ ماہر تعلیم - جریدہ نگار اور زبردست ناقد تھے - انہوں نے ضرورت زمانہ کو دیکھ کر اپنی طبیعت کو جدید رنگ سے رنگا اور اسی میں اجتہاد کا درجہ حاصل کیا - نظم آزاد کے شروع میں ان کا ایک لکچر بھی چھپا ہے - جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نظم سے نثر کو ترجیح دیتے اور اسی میں اپنے مُلک اور وطن کی بہتری سمجھتے ہیں - چنانچہ ان کے جذبات کا جس قدر اظہار نثر میں ہوا نظم میں نہیں ہو سکا لیکن ان کی نثر پر بھی حقیقی معنوں میں شعریت کا اطلاق ہوتا ہے -

برخلاف اس کے حالی ایک قومی شاعر تھے - انہوں نے تنزل اسلام کے راگ کو بڑے دردناک پیرائے میں الاپا - ان کی طبیعت نے یہ اثر سرسیّد سے لیا تھا - لیکن اس رنگ کو آخر تک نبھایا اور اسی کی بدولت وہ ادبی دُنیا میں مشہور ہوئے -

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی مولوی صاحب ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے - سولہ سال کی عُمر تھی کہ سررشتہ تعلیم میں مُلازم ہوئے - بعد میں ترقّی کر کے فارسی کے ہیڈ مولوی ہو گئے - اسی عُہدہ پر آگرہ اور سہارنپور میں رہکر ۱۸۹۹ء میں پنشن لی اور بقیہ عُمر میرٹھ میں تصنیف و تالیف میں صرف کی - ادبی خدمات کے صلے میں خانصاحب کا خطاب پایا - یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو انتقال فرمایا -

آگرہ میں مولوی صاحب نے چند اُردو ریڈریں اور پرائمریں لکھیں جو عرصے تک نصاب میں داخل رہیں - یہ کتابیں نہایت صاف اور سادہ عبارت میں تھیں - مولوی صاحب موصوف نے ممالک متحدہ میں وہی تعلیمی کام کئے جو مولانا آزاد نے پنجاب میں انجام دیئے -

مولوی صاحب شاعر بھی تھے اور نثار بھی - سادگی اور صفائی ان کے کلام کی خصوصیت تھی - انہوں نے شاعری میں قدیم و جدید طرز پر خُوب طبع آزمائی کی - ہمیشہ ہر صنف سخن میں کچھ نہ کچھ کہتے رہے - ان کی عاشقانہ - سیاسی - اخلاقی اور نیچر کی نظمیں بے تکلفی اور سادگی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں - مولانا

شبلی کہا کرتے تھے اگر حالی کے بعد کسی نے سُننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔ زمانۂ حال کے شاعروں اور نثاروں میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

مولوی صاحب کے کلام کا مجموعہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ ان کے ہاں تصوّف کا رنگ بھی پایا جاتا ہے جدید رنگ کی نظمیں نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں۔ اُردو میں بغیر قافیہ کی نظموں میں انہوں نے نہایت دل آویز طریقے سے طبع آزمائی کی ہے۔ علاوہ غزلیات کے اخلاقی نظمیں قصّے کہانی کے طور پر لکھی ہیں۔ جن سے نہایت عُمدہ اخلاقی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

مولوی صاحب کے ارادے نہایت بلند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لُغات اُردو کی ترتیب اور قواعد اُردو کی تکمیل نئی طرز سے کریں۔ قران السعدین کو مکمل کر چکے تھے۔ اور امیر خسرو کے کلام کی تنقید اور سوانح عمری مکمل کر رہے تھے کہ ۱۹۱۷ء میں راہی مُلک عدم ہوئے۔

سرور جہان آبادی	منشی درگا سہائے سرور بھی جدید اُردو شاعری کے ایک رکن ہیں۔ وہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت

رہنے والے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۰ء میں صرف ۳۷ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔

سرور کو قدیم وجدید دونوں رنگوں سے فطری مناسبت تھی۔ انہوں نے دونوں رنگوں کے عیبوں کو چھوڑ کر ان کی خوبیوں کو اختیار کیا۔ کلام میں قدما کا درد و اثر اور بلند خیال نیز جدید طرز کے تازہ مضامین اور حُب الوطنی کے جذبات ملے جلے ہیں۔ کلام نہایت شستہ ہے اور غیر مہذب باتوں سے پاک۔

سرور ہر وقت شعریت میں ڈوبے رہتے تھے۔ نہایت آزاد مزاج اور رِند مشرب واقع ہوئے تھے۔ زندگی اگرچہ تنگی اور عسرت سے بسر کی۔ لیکن اس سے شاعری کے شوق میں کمی نہیں ہوئی۔ مذہبی تعصبات سے آئینۂ دل پاک تھا۔ ان کی زندگی سادگی اور بے ریائی کا بہترین نمونہ تھی۔ مے نوشی کا بھی شوق تھا۔ جو مرزا غالب کی طرح کلام میں رنگینی پیدا کرتی اور دُنیاوی تفکرات سے بے نیاز رکھتی تھی اس علت کی بدولت ان کی قابل قدر زندگی کا قبل از وقت خاتمہ ہو گیا۔

خصوصیات شاعری	(۱) جذبات نگاری اور درد و اثر ان کے کلام کا جوہر ہے۔ حزن و یاس ان کے دل کو

ہمیشہ گرید ستار رہتا تھا۔ دیوار کہن۔ حسرت شباب۔ اندوہ غربت مُرغانِ قفس۔ یاد طفلی۔ بُلبل کا فسانہ۔ حسرت دیدار اور ماتم آرزو وغیرہ ان کی بہترین نظمیں ہیں۔

(۲) حُبّ الوطنی بھی ان کے کلام کی ایک خصوصیت ہے۔ ایسی نظموں میں وہ تمام اہل ہند کو

مخاطب کرتے ہیں۔ ان کو قومی شاعر کہنا کسی طرح بیجا نہیں۔ قومی نظموں میں حبِ وطن کا سچا جوش پایا جاتا ہے۔ بعض عاشقانہ نظمیں بھی اسی طرز میں ہیں۔

(۳) تاریخی اور مذہبی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جن میں جذبات۔ صداقت۔ بے تکلفی۔ سادگی اور روانی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ گنگا جمنا۔ پدمنی۔ نورجہاں کا مزار وغیرہ قابلِ تعریف نظمیں ہیں۔

(۴) ہندی الفاظ کو اپنے اشعار میں اس طرح کھپایا۔ کہ محاسنِ شعر میں اضافہ ہو گیا۔

انگریزی نظموں کے ترجمے سرور کی انگریزی تعلیم بہت محدود تھی۔ پھر بھی انہوں نے جس قدر ترجمے انگریزی نظموں سے کئے وہ بالکل اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ بعض نظموں میں انہوں نے محض انگریزی عنوان لے لئے اور ان پر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ مثلاً مُرغابی۔ کوئل۔ موسم سرما کا آخری گلاب۔ بچہ اور ہلال وغیرہ اسی قسم کی نہایت دلکش اور دلچسپ نظمیں ہیں۔

اخلاقی نظمیں اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن نصیحت کی روکھی باتوں میں شعر کی خوبی اور دلکشی کو کم نہیں ہونے دیا۔ زنِ خوش خو اور بے ثباتیِ دُنیا وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔

نہایت زُود گو اور بے تکلف کہنے والے تھے۔ انہوں نے سب اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی۔ لیکن مسدس میں اپنی طبیعت کا خُوب زور دکھایا۔ ان کا کلام جذبات نگاری۔ درد و اثر۔ اعلیٰ تخیل۔ شیریں بیانی سلیس بیان اور وسیع النظری کا نہایت عُمدہ نمونہ ہے۔

ان کا کلام بہت سا ضائع ہو چکا ہے۔ اکثر لوگ معاوضہ دے کر ان سے نظمیں لکھواتے اور بعض معاوضہ بھی ہضم کر جاتے اور ان کی نظمیں اپنے نام سے چھپوا دیتے تھے۔

اکبر الٰہ آبادی سید اکبر حسین رضوی ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین مرفہ الحال نہ تھے۔ ابتدائی تعلیم سرکاری سکولوں میں پائی۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار ہو گئے۔ ۱۸۷۰ء میں ہائیکورٹ میں مثل خوانی کی جگہ ملی ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۸۸۰ء تک وکالت کرتے رہے۔ پھر منصف ہو گئے ۱۸۸۸ء میں سب آرڈینیٹ جج اور ۱۸۹۴ء میں عدالت خفیفہ کے جج ہوئے۔ اس کے بعد خان بہادر کا خطاب ملا۔ اور وہ مُلازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی تھے۔ انہوں نے ستمبر ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا۔

اخلاق وعادات نہایت خلیق اور منکسر المزاج تھے۔ ظرافت ان کی طبیعت میں کُوٹ کُوٹ کر بھری تھی احباب ان سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ان کے خطوط ان کی راستبازی اور صداقت شعاری کی گواہی دیتے ہیں۔ کسی مذہب سے تعصب نہ رکھتے تھے۔ عقائد کے پکّے مسلمان تھے۔ آخر عمر میں اپنی اہلیہ اور ایک بیٹے کے انتقال سے دل شکستہ ہو گئے تھے۔ یہ شعر اسی زمانے کے ہیں ؎

وہ چمن ہی مٹ گیا جس میں کہ آئی تھی بہار — اب تجھے پا کر میں اے بادِ بہاری کیا کروں
بزمِ عشرت میں ٹھکانا تھا جسے وہ اٹھ گیا — اب میں اے فردا تیری امیدواری کیا کروں

اکبر کی شاعری اکبر کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ ان کا ابتدائی کلام بھی کلیات میں موجود ہے۔ شروع میں وہ اپنا کلام آتش کے شاگرد غلام حسین وحید کو دکھاتے تھے۔ ملازمت کے زمانہ میں انہوں نے انگریزی بھی پڑھی جس کا ان کی شاعری پر بہت گہرا اثر پڑا۔

اکبر اپنی طرز کے آپ ہی موجد اور آپ ہی خاتم ہیں۔ لسان العصر ہونے کے علاوہ بے مثل شاعر، ناصح قوم اور صوفی صافی تھے۔ حکومت پر نہایت ظریف پیرائے میں تنقید کرتے اور سیاسیات کو ظرافت میں رنگ کر اپنے دل کی بات ایسے مزے میں کہہ دیتے۔ کہ دیکھنے والے مُنہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔

اکبر نے خود اپنی شاعری کو پانچ دوروں میں تقسیم کیا ہے:-

پہلا دور سنہ ۱۸۶۶ء تک یہ زمانہ ان کی نو مشقی کا تھا۔ اس وقت کا کلام دہلی اور لکھنؤ کے مستند اساتذہ کی تقلید میں ہے۔ وہی فرسودہ مضامین اور تصنع۔ مگر پھر بھی جذبات میں صفائی۔ زبان میں سادگی اور روانی آنے والے خوش آیند مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔

دوسرا دور ۱۸۶۶ء سے سنہ ۱۸۸۴ء تک اِس دور میں تصنع کی جگہ بے تکلفی نے لے لی ہے۔ اور نسبتاً اصلیت کلام میں زیادہ ہو گئی ہے۔ فرسودہ مضامین اور حشو و زوائد کی بھی معتد بہ کمی ہے۔ درد و اثر۔ بندش اور طرزِ ادا میں صاف فرق دکھائی دیتا ہے۔

تیسرا دور ۱۸۸۴ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک اِس دور میں ان کے کلام میں اُستادانہ رنگ آ گیا ہے۔ نو مشقی کا زمانہ ختم ہو چکا ہے بیان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ غزلیں زیادہ لکھتے ہیں۔ پُرانے رنگ کی بجائے اخلاقی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ کلام میں ظرافت کا عنصر بڑھ رہا ہے۔ کہیں کہیں روحانیت و تصوف بھی جلوہ گر ہے۔ اِس دور کا کلام ان کی پہلی اور دوسری کلیات میں چھپا ہے۔

چوتھا دور
سنہ ۱۹۰۹ء سے سنہ ۱۹۱۲ء تک

اگرچہ گذشتہ دور سے یہ دور الگ نہیں۔ لیکن پھر بھی بہت ترقی کا دور ہے۔ اب اکبر حقیقت میں لسان العصر ہو گئے ہیں۔ قدیم رنگ کی غزل گوئی گھٹتی جاتی ہے اور فلسفہ بڑھتا جاتا ہے۔ مذاق اور ظرافت میں ترقی ہو رہی ہے۔ واقعات حاضرہ اور مغربی تہذیب پر نہایت بیباکی اور شوخی سے نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اخلاقی۔ رُوحانی اور فلسفیانہ رنگ کا زور ہے۔ عاشقانہ رنگ اگرچہ مدھم ہو چکا ہے۔ لیکن اس کو بھی بھولے نہیں۔

خیالات میں اب ایسا زور پیدا ہو گیا ہے۔ کہ قواعد شعری کے قیود ٹوٹ چکے ہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار نئے نئے انداز سے کرتے ہیں۔ کہیں انگریزی کے قافیے لاتے ہیں، اور کہیں جدید استعارے اور تشبیہیں۔ اِس دور میں اکبر اپنے فن کے صناع کامل ہیں۔

پانچواں دور
سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک

اِس زمانہ کا کلام کلیات سوئم میں چھپا ہے۔ عاشقانہ رنگ بہت کم ہے اشعار پر ظریفانہ سیاسی، اخلاقی اور رُوحانی رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اِس دور کو انکی شاعری کی معراج سمجھنا چاہئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں اور درست کہتے ہیں کہ یہ بُڑھاپے کا کلام ہے۔ اس میں ایام شباب کی سی شوخی اور جوش نہیں۔ وسیع تجربے اور طویل عمر نے ان کے کلام کو فلسفیانہ بنا دیا ہے۔ اِس دور کے اکثر اشعار اِس قابل ہیں کہ انسان ان کو اپنا دستور العمل بنا سکتا ہے۔

اِس زمانہ کا کلام بہت زیادہ ہے۔ اِس دور میں انہوں نے بہت سے ایسے اشعار بھی لکھے ہیں جن کو وہ طبع کرانا نہیں چاہتے تھے۔ مثلاً "گاندھی نامہ" اسی قبیل کی کتاب ہے۔

ان کا سارا مطبوعہ کلام تین حصّوں میں چھپا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے ابھی بہت کچھ باقی ہے خطوط بھی چھپ چکے ہیں۔ جو ادبی حیثیت سے نہایت دلچسپ ہیں۔ اکبر نثار نہ تھے۔ لیکن پھر بھی ان کے خطوط اور اودھ پنچ میں شائع شدہ ظریفانہ مضامین پڑھنے کے قابل ہیں۔

غزلیات اکبر

چستی بندش۔ روزمرہ۔ سلاست۔ روانی۔ بے تکلفی۔ بلند تخیل اور عمدہ تشبیہیں اکبر کی غزلوں کی جان ہیں۔ اکثر غزلیں اخلاقی۔ رُوحانی اور دُنیا کی بے ثباتی کے مطالب اور ظریفانہ۔ فلسفیانہ اور تصوفانہ مضامین سے مملو ہیں۔ حزن و یاس کے مضامین ان کے ہاں بکثرت ہیں لیکن انکی شہرت غزلوں کی وجہ سے نہیں۔ انکے مخصوص ظریفانہ انداز کے باعث ہے۔

رنگ قدیم

لکھا ہوا ہے جو رونا مرے مقدر میں
خیال تک نہیں آتا کبھی ہنسی کی طرف

نگاہ پڑتی ہے ان پر تمام محفل کی
وہ آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف
یہی نظر ہے کہ اب قاتل زمانہ ہوئی
یہی نظر ہے کہ اُٹھتی نہ تھی کسی کی طرف
ہزار جلوۂ حسنِ بُتاں ہو اے اکبر
تم اپنا دھیان لگائے رہو اسی کی طرف

رنگ متوسط

اب تو ہے عشقِ بُتاں میں زندگانی کا مزا
جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جائیگا
ہے سبب جوشِ جنوں کا رنجِ ہجراں اے حضور
آپ تو تشریف لائیں ہوش بھی آ جائیگا

عشقِ بُت میں کُفر کا مجھ کو ادب کرنا پڑا
جو برہمن نے کہا آخر وہ سب کرنا پڑا
تجربہ نے حُبِّ دُنیا سے سکھایا احتراز
پہلے کہتے تھے فقط مُنہ سے اور اب کرنا پڑا

رنگ آخر

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا
شدّتِ یاس سے مَیں آپ بھی اپنا نہ رہا
اُس کی پروا نہ رہی خوش رہے دُنیا مجھ سے
عاقلوں میں میری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا
حیرت افزا ہے مرا حال مگر کون سُنے
دیدنی بھی ہے مگر دیکھنے والا نہ رہا
دیکھنے کی تو ہے یہ بات رہا کیا اس میں
آپ اکبر سے عبث پوچھتے ہیں کیا نہ رہا

جنونِ عشق سے انساں کی طینت سنورتی ہے
یہی مستی وہ ہے جو عقل کو ہشیار کرتی ہے
یہ سچ ہے بیخبر ہے نصف دُنیا نصف دُنیا سے
کہ یہ ماتم میں ہے مصروف اور وہ چین کرتی ہے
وہ ایذائیں مجھے مایوسیوں نے دی ہیں اے اکبر
کہ اُمید اب قدم رکھتے ہوئے بھی دل میں ڈرتی ہے

اکبر کی خوش طبعی اور ظرافت اکبر کی شہرت، ظرافت، بذلہ سنجی اور لطیف طنزیات پر مبنی ہے۔ ان کا ابتدائی ظریفانہ رنگ اودھ پنچ کی نامہ نگاری سے شروع ہوا۔ اور بہت جلد ترقی کر کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ گیا۔ ظریفانہ رنگ سے ان کی طبیعت کو اوائل عمر ہی سے خاص لگاؤ تھا۔ آخری زمانہ کے کلام میں بھی مذاقیہ اور ظریفانہ اشعار کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ گویا سوسائٹی کے رنگ کے ساتھ ان کے اس رنگ میں پختگی اور ترقی ہوتی گئی اور ان کی شوخ طبیعت نے اپنے لئے نئے راستے بنا لئے۔ اس رنگ میں انہوں نے ایسا کمال پیدا کیا کہ

کوئی ان کی نقل نہیں کرسکا۔

اکبر کے تیسرے دور کے کلام میں ظرافت اور شوخی بہت ہے۔ آخری عمر کے کلام میں شوخی نسبتاً کم ہے اسکی جگہ مفید اور ناصحانہ مضامین نے لے لی ہے۔ اس زمانہ میں انہوں نے ظرافت کو اخلاقی سیاسی اور رُوحانی مسائل میں نہایت خوبصورت انداز سے ملاکر اپنے کلام کا پایہ اور بھی بلند کر دیا ہے۔

اکبر کی ظرافت کے اجزا

(۱) جدید و لطیف عام فہم تشبیہوں کو نہایت دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔

(۲) غیر زبانوں کے الفاظ بطور قافیہ استعمال کرتے ہیں۔

(۳) معمولی الفاظ بالکل انوکھے طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کٹ پٹ۔ فالتو وغیرہ۔

(۴) بعض سبک الفاظ جو عام شعرا استعمال نہیں کرتے شعر میں نہایت خوبی اور شوخی سے صرف کرتے ہیں۔ مثلاً بدھو۔ جمن۔ کلو وغیرہ۔

اکبر کی ظرافت کو محض تمسخر نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس کی تہ میں نہایت عمیق اور لطیف معنی ہوتے ہیں۔ ان کے پند و نصائح کبھی تلخ نہیں معلوم ہوتے اور ان کا مذاق بھی سوقیانہ نہیں۔ ظرافت نہایت جامع اور وسیع ہے۔ واقعات حاضرہ سیاسیات مغربی طرز تعلیم اور تہذیب ان کی خاص دلچسپی کی چیزیں ہیں ہندوستانی سوسائٹی کی تعلیمی اور مذہبی خرابیوں کی خوب ظریفانہ پیرائے میں خبر لیتے ہیں۔ امیر، غریب، عالم، جاہل اور ہر مذہب و ملت پر ان کی ظرافت کے تیر چلتے ہیں۔

اکبر کی خاص اصطلاحات

مس۔ شیخ۔ سید۔ اونٹ۔ گائے۔ کلیسا۔ مسجد۔ مندر۔ بت۔ کالج۔ برہمن وغیرہ وغیرہ ان کی خاص اصطلاحات ہیں۔ مس سے مغربی تعلیم کی نظر فریبی۔ شیخ سے پرانے رنگ کے تنگ نظر مسلمان۔ سید سے سر سید مرحوم جو انگریزی تعلیم کے دلدادہ تھے۔ اونٹ سے مسلمانوں کی قدیم شان و شوکت اور گائے سے ہندو مسلم اتحاد مراد لیتے ہیں۔

اقسام ظرافت

(۱) مذہبیات (۲) سیاسیات (۳) تہذیب جدید (۴) پردہ و تعلیم نسواں (۵) ظرافت الفاظ (۶) طنزیات۔

مذہبیات

ڈاڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب
فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں

مرعوب ہوگئے ہیں ولایت سے شیخ جی
اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

پیارا ہے ہم کو، شیخ ہمارا بُرا سہی — چاقو ولایتی نہیں دیسی چھُرا سہی

نیست کس مصرفِ کارِ دیں بقلبِ مطمئن — یک فنافی الآنرست و یک فنافی الڈارون

سیاسیات

بابو کہنے لگے بجٹ پہ لڑو — مُلک کو دیکھو اپنے حق پہ لڑو

کہہ دیا ہم نے صاف اے مہراج — ہو مُبارک تمہیں یہ کام یہ کاج

مامقیمانِ کوئے دلداریم
یا ڈپوٹیشن ست یا غمِ ہیم

یہ دال لبِ گنگ کبھی گل نہیں سکتی — کلّو کے پٹاخے سے بلا ٹل نہیں سکتی

کامیابی کا سُدیشی پر پر اک در بستہ ہے — چونچ طوطا رام نے کھولی مگر پر بستہ ہے

تعلیم و تہذیبِ جدید

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں — کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں، وہ کیا ہے فقط بازاری ہے — جو عقل سکھائی جاتی ہے، وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

سُنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات — انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجئے

پردہ و تعلیمِ نسواں

غریب اکبر نے بحث پردے کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا — نقاب اُلٹ ہی دی اس نے کہہ کر کہ کرہی لیگا مُوا کیا؟

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی — اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

ظرافتِ الفاظ

عاشقی کا ہو بُرا اس نے بگاڑے سارے کام — ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی۔ اے ہو گئے

پکالیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جَو لانا — ہمارا کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

ح حکومت کی جب یہاں نہ رہی — حنفی نفی ہیں۔ معطل ہیں

ہر طرح آب ہے عاجزی ہم ہیں — اب ہمارے امام حنبل[لہ] ہیں

طنزیات

آنر اگر ملے جو ہے نام و نمود میں — کیا حرج زندگی ہو اگر حالِ زشت میں

لہ انگریزی میں ہنبل کے معنی عاجز ہیں۔

دوزخ کے داخلے میں نہیں ان کو عذر کچھ
فوٹو کوئی لگا دے جو ان کا بہشت میں

استحصال بالجبر

یعنی وہ اشعار جو بہ ادنیٰ تغیر اکبر نے اپنے کر لئے ہیں:-

کریما بہ بخشائے بر حال بندہ
کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ

رشتۂ در گردنم افگندہ پیٹ
مے برد ہر جا کہ کیک است و پلیٹ

گفتمش در عین وصل این نالہ و فریاد چیست
گفت مارا خوفِ فیس ٹیکس درایں کار داشت

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست
بعد ہر اسپیچ آخر چندہ ایست

اکبر کی سیاسی نظمیں اکبر کی سیاسی نظمیں دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کا مقصد محض خوش طبعی ہے۔ دوسری وہ ہیں جن میں ظرافت کے پردے میں سیاسیات مضمر ہیں۔ ایسے اشعار کی تلخی ظرافت کی وجہ سے بالکل دور ہو گئی ہے لیکن سامع کے دل پر وہ اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ اکبر کو ماہر سیاسیات نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اکثر انکے مقولوں میں اختلافات نظر آتے ہیں۔ اکبر سرکاری پنشن خوار تھے۔ اس لئے سیاسیات سے ہمیشہ اجتناب ہی کرتے تھے۔ پھر بھی جنگ عظیم اور مسجد کانپور کے بلوے کے ایام میں گورنمنٹ نے بعض اشعار پر ان کو متنبہ کیا۔

اکبر مشرقی طرز معاشرت کے حامی۔ انگریزی تعلیم کے مخالف اور روحانی تعلیم کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک احکام خداوندی کی بجاآوری سیاسی اور اقتصادی مشکلات کا بہترین حل ہے۔

اکبر نے کانگریس کی کارروائیوں۔ انتہا پسند جماعتوں۔ جابرانہ حکومت مغربی تہذیب اور تعلیم کا خوب دلکش انداز میں خاکہ اڑایا۔ یہ مضامین نہایت نادر استعارات اور لطیف اشارات کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں جو سطحی نظروں کے لئے زعفران زار اور دوربین نگاہوں کے لئے نہایت معنی خیز ہیں۔

سوسائٹی کی نکتہ چینی اکبر کی شاعری کے لمحے تھے وہ زمانہ پایا۔ جب ہندوستان نیا جنم لے رہا تھا۔ گویا ہندوستانی مغربیت کے ایسے دیوانے ہو رہے تھے۔ کہ ہر ہندوستانی چیز کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ یہ اثرات مذہب اور قدیم رسم و رواج پر بھی پڑ رہے تھے۔ اس زمانہ میں چند قدامت پسند لوگ کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ بنکم چندر چیٹر جی نے ناول لکھ لکھ کر انگریزی تہذیب کا خاکہ اڑایا۔ ادھر اکبر نے نظم کا میدان سنبھالا اور انتہا پسند ہندوستانیوں کی خوب خبر لی۔ اکبر قدامت پسند واقع ہوئے تھے۔ اس لئے نئی تہذیب ان کو اپیل نہیں کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سر سید مرحوم سے جو مغربی تعلیم کے زبردست حامی تھے ہمیشہ چشمکیں

ہوتی رہتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر مغربی تعلیم کے بالکل مخالف نہ تھے۔ وہ اسکی تحصیل میں اعتدال چاہتے تھے۔ کیونکہ مذہب کو مغربی تعلیم سے سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ وہ مذہب پر ہزار تہذیبوں کو قربان کرنے کیلئے طیار تھے اور آخرت کو دُنیا پر ترجیح دیتے تھے پرانی وضعداری۔ سچائی۔ ہمدردی۔ قناعت۔ خودداری۔ سادگی وغیرہ کے مداح اور موجودہ زمانہ کی دودلی۔ خود غرضی۔ بے حمیتی۔ مغربی تعلیم۔ بے پردگی اور مادہ پرستی کے سخت نکتہ چین تھے۔

مذہبی عقائد | اکبر علاوہ شاعر ہونے کے ناصح مشفق۔ ریفارمر۔ واعظ اور فلسفی بھی تھے۔ وہ خدا کی وحدانیت کے قائل تھے اور ان کا اعتقاد تھا کہ مذہب کا تعلق دل سے ہے۔ اس میں فلسفہ یا سائینس اور منطق کو مطلق دخل نہیں۔ مذہبی تعصبات سے بالکل بری تھے۔ مگر مذہب کے خلاف کسی قسم کی نکتہ چینی برداشت نہ کرتے تھے اعتقاد کو مذہب کی جان خیال کرتے تھے۔ آخر عمر میں فلسفہ اور تصوف میں بہت کہتے، اور دُنیا کی بے حقیقتی اور ناپائیداری کا نہایت عُمدہ پیرائے میں ذکر کرتے تھے۔

نادر کاکوروی | نادر علی خاں نادر بہت عُمدہ کہنے والوں میں سے تھے۔ فطری رنگ میں ان کی اکثر نظمیں بہت مشہور ہیں۔ درد۔ اثر۔ اعلیٰ تخئیل اور حبِّ وطن کے سچے جذبات ان کے کلام کے مخصوصات میں سے ہیں۔ انگریزی شعرا بائرن اور ٹامس مور کے سادے اور سلیس رنگ کو پسند کرتے تھے۔ ان کی نظمیں شمع و پروانہ۔ شاعر امید اور مادرِ ہند وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ پینتالیس برس کی عُمر میں ۱۹۱۲ء میں انتقال ہوا۔ ان کی وفات سے ادبی دُنیا کو سخت نقصان پہنچا۔

(۱۵)

آخری دور

نظر لکھنوی | نوبت رائے نظر لکھنؤ کے ایک معزز کایستھ خاندان سے تھے۔ جو لکھنؤ کے نوابوں کے زمانہ میں برسرِ اقتدار تھا۔ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ اُردو فارسی اور انگریزی تعلیم سے فارغ ہو کر شاعری میں پڑ گئے۔ اس وقت لکھنؤ میں شاعری کا بہت زور تھا۔ ستمبر ۱۸۹۷ء میں انہوں نے لکھنؤ سے رسالہ "خدنگِ نظر" جاری کیا۔ پہلے اس رسالہ میں محض غزلیں چھپا کرتی تھیں لیکن بعد میں مضامین نثر بھی نکلنے لگے۔ نظر آغا مظہر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ آغا صاحب کو مشاعروں کا بڑا شوق تھا۔ خدنگ میں انہی مشاعروں کی

غزلیں چھپا کرتی تھیں۔ غالباً یہ رسالہ سنہ ۱۹۰۱ء میں بند ہوا۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں نظر "زمانہ" کانپور کے سب ایڈیٹر ہو گئے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں انڈین پریس نے الہ آباد بلا کر رسالہ "ادیب" کی ایڈیٹری ان کے سپرد کی۔ دو سال تک اس عدیم النظیر رسالے کی ایڈیٹری کر کے کانپور آئے اور پھر زمانہ کے سٹاف میں داخل ہو گئے۔ تقریباً دو سال کانپور میں رہے اس زمانے میں ہفتہ وار "آزاد" کی بھی نگرانی کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ آئے۔ اب کی دفعہ مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر کی معرفت منشی نولکشور کے بیٹے سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے اپنے اخبار "اودھ" کی ادارت ان کے سپرد کر دی۔ زیادہ کام کرنے اور اپنے چاہیتے نواسے اور پھر اکلوتی بیٹی کی موت سے ان کی صحت نے جواب دیدیا۔ انہوں نے اودھ اخبار سے اپنا تعلق قطع کر لیا۔ ان حادثات سے عمر کا آخری حصہ بہت تلخیوں اور مالی تکلیفوں میں بسر ہوا۔ آخر کار دمہ کے مرض میں مبتلا ہو کر ۵۶ برس کی عمر میں سنہ ۱۹۲۳ء میں انتقال کیا۔ نظر کی موت سے تمام شعرائے لکھنؤ کو بہت صدمہ ہوا۔ اکثر نے تاریخہائے وفات لکھیں۔

نظر فطری شاعر تھے۔ ان کی قدرت زبان اور کمال شاعری مسلم ہے۔ آخری زمانے کی مصیبتوں نے ان کے کلام میں بہت زیادہ سوز و گداز پیدا کر دیا تھا۔ غزلیں بہت کہتے تھے۔ اور اسی صنف میں اپنے ہمعصروں میں وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آخر عمر میں جدید رنگ میں بھی کہنا شروع کیا لیکن اپنے پرانے رنگ کو اس سے الگ نہیں رکھ سکے اس لئے جدید شاعری میں کامیاب نہیں ہوئے۔

شعر و شاعری کے علاوہ فن تنقید اور نثر نگاری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ جدید طرز تنقید سے آگاہ تھے۔ لیکن پھر بھی ان کی تنقیدیں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ رسالہ زمانہ میں نقاد لکھنوی کے نام سے ریویو سے لکھا کرتے تھے۔ معرکہ چکبست و شرر میں جو مثنوی گلزار نسیم کے متعلق مدت تک جاری رہا نمایاں حصہ لیتے رہے۔ ان مضامین سے ان کی منصفانہ رائے اور شاعرانہ قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ کلام سلاست روانی اور پاکیزگی میں درگا سہائے سرور کے کلام سے بہت مشابہ ہے شاگردوں میں منشی بشیشر پرشاد منور مشہور ہیں۔

کلام

مدت سے ڈھونڈھتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے
وہ اک سکون خاطر جو بیشتر نہیں ہے

دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی
زندہ ہوں اب کہ مردہ مجھ کو خبر نہیں ہے

آہیں بھریں بہت کچھ، دم توڑنا ہے باقی — اِس آہ میں بھی دیکھوں ہے یا اثر نہیں ہے
تاریک ہو گئی ہے دُنیا ہی جب نظر میں — پھر کوئی امتیاز شام و سحر نہیں ہے
دُنیا سے جا رہے ہو کیا لیکے اے نظر تم — زادِ سفر نہیں ہے۔ رختِ سفر نہیں ہے

مُسدّس بھی نہایت عمدہ لکھتے تھے۔ مندرجہ ذیل دردناک مُسدّس اپنے نواسے کی موت پر کہی تھی ؎

ہوا تمام اُمیدوں کا خاتمہ تم پر — کسی سے اب نہ توقع۔ نہ ہے کسی پہ نظر
جہاں میں اپنا ہوا انجام کیا۔ نہیں ہے خبر — مرے پہ دیکھئے ملتا ہے اب کفن کیونکر
کہاں گئے مری بگڑی سنبھالنے والے
پُکار لو مجھے لالہ پُکارنے والے

تھمو تھمو کہ اس اُجڑے مکاں کا تھا یہ چراغ — بہار پہ تھا اسی نونہال سے یہ باغ
نہ ہوگا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ — تمام عمر دلِ ناتواں ہے اور یہ داغ
فغانِ بُلبلِ جاں دل کے پار ہوتی ہے
نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

اِسی طرح ان کا وہ مسدس بھی دل ہلا دینے والا ہے۔ جو انہوں نے افریقہ کی ستیاگرہ کے موقع پر کہا تھا۔

چکبست لکھنوی پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر میں اپنے اصلی وطن یعنی لکھنؤ میں آ گئے۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر کیننگ کالج میں داخل ہوئے۔ جہاں سے ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے کیا ۱۹۰۸ء میں قانون کی ڈگری حاصل کر کے لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔

چکبست کو شاعری کا بچپن سے بہت شوق تھا۔ کہتے ہیں نو برس کی عمر میں انہوں نے غزل کہی تھی کالج کے ایّام میں اکثر مشاعروں میں تمغے اور انعامات حاصل کئے۔ مگر آخر تک کوئی تخلص اختیار نہیں کیا۔ ضرورت کے موقع پر اپنے خاندانی نام یعنی چکبست ہی کو استعمال کر لیتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

ذکر کیوں آئیگا بزمِ شعرا میں میرا — مَیں تخلص کا بھی دُنیا میں گنہگار نہیں

شروع میں صرف غزلیں کہا کرتے تھے۔ مگر کچھ عرصے بعد قومی۔ سیاسی۔ سوشل اور نیچرل نظمیں لکھنے لگے جو میں انھوں نے واقعی کمال حاصل کیا۔ مسدس کہنے کا بہت شوق تھا اور حقیقتاً بہت جوش و خروش سے کہتے تھے۔ تخلص کے ساتھ ہی انہوں نے اُستادی اور شاگردی کے قدیم سلسلہ کو بھی خیرباد کہدیا تھا۔

غزلیں چھپا کرتی تھیں۔ غالباً یہ رسالہ ۱۹۰۸ء میں بند ہوا۔

۱۹۰۴ء میں نظرؔ "زمانہ" کانپور کے سب ایڈیٹر ہو گئے۔ ۱۹۱۰ء میں انڈین پریس نے الہ آباد بلا کر رسالہ "ادیب" کی ایڈیٹری ان کے سپرد کی۔ دو سال تک اس عدیم النظیر رسالے کی ایڈیٹری کر کے کانپور آئے اور پھر زمانہ کے سٹاف میں داخل ہو گئے۔ تقریباً دو سال کانپور میں رہے۔ اس زمانے میں ہفتہ وار "آزاد" کی بھی نگرانی کرتے رہے۔ ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ آ گئے۔ اب کی دفعہ مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر کی معرفت منشی نولکشور کے بیٹے سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے اپنے اخبار "اودھ" کی ادارت ان کے سپرد کر دی۔ زیادہ کام کرنے اور اپنے چاہیتے نواسے اور پھر اکلوتی بیٹی کی موت سے ان کی صحت نے جواب دیدیا۔ انہوں نے اودھ اخبار سے اپنا تعلق قطع کر لیا۔ ان حادثات سے عمر کا آخری حصہ بہت تلخیوں اور مالی تکلیفوں میں بسر ہوا۔ آخر کار دمہ کے مرض میں مبتلا ہو کر ۵۶ برس کی عمر میں ۱۹۲۳ء میں انتقال کیا۔ نظرؔ کی موت سے تمام شعرائے لکھنؤ کو بہت صدمہ ہوا۔ اکثر نے تاریخہائے وفات لکھیں۔

نظرؔ فطری شاعر تھے۔ ان کی قدرت زبان اور کمال شاعری مسلم ہے۔ آخری زمانے کی مصیبتوں نے ان کے کلام میں بہت زیادہ سوز و گداز پیدا کر دیا تھا۔ غزلیں بہت کہتے تھے۔ اور اسی صنف میں اپنے ہمعصروں میں وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آخر عمر میں جدید رنگ میں بھی کہنا شروع کیا۔ لیکن اپنے پرانے رنگ کو اس سے الگ نہیں رکھ سکے اس لئے جدید شاعری میں کامیاب نہیں ہوئے۔

شعر و شاعری کے علاوہ فن تنقید اور نثر نگاری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ جدید طرز تنقید سے آگاہ نہ تھے۔ لیکن پھر بھی ان کی تنقیدیں حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ رسالہ زمانہ میں نقاد لکھنوی کے نام سے ریویو سے لکھا کرتے تھے۔ معرکہ چکبست و شرر میں جو مثنوی گلزار نسیم کے متعلق مدت تک جاری رہا نمایاں حصہ لیتے رہے۔ ان مضامین سے ان کی منصفانہ رائے اور شاعرانہ قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ کلام سلاست روانی اور پاکیزگی میں درگاسہائے سرورؔ کے کلام سے بہت مشابہ ہے۔ شاگردوں میں منشی بشیشر پرشاد منورؔ مشہور ہیں۔

کلام

مدت سے ڈھونڈھتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے ۔۔۔ وہ اک سکون خاطر جو بیشتر نہیں ہے

دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی ۔۔۔ زندہ ہوں اب کہ مردہ مجھ کو خبر نہیں ہے

آہیں بھریں بہت کچھ، دم توڑنا ہے باقی — اِس آہ میں بھی دیکھوں ہے یا اثر نہیں ہے
تاریک ہو گئی ہے دُنیا ہی جب نظر میں — پھر کوئی امتیاز شام و سحر نہیں ہے
دُنیا سے جا رہے ہو کیا لیکے اے نظرؔ تم — زادِ سفر نہیں ہے۔ رختِ سفر نہیں ہے

مُسدّس بھی نہایت عُمدہ لکھتے تھے۔ مندرجہ ذیل دردناک مُسدّس اپنے نواسے کی موت پر کہی تھی ؎

ہوا تمام اُمیدوں کا خاتمہ تم پر — کسی سے اب نہ توقع۔ نہ ہے کسی پہ نظر
جہاں میں اپنا ہوا انجام کیا۔ نہیں ہے خبر — مرے پہ دیکھئے ملتا ہے اب کفن کیونکر
کہاں گئے مری بگڑی سنبھالنے والے
پُکار لو مجھے لالہ پُکارنے والے

تھمو تھمو کہ اس اُجڑے مکاں کا تھا یہ چراغ — بہار پہ تھا اسی نونہال سے یہ باغ
نہ ہوگا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ — تمام عمر دلِ ناتواں ہے اور یہ داغ
فغانِ بُلبلِ جاں دل کے پار ہوتی ہے
نظر کے باغ سے رُخصت بہار ہوتی ہے

اِسی طرح ان کا وہ مسدّس بھی دل ہلا دینے والا ہے۔ جو انہوں نے افریقہ کی ستیاگرہ کے موقع پر کہا تھا۔

چکبست لکھنوی

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمر میں اپنے اصلی وطن یعنی لکھنؤ میں آ گئے۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر کیننگ کالج میں داخل ہوئے۔ جہاں سے ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے کیا۔ ۱۹۰۸ء میں قانون کی ڈگری حاصل کر کے لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔

چکبست کو شاعری کا بچپن سے بہت شوق تھا۔ کہتے ہیں نو برس کی عُمر میں انہوں نے غزل کہی تھی کالج کے ایام میں اکثر مشاعروں میں تمغے اور انعامات حاصل کئے۔ مگر آخر تک کوئی تخلص اختیار نہیں کیا۔ ضرورت کے موقع پر اپنے خاندانی نام یعنی چکبست ہی کو استعمال کر لیتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

ذکر کیوں آئیگا بزم شعرا میں میرا — مَیں تخلص کا بھی دُنیا میں گنہگار نہیں

شروع میں صرف غزلیں کہا کرتے تھے۔ مگر کچھ عرصے بعد قومی۔ سیاسی۔ سوشل اور نیچرل نظمیں لکھنے لگے جو میں انہوں نے واقعی کمال حاصل کیا۔ مسدّس کہنے کا بہت شوق تھا اور حقیقتاً بہت جوش و خروش سے کہتے تھے۔ تخلص کے ساتھ ہی انہوں نے اُستادی اور شاگردی کے قدیم سلسلہ کو بھی خیرباد کہدیا تھا۔

اساتذۂ قدیم میں میرؔ۔ غالبؔ۔ انیسؔ اور آتشؔ وغیرہ کے کلام کو مدِ نظر رکھ کر طبع آزمائی کرتے تھے۔ اور نثر میں مولانا آزادؔ کے پیرو تھے۔

چکبستؔ کا مطمح نظر بہت وسیع تھا۔ مغربی تہذیب نے اس پر جلا کی تھی۔ بندش الفاظ کا خاص خیال رکھتے۔ اور ہندی الفاظ کو نہایت خوبصورتی سے صرف کرتے تھے۔ جدید رنگ کے مضامین کو صاف اور سلیس طرز میں کہنے پر قادر تھے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں ؎

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروض شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

چکبستؔ کا منظوم کلام بہت مختصر ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی۔ کہ وکالت میں مصروفیت کی وجہ سے فرصت کم ملتی تھی۔ ان کا مجموعہ نظم انڈین پریس نے چھاپا ہے۔ اس پر اردو کے محسن سر تیج بہادر سپرو نے فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے۔ ان کی تنقیدات اور دوسرے مضامین بھی اس پریس نے شائع کئے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں چکبستؔ نے سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کی طرف سے "صبح امید" ماہوار رسالہ نکالا تھا۔ اس میں اکثر سیاسی رنگ کے مضامین لکھتے رہتے تھے۔

چکبستؔ جدید شاعری کے مشہور رکن اور روش قدیم و جدید کے جامع تھے۔ اردو ادب کو ان کی ذات سے بڑی بڑی امیدیں تھیں۔ لیکن افسوس کہ ان کی قابل قدر زندگی کا بہت حسرتناک طریقے سے قبل از وقت خاتمہ ہوگیا۔ ۱۹۲۶ء میں رائے بریلی سے کسی مقدمہ پیروی کر کے واپس اسٹیشن پر آئے اور وہیں ان کو فالج کا ایک شدید دورہ پڑا۔ تمام جسم بے حس و حرکت اور زبان بند ہوگئی۔ اسی دن سات بجے شام کو اسٹیشن پر انتقال کیا۔ یہ وحشت اثر خبر سن کر ان کے بڑے بھائی رائے بہادر پنڈت مہاراج نرائن چکبست فوراً گئے اور ان کی لاش موٹر میں لکھنؤ لائے۔ اس سانحۂ عظیم سے لکھنؤ بھر کو سخت صدمہ ہوا۔ عدالتیں بند کردی گئیں۔ تعزیت کے جلسے کئے گئے۔ مختلف مذہب کے شعرا نے اس ناگہانی موت پر دردناک نظمیں لکھیں اور ادیبوں نے تعزیت کے مضامین سپرد قلم کئے۔ صفیؔ لکھنوی۔ عزیزؔ لکھنوی۔ محشرؔ۔ محرومؔ اور سحرؔ ہنگامی کی تعزیتی نظمیں بہت مؤثر اور درد انگیز ہیں۔

چکبست بحیثیت غزل گو چکبستؔ غزل گوئی میں پرانے رنگ سے بالکل علیحدہ رہے۔ انہوں نے

پُرانی تشبیہات اور استعارات اور لوازمات غزل کو یک قلم ترک کرکے شیرینی اور صفائی کا خاص خیال رکھا۔ ان کے مجموعۂ نظم میں مُشکل سے پچاس غزلیں ہونگی، اور وہ بھی اکثر ناتمام۔ ان میں فلسفیانہ اور نصیحت آمیز اشعار خوب ہیں۔ غزلوں سے ان کی سحر کاری اور جادُو نگاری کا پُورا اندازہ ہوسکتا ہے۔ چند اشعار مُلاحظہ ہوں ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب — موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا
فنا کا ہوش آنا۔ زندگی کا دردِ سر جانا — اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اُتر جانا
آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا — دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا
وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے — نہیں تو ہے بہت آساں اِس جینے سے مرجانا

طویل نظمیں ان طویل نظموں میں مذکورہ بالا خُوبیوں کے علاوہ مقامی رنگ اور ہندی الفاظ بہت خوبصورتی سے صرف کئے گئے ہیں۔ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے ان کے کلام کو اور بھی چمکاتے ہیں۔ ان کی اس قسم کی نظمیں پانچ قسموں میں تقسیم ہوسکتی ہیں (۱) مراثی (۲) قومی اور سیاسی نظمیں (۳) سوشل نظمیں (۴) مذہبی نظمیں (۵) نیچر کی نظمیں۔

(۱) مراثی اس صنف میں وہ پُرزور اور دردانگیز نظمیں شامل ہیں۔ جو مُلک کے جان نثار لیڈروں کی وفات پر لکھی گئی ہیں۔ یہ عموماً مسدس کی شکل میں ہیں۔ ان سے شاعر کے اعلیٰ تخئیل کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ان کو تمام نوجوانانِ ہند کی بلند خیالیوں کا ترجمان کہیں تو بیجا نہیں۔ غور سے دیکھئے ان میں انیس کا رنگ کس قدر جھلکتا ہے۔

گوپال کرشن گوکھلے کے متعلق :۔

اجل کے دام میں آنا ہے یُوں تو عالم کو — مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دُنیا میں ایسے ہی غم کو — مٹا کے تجکو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے تیرے نکلتا ہے
سُہاگ قوم کا تری چتا میں جلتا ہے

(۲) قومی نظمیں ان میں بھی وہی درد۔ وہی پاکیزگی اور وہی جوش ہے۔

وطن کا راگ :۔

یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا | رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا | دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

جنگ عظیم میں جب ہندوستانی سپاہی روانہ ہوئے تو چکبست نے ان کو نہایت پُرجوش الفاظ میں اس طرح مخاطب کیا ؎

ہاں دلیرانِ وطن دھاک بٹھا کر آنا | طنطنہ جرمن خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بُنیاد مٹا کر آنا | ندیاں خُون کی برلن میں بہا کر آنا

یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لئے
دھار تلوار کی ہے پار لگانے کے لئے

(۳) سوشل نظمیں | سوشل معاملات کی اصلاح میں وہ سیاسیات کی طرح میانہ روی کو پسند کرتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۱۷ء میں ازدواج بیوہ پر "برق اصلاح" کے عنوان سے ایک بہت عُمدہ نظم لکھی ۔ ملاحظہ فرمایئے۔ ذیل کی نظم "پھول مالا" میں ہندوستانی عورتوں کو کس دلکش انداز میں مغربی تہذیب کی خرابیوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں ؎

روش خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز | داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم | تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جس میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں | ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے | خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز
رُخ سے پردے کو اُٹھایا تو بہت خُوب کیا | پردۂ شرم کو دل سے نہ اُٹھانا ہرگز
پُوجنے کے لئے مندر جو ہے آزادی کا | اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز

(۴) مذہبی نظمیں | اِس صنف میں انہوں نے بڑا زور قلم دکھایا ہے۔ سری رام چندر کا بن باس ۔ کشن کنہیا۔ اور گنگا پر نہایت دلکش مؤثر اور مقدس نظمیں لکھی ہیں۔ ذیل کی نظم میں انیسؔ کا رنگ مُلاحظہ ہو۔

رام چندر کا بن باس کو جانا:۔

رُخصت ہُوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کو زیارت کا اِنتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اُداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہُوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہوگیا ہے یہ ہے شدّتِ ملال
تن میں لہُو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

آبِ انگور:۔

رفیق اس کی ہے مستی۔ عدو شعور اس کا
وداعِ ہوش کا سامان ہے ظہور اس کا
خمارِ مرگ جو لائے وہ ہے سرور اس کا
سیاہ قلب کو کر دے جو ہے وہ نُور اس کا
لگا دے آگ کلیجے میں جو۔ وہ آب ہے یہ
کرے جو طرفہ قیامت وہ آفتاب ہے یہ

(۵) نیچر کی نظمیں | نیچر کی نظمیں بہت کم ہیں۔ لیکن اعلیٰ تخیئل اور حُسن بندش سے لبریز اور پُرانی طرز سے الگ ہیں۔ ان میں "پھُول"۔ "کشمیر"۔ "جلوۂ صبح" وغیرہ نہایت عُمدہ اور دلکش نظمیں ہیں۔

رُباعیات | چند رُباعیات بھی کہی ہیں۔ ذیل کی رُباعی اپنے حسب حال ہے ؎

بیکار تعلی سے ہے نفرت مجھ کو
لوں دادِ سخن نہیں یہ عادت مجھ کو
کس واسطے جستجو کروں شہرت کی
اک دن خود ڈھونڈھ لیگی شہرت مجھ کو

چکبست کی زبان | زبان نہایت شستہ۔ شیریں اور زوردار ہے۔ کلام میں لکھنؤ کا رنگ ہے۔ اکثر ہندی الفاظ کو نہایت خوبصُورتی سے اِس طرح استعمال کرتے ہیں کہ کلام کا لُطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

بحیثیت نقاد | چکبست انگریزی اور مشرقی طرزِ تنقید سے خوب واقف تھے۔ ادبی معاملات میں ان کی رائیں مُنصفانہ ہوتی تھیں۔ ذاتیات سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے۔ خود کہا ہے ؎

اُلجھ پڑوں کسی دامن سے مَیں وہ خار نہیں
وہ پھُول ہوں جو کسی کے گلے کا ہار نہیں

داغ اور سرشار پر ان کے مضامین ان کی علمی معلومات اور منصفانہ مزاج کا پتہ دیتے ہیں۔ نیز معرکۂ چکبست و شرر بھی اعتدال پسندی۔ فنی قابلیت اور متانت کا شاہد ہے۔ وہ اپنے رسالہ صبح اُمید میں غالب و آتش وغیرہ کے کلام کا انتخاب "عطر سخن" کے عنوان سے شائع کرتے تھے۔

بحیثیت نثار چکبست نثر نگار بھی بہت اعلیٰ درجہ کے تھے۔ نثر نگاری میں مولانا آزاد کے پیرو تھے۔ ان کے مضامین اکثر صبح اُمید۔ کشمیری درپن۔ خدنگ نظر، اور زمانہ وغیرہ میں چھپا کرتے تھے۔ جن کی عبارت متین اور زوردار، اور تخئیل عالمانہ انداز رکھتا تھا۔ منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ۔ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد۔ جوالا پرشاد برق۔ پنڈت بشن نرائن در۔ دیا شنکر کول۔ تربون ناتھ ہجر وغیرہ پر جو مضامین انہوں نے لکھے ہیں۔ وہ پڑھنے کے قابل ہیں۔

ڈاکٹر اقبال شیخ محمد اقبال سیالکوٹ میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے۔ اقبال نے کچھ مدت مکتب میں تعلیم پائی۔ پھر سکول سے میٹرک پاس کر کے مشن کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے۔ وہاں سے ایف۔ اے کر کے بی۔ اے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں آئے اور ایم۔ اے میں یونیورسٹی بھر میں اوّل رہے۔ لاہور میں علیگڈھ کالج کے مشہور پروفیسر مسٹر آرنلڈ سے فخر تلمذ حاصل ہوا۔ جب پروفیسر موصوف انگلستان واپس گئے تو اقبال نے ایک نہایت مؤثر نظم "نالۂ فراق" کے عنوان سے لکھی۔ تعلیم ختم کرنیکے بعد اقبال پہلے اورینٹل کالج میں تاریخ فلسفہ اور معاشیات کے پروفیسر ہوئے۔ پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی اور فلسفے کے لکچرار ہو گئے۔

۱۹۰۸ء میں اقبال اپنے بھائی کے مصارف پر انگلستان چلے گئے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے اخلاقیات کی ڈگری حاصل کر کے جرمنی گئے اور میونک میں اپنا مضمون متعلق بہ فلسفہ ایران مکمل کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی یہی مضمون "میٹافیزکس آف پرشیا" کے نام سے انگلستان میں شائع ہوا۔ جرمنی سے واپس آ کر بیرسٹری کی۔ اسی زمانہ میں لنڈن یونیورسٹی کے پروفیسر مسٹر آرنلڈ رخصت پر گئے۔ اور اقبال نے ان کی قائم مقامی کی۔ انگلستان سے واپس آ کر لاہور میں وکالت شروع کی۔ اور باوقات فرصت شعر و شاعری کرتے رہے۔

اقبال کی شاعری شعر و شاعری کا ابتدا ہی سے شوق تھا۔ سیالکوٹ مرے کالج میں پروفیسر میر حسن مرحوم کے فیضان صحبت میں اقبال کی شاعری کی نشو و نما ہوئی۔ لاہور آ کر یہ شوق اور بھی ترقی کر گیا۔ اتفاق سے لاہور میں کسی مشاعرے میں مرزا ارشد گورگانی اردو کے مشہور شاعر بھی شریک تھے۔ جب انہوں نے اقبال کا یہ شعر سُنا تو

پھڑک اُٹھے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تھوڑی مُدت اقبال ارشد سے مشورہ سخن لیتے رہے۔ پھر داغ کے باقاعدہ شاگرد ہوگئے ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا

۱۸۹۹ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں اپنی مشہور نظم "نالۂ یتیم" پڑھ کر سُنائی۔ اِس نظم سے ان کی شاعری کا شہرہ ہوگیا۔ اس کے بعد وہ انجمن کے سالانہ جلسوں میں ہر سال نظمیں پڑھتے رہے اور یہ سلسلہ انگلستان جانے تک برابر جاری رہا۔ اس زمانہ میں انہوں نے بہت کچھ کہا۔ اور بہت جلد کہنے کی مشق بہم پہنچائی۔ ان کا حافظہ ایسا زبردست تھا کہ اپنی بڑی بڑی نظمیں شروع سے آخر تک زبانی یاد تھیں۔ تصویر درد۔ فریاد اُمت۔ ہمارا دیس۔ نیا شوالہ۔ ترانہ وغیرہ اسی زمانے کی یادگار نظمیں ہیں۔

یورپ کے قیام کے زمانے میں اقبال نے شاعری ترک کردی۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیشہ کیلئے شاعری سے تائب ہو جائیں۔ لیکن اہل مشرق کی خوش قسمتی سے ان دنوں شیخ عبدالقادر انگلستان میں تھے۔ اس ارادے کا اقبال نے شیخ صاحب سے ذکر کیا۔ شیخ صاحب نے ان کو بہت کچھ قائل کیا۔ اور آخر فیصلہ اِس بات پر ٹھہرا کہ اگر پروفیسر آرنلڈ شاعری ترک کرنے کا مشورہ دیں تو شاعری ترک کردی جائے۔ پروفیسر موصوف نے کہا۔ جتنا وقت اقبال شاعری پر صرف کرتے ہیں۔ وہ ان کے اور ان کی قوم کے لئے بیحد مفید ہے۔ اِس کے بعد اقبال اِس اِرادے سے تو باز رہے۔ لیکن انہوں نے اُردو کی بجائے فارسی کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا۔ ہندوستان آکر وہ فارسی اور اُردو دونوں میں کہتے رہے۔ انگلستان سے واپسی پر پین اسلامزم یعنی ملیت کا ملمع ان پر چڑھ چکا تھا۔ غالباً اسی لئے انہوں نے فارسی کو اُردو پر ترجیح دی تاکہ دُنیا بھر کے مُسلمان ان کے پیغام کو سمجھ سکیں۔ شکوہ اور جواب شکوہ اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

آجکل اقبال کی شہرت ہندوستان سے نکل کر ممالک غیر میں پھیل چکی ہے۔ ہندوستان میں پہلے وہ قومی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے لیکن اخوت ملی کے جذبات نے ان کو بین الاقوامی اسلامی شاعر بنا دیا۔ یورپ۔ امریکہ اور ہندوستان کے مستشرقوں نے ایک زبان ہو کر قلمرو سخنوری میں ان کا سکہ مانا ہے۔ انگلستان کے مشہور مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے ان کی اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ انہی علمی اور ادبی خدمات کے صلے میں

ان کو سر کا معزز خطاب ملا۔ ایک زمانے میں نوبل پرائز کے مستحقین میں ان کا نام بھی لیا جاتا تھا۔

اقبال کی شاعری کے تین دور ڈاکٹر اقبال نے خود اپنی شاعری کو تین دوروں میں تقسیم کیا ہے:-

(۱) ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء تک یعنی جب تک ولایت نہیں گئے تھے۔ یہ دور ان کی تیاری کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اِس زمانہ کا کلام زیادہ تر غزلوں کی صورت میں ہے اور درخشاں مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔ ابتدائی کلام میں الفاظ کی موسیقی اور مصوری درجۂ کمال کو نہیں پہنچی۔ مگر اس کا وجود کسی قدر خامیوں کے ساتھ ضرور موجود ہے۔ اِس زمانہ میں اقبال ملّی شاعر نہیں ہیں۔ بلکہ ہندوستان کی تمام اقوام کے ترجمان ہیں۔ ان کی قومی نظمیں ہمالہ۔ ترانۂ ہندی۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت۔ نیا شوالہ وغیرہ اسی زمانے کے قابل قدر یادگار شاہکار ہیں۔ حق یہ ہے کہ انہی کی بدولت اقبال کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی ہے۔

(۲) ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک۔ اس دور میں وہ یورپ میں مقیم تھے۔ ان کے خیالات میں زبردست تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اوّل تو وہ شاعری چھوڑ ہی دینا چاہتے تھے۔ لیکن شیخ عبدالقادر اور پروفیسر آرنلڈ کے اصرار سے اس شوق کو جاری رکھا اور بجائے اُردو کے فارسی کو اظہار خیالات کا ذریعہ بنا لیا۔ اس کی وجہ یقیناً یہی تھی۔ کہ وہ پین اسلامزم یعنی ملّیت کے زبردست حامی ہو گئے تھے وہ چاہتے تھے۔ کہ ان کے پیغام عمل سے محض ہندوستان کے برادران اسلام ہی نہیں بلکہ تمام دُنیا کے مُسلمان بھائی فائدہ اُٹھائیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے کلام کے رنگ میں بھی ایک زبردست انقلاب آیا مغرب و مشرق کے فلسفے کے مُطالعہ سے ان کے کلام میں گہرائی اور فلسفیت غالب آ گئی۔ ترانۂ ملّی وغیرہ اسی انداز اور اسی دور کی نظمیں ہیں۔

(۳) ۱۹۰۸ء سے آخر تک۔ یہ دور انگلستان سے ہندوستان واپس آ کر شروع ہوتا ہے۔ اِس میں ان کی شاعری درجۂ کمال کو پہنچی۔ اور وطن پرستی کی جگہ ملّت پرستی نے لے لی۔ پہلے اُردو اور فارسی دونوں میں کہا کرتے تھے۔ اب محض فارسی میں اپنے بلند اور گہرے خیالات کا اظہار کرنے لگے[۱]۔ اس زمانہ میں اقبال صرف ہندوستان کے شاعر نہ تھے۔ وہ تمام دُنیا کے مُسلمانوں کے شاعر تھے۔ اور یہ مرتبہ ان کو فارسی ہی میں کہنے سے نصیب ہوا تھا۔

اقبال کی اُردو غزلیں اور نظمیں اقبال کی شاعری کا آغاز عام شاعروں کی طرح غزل گوئی سے ہوا۔

۱؎ آخری سالوں میں پھر اُردو میں کہنے لگے تھے لیکن کلام کا رنگ بالکل فلسفیانہ ہو گیا تھا۔

سیالکوٹ میں ان کو پروفیسر میر حسن سے تلمذ تھا۔ لاہور میں آ کر وہ ارشد گورگانی کے شاگرد ہوئے۔ اور بعد میں داغ سے باقاعدہ اصلاح لینے لگے۔ ابتدائی غزلیں کوئی خاص شان نہیں رکھتیں۔ لیکن درخشاں مستقبل کا ضرور پتہ دیتی ہیں۔ تجربہ کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں پختگی تخیل میں شستگی، اور بندش میں چستی اور خوبصورتی بڑھتی جاتی تھی۔ اسقام کم ہوتے جاتے تھے۔ اگرچہ غالب کی سی نزاکت خیال اور ان جیسی دلفریب ترکیبیں اقبال کے ہاں نہیں۔ لیکن متانت کلام۔ بلندیٔ خیال، فلسفے اور تصوف میں مرزا غالب کے وہ معزز جانشین ہیں۔

سیکسینا صاحب کا خیال ہے کہ "بعض جگہ فارسیت کے غلبہ سے تصنع اور آورد بہت آ گئی ہے۔ کلام کی روانی۔ آواز کی موسیقی۔ اثر۔ بلندیٔ خیال۔ ایقاع نظر کے محاسن سے دُور ہو جاتے ہیں"۔ یہ صریح ناانصافی ہے۔ اقبال کے کلام میں تصنع اور آورد بالکل نہیں۔ وہ ہمیشہ اُس وقت شعر کہتے تھے۔ جب شعر ان کو مجبور کر دیتا تھا۔ اور خودبخود زبان پر آ جاتا تھا۔ ان کے اشعار ہمیشہ بلند مدارج پر فائز رہتے ہیں۔ اقبال کے اشعار کے محاسن ان لوگوں کو نظر نہیں آتے جو پیش بیں نظر نہیں رکھتے۔ یا ان کے طائر تخیل کے ساتھ پرواز نہیں کر سکتے۔ فارسیت کے غلبہ کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اقبال لفاظ شاعر نہیں ہیں۔ وہ اپنے بیدار کن خیالات کا اظہار نہایت عالمانہ زبان میں ادا کرتے ہیں۔ سیکسینا صاحب جس قسم کی زبان کی اقبال سے توقع رکھتے ہیں۔ وہ اقبال کی شاعری کے لئے موزوں نہیں۔ کیونکہ اقبال کی حیثیت ایک حُدی خواں یا رہنما اور ریفارمر جیسی ہے۔ ان کو اس زبان کی ضرورت نہیں جو عاشقانہ شاعری میں پسند کی جاتی ہے۔ بعض زبان دان ان کے کلام پر اس نقطۂ نظر سے نکتہ چینی بھی کرتے ہیں، جو سراسر بے انصافی ہے۔

طویل نظمیں اقبال کی شہرت کا دارومدار طویل نظموں پر ہے۔ یہ نظمیں ان کے سچے جذبات۔ پُرجوش طرز بیان، اور بلندیٔ خیال کا بہترین نمونہ ہیں۔ ہمالہ۔ خضر راہ۔ شمع و شاعر۔ شکوہ اور جواب شکوہ وغیرہ اسی قسم کی عدیم المثال نظمیں ہیں۔

بحیثیت ہندوستانی شاعر انگلستان جانے سے پہلے اقبال کا دل وطنیت کا شیدا تھا۔ حقیقتاً ان کی شاعری سے ہندوستان کے نوجوانوں کے دلوں میں ایک جوش پیدا ہو گیا تھا۔ وہ ہندوستان بھر میں قومی شاعر کی

حیثیت سے بے انتہا مقبول و محبوب تھے۔ انگلستان کے سفر نے ان کے خیالات کو ملیت پر مرتکز کر دیا اور حُبِ وطن کا جذبہ آہستہ آہستہ معدوم ہوتا چلا گیا۔ ان کا ترانۂ ہندی" بنگالی بندے ماترم" سے بہت اونچی چیز ہے۔ ہمالہ۔ صدائے درد۔ تصویر درد۔ قومی گیت۔ نیا شوالہ وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔

بحیثیت پین اسلامسٹ

اخوت ملّی کا رنگ اقبال میں انگلستان جا کر پیدا ہوا۔ اس کو پین اسلامک سوسائٹی (جس کا اقبال ہی کی تجویز سے بعد میں اسلامک سوسائٹی نام رکھا گیا تھا) کا اثر سمجھنا چاہیے۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا۔ کہ دُنیا بھر میں جہاں جہاں مُسلمان ہیں ان کے دلوں میں جذبۂ اخوت پیدا کیا جائے۔

ڈاکٹر اقبال بین الملّی اخوت کے خاص علمبردار تھے۔ اپنے صادقانہ اور پُرجوش خیالات کا اظہار انہوں نے اس زمانے کی نظموں میں نہایت عمدگی سے کیا ہے ؎

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مُسلمانی — اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اِس انقلاب سے اقبال کو نقصان یہ پہنچا کہ وہ ہندوستانی شاعر نہ رہے۔ بلکہ ان کی وہ شہرت جو ہندوستان میں قومی نظموں کے ذریعے ہوئی تھی بالکل جاتی رہی۔ اب وہ شاعر اسلام ہو گئے اور انکی شہرت دُنیا کے تمام اسلامی ممالک اور یورپ و امریکہ تک پھیل گئی۔

اقبال کا فلسفہ

اقبال عام شعرا کی طرح عشق و عاشقی کے سخن سرا نہ تھے۔ ان کا کلام فلسفیانہ حقائق سے معمور ہے اور ان کا فلسفہ مختصراً یہ ہے کہ اپنی ہستی کو پہچان، اپنی ہستی کو ثابت کر، اپنے دل سے توہمات دُور کر۔ اقبال مغربی مادہ پرستی کے دُشمن تھے اور اس کے حقائق سے برادران اسلام کو آگاہ کرتے تھے۔ ان کے اشعار خوشدلی اور خودداری کی تلقین کرتے تھے، اور قدیم اسلامی عظمت کو یاد دلا کر دلوں کو اُکساتے تھے۔ ظاہرہ طور پر اقبال کا کلام مغربی اور مشرقی فلسفہ کے زیر اثر معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ خود کہتے ہیں کہ مَیں کسی مغربی فلسفی کا خوشہ چین نہیں ہوں۔

اقبال کا پیغام

اقبال کا پیام صادقانہ اور پُرجوش ہے۔ وہ برادران اسلام کو تلقین کرتے ہیں کہ اپنے اسلاف کے شاندار کارناموں کو دیکھو۔ اپنی ہستی کو پہچانو۔ اور اپنی زندگی کا ثبوت دو۔ قوتِ عمل پیدا کرو کہ جد و جہد زندگی، اور سُستی موت ہے۔ گویا مُسلمانوں کو سچا مُسلمان بنانا

چاہتے ہیں، اور نصیحت کرتے ہیں - کہ تم پہلے جیسی سادگی - سچائی - بے ریائی - شجاعت - ہمت - استقلال - خودداری اور ہمت پیدا کرو -

حقیقت یہ ہے کہ اقبال موجودہ زمانہ کی تصویر دھیمے رنگوں میں اور گذشتہ اور آیندہ زمانے کا مرقع نہایت شوخ رنگوں میں کھینچتے ہیں ؎

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

کلام میں اُمید و مسرت اقبال کا کلام ہمیشہ اُمید اور مسرت کے جذبات برانگیختہ کرتا ہے - ان کے کلام میں حزن و یاس کے مضامین نہیں ہوتے، اور یہی چیز ان کے کلام کو معاصرین سے ممتاز کرتی ہے - ان کا خیال ہے کہ مصائب اور ناکامیاں انسان کے کیرکٹر کو پختہ کرتی ہیں، وہ خود بھی کبھی مایوس نہیں ہوتے - ہمیشہ ناکامیوں کی گھٹاؤں میں اُمید کی جھلک دیکھتے ہیں -

اقبال عملی شاعر ہیں اقبال باوجود شاعر ہونے کے اشیاء کا عملی پہلو کبھی نظرانداز نہیں کرتے - اگرچہ ان کے خیالات بہت بلند ہیں - لیکن ان کے خیالات کی دُنیا میں عمل ہی عمل ہے، اور وہ ایک بہت بڑے عملی شاعر ہیں -

نیچر کی نظمیں اس صنف میں اقبال کا کلام لاجواب ہے - وہ نظمیں جو انہوں نے قدرتی مناظر پر لکھی ہیں، اپنا نظیر نہیں رکھتیں - چاند - جگنو - صبح کا ستارہ اور ابر وغیرہ پر ان کی نظمیں نہایت عمدہ ہیں - اکثر شعرائے مشرق مناظر قدرت کا ضمناً ذکر کر دیتے ہیں اور شعرائے مغرب کی طرح فطرت کے حسین مناظر میں محو نہیں ہوتے - اقبال اس لحاظ سے اہل مشرق بہت آگے ہیں - یہی چیز ان کو مشرقی شاعروں سے ممتاز کرتی ہے -

اقبال کی خصوصیات شاعری (۱) اخوت ملّی کی تحریک -

(۲) اسلام کے قرون اولیٰ کی عظمت کے زوال کا باعث عجم کی پُرتکلف تہذیب کو قرار دیتے ہیں - اور اس کی شکایت کرتے ہیں -

(۳) ان کا پیغام سچا اور پُرجوش ہے - لیکن بعض باتیں مصلحتاً تشبیہ اور تمثیل کے پردے میں کہتے ہیں -

(۴) وہ حقیقی شاعر ہیں۔ کسی کی بیجا مدح اور ہجو نہیں کہتے۔

(۵) ان کے کلام میں ایجاز اور اختصار خوب لطف دیتا ہے یعنی دریا کو کوزے میں بھر دیتے ہیں۔

(۶) ان کے اعلیٰ مضامین دماغ پر ذرا سا دباؤ ڈالنے سے بہ آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں۔

(۷) زمانہ حال کے شاعر ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کے حقائق ان کے کلام میں تصوّف اور اخلاق کے رموز کی طرح حسین ترین الفاظ میں موجود ہیں۔

(۸) ان کی بعض تشبیہیں بہت لطیف ہوتی ہیں۔ جگنو کے متعلق لکھتے ہیں ؎

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا — غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

افسوس کہ اردو ادب کا یہ درخشندہ ستارہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ خواجہ دل محمدؔ نے بے نظیر تاریخ کہی ہے:۔

"شمع خاموش" "شمع شاعری خاموش"
۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء

تاریخ نثرِ اُردو

(۱۶)

نثرِ اُردو کی ابتدا اور ترقّی
فورٹ ولیم کالج کلکتہ

نثرِ اُردو کے آغاز میں تاخیر کے اسباب

شمالی ہند میں فارسی کا عام رواج تھا۔ فارسی درباری زبان تھی۔ ہر قسم کی تحریریں فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ نثر نگار ظہوری اور بیدل کی پیروی کرتے تھے۔ اُردو میں بھی فارسی نثر کی اقسام یعنی مرجز۔ مقفیٰ۔ مسجع اور عاری وغیرہ رائج تھیں۔ معمولی معمولی باتیں نہایت رنگین اور پُر تکلف عبارت میں بیان کی جاتی تھیں۔ شاعری قابلیّت اور علمیّت کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ اور نظم کی عام مقبولیت نے نثر کو گوشۂ گمنامی میں ڈال رکھا تھا۔ یہی اسباب نثر کی ابتدائی تاخیر اور فورٹ کالج کلکتہ جیسے دُور دراز مقام سے منصۂ شہود پر آنے کا باعث ہوئے۔

زبان دکنی میں قدیم اُردو نثر کی تصانیف

محققین زبان نے (جن میں مولوی عبدالحق سیکرٹری انجمن ترقّی اُردو حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری خاص طور پر قابل ذکر ہیں) کوشش کر کے دکنی کے قدیم ترین چھوٹے چھوٹے رسائل دریافت کئے ہیں۔ یہ رسائل مذہبی رنگ کے ہیں۔ لیکن اُردو نثر کے وجود کا آٹھویں صدی ہجری تک پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً خواجہ گیسو دراز گلبرگوی اور شیخ علم الدین گنج العلم متوفی ۷۹۵ھ ۱۳۹۲ء کی تصانیف اس امر کی کافی شہادت ہیں۔ کہ اس وقت نثر موجود تھی۔

دہ مجلسی فضلی مصنفہ ۱۷۳۲ء

جب دکن کی اُردو شمالی ہندوستان میں آئی تو اس میں بہت سی کتابیں فارسی سے ترجمہ ہو چکی تھیں۔ انہی میں فضلی کی دہ مجلسی بھی تھی۔ فضلی نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"فارسی کی روضۃ الشہدا مصنفہ مُلّا حسین واعظ کاشفی کا ترجمہ عام فہم زبان میں کرنے کی مدتوں سے آرزو تھی۔ مگر میرے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا۔ کہ اس کام کی ہمت پڑتی۔ آخر امام حسینؑ نے خواب میں ہمت بندھائی"۔ فضلی نے کچھ مرثیے اور نظمیں بھی لکھیں۔ لیکن مقبول نہیں ہوئیں۔

دہ مجلسی اس زمانہ کی نثر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس میں ابتدائی دور کی خامیاں موجود ہیں۔ یعنی عبارت پیچیدہ۔ پر تصنع اور مقفٰی ہے۔

سودا کے زمانہ کی نثر

اسی زمانہ کی نثر اردو کا ایک نمونہ سودا کے کلیات کے شروع میں درج ہے۔ اس میں صرف و نحو کی پابندی بالکل نہیں۔ صرف ہم قافیہ الفاظ کے جملوں کے آخر میں دھر دیئے گئے ہیں۔ تشبیہوں اور استعاروں کی بھرمار ہے۔ گویا صرف ناموزون ہونے کی وجہ سے اس کو نثر کہا جاسکتا ہے ورنہ نظم میں اور اس میں کوئی خاص فرق نہیں۔

دریائے لطافت

انشا اور قتیل کی تالیف دریائے لطافت اگرچہ فارسی میں ہے۔ لیکن اس میں مختلف اہل پیشہ کی بولیاں۔ رسم و رواج۔ ضرب الامثال۔ لکھنؤ اور دلی کی زبان کے فرق۔ متروکات قدیم اور مختلف ملکوں کی زبانوں کے دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں داخل ہونے کے اثرات وغیرہ وغیرہ نہایت وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں

نوطرز مرصع یعنی ترجمہ قصہ چہار درویش

نوطرز مرصع بھی اس دور کی مشہور کتاب ہے۔ میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے اس کو امیر خسرو کے قصہ چہار درویش سے ۱۷۹۸ء میں اردو میں ترجمہ کیا۔ مصنف موصوف مرصع رقم کے لقب سے مشہور تھے۔ ان کے والد کا نام محمد باقر خاں شوق تھا مرصع رقم ابو المنصور خاں صفدر جنگ کے دربار سے وابستہ تھے۔ پھر جنرل سمتھ کے میر منشی ہو کر کلکتہ گئے۔ جب جنرل موصوف ولایت گئے تو تحسین پٹنہ میں وکالت کرنے لگے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد فیض آباد آکر نواب شجاع الدولہ کے ملازم ہوئے اور یہ سلسلہ نواب صاحب کے عہد تک قائم رہا۔

تحسین خوشنویس ہونیکے علاوہ منشی بھی بہت اچھے تھے ضوابط انگریزی یعنی گورنمنٹ ہند کے قوانین کا مجموعہ اور تاریخ قاسمی ان کی فارسی زبان کی تصانیف ہیں۔ قصہ چہار درویش کی عبارت نہایت رنگین اور فارسی عربی کے الفاظ سے مملو ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اس کا ترجمہ آسان اردو میں دوبارہ میر امن دہلوی سے کروایا تھا۔

فورٹ ولیم کالج سے نثر اردو کے تعلق کے اسباب

انگریزوں نے تجارت کرتے کرتے بڑے بڑے قطعات اپنے قبضے میں

کر لئے تھے۔ ان کا انتظام کرنے کے لئے اِس خطّے کی زبان بھی جاننی ضروری تھی۔ شروع شروع میں یہ کام مترجموں سے لیا گیا۔ لیکن بعد میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ جب تک برسرِ حکومت قوم مفتوح قوم کی زبان اور روایات سے واقف نہ ہو اُس وقت تک پوری طرح حکومت نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا کورٹ آف ڈائرکٹرز نے حُکّام کے لئے دیسی زبانوں کی واقفیت لازم قرار دی۔

جب انگریزی سلطنت بہت وسیع ہوگئی تو پارلیمنٹ نے ہندوستان کی تعلیم بھی اپنے ذمّہ لیلی کیونکہ حکومت کی مشین بغیر انگریزی تعلیم کے چلنی آسان نہ تھی۔ انگریزی تعلیم نے خیالات اور زبان دونوں میں انقلاب پیدا کردیا۔ اِس انقلاب کا نظم اور نثر دونوں پر اثر پڑا۔ انقلابات سے بُرائیاں اور اچھائیاں دونوں آتی ہیں۔ لیکن اِس تعلیمی تغیر سے دیسی زبان کو فائدے زیادہ پہنچے اور نقصان نسبتاً کم۔

ڈاکٹر جان گلکرسٹ ۱۷۵۹ء تا ۱۸۴۱ء

جان گلکرسٹ سکاٹ لینڈ کے باشندے تھے۔ ایڈنبرا میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ ۱۷۸۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مُلازمت میں بحیثیت ڈاکٹر ہندوستان آئے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز افسروں کو ہندوستان کی زبان ضرور جاننی چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے خود سبقت کی۔ وہ ہندوستانی کپڑے پہن کر اکثر ان مقامات کی سیر کیا کرتے تھے۔ جہاں فصیح اُردو بولی جاتی تھی۔ اُردو کے علاوہ فارسی سنسکرت اور اکثر مشرقی زبانوں سے باخبر تھے۔ ان کے شوق کو دیکھ کر اور افسروں کو بھی اُردو سیکھنے کا شوق ہوا۔ اور بعد میں اس کا عام رواج ہوگیا۔

لارڈ ویلزلی اُس وقت گورنر جنرل تھے۔ انہوں نے گلکرسٹ کی تجاویز کو مُفید پاکر انہیں فورٹ ولیم کالج کا افسرِ اعلیٰ مقرر کردیا۔ اور ان کو اپنے مقاصد میں کامیاب بنانے کے لئے ہر قسم کی امداد دی۔ فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں انگریز افسروں کو دیسی زبانوں کی تعلیم دینے کے لئے کھولا گیا تھا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے وہاں رہ کر اُردو کی ایسی شاندار خدمات انجام دیں کہ اُردو نے تھوڑی ہی مدت میں فارسی کو سرکاری دفاتر سے نکال کر اس کی جگہ پر قبضہ کرلیا۔

ڈاکٹر صاحب کی اُردو نوازی نے ہندوستان میں خوب شہرت حاصل کی مُغلیہ حکومت کے اختتام کے بعد بہت سے مشہور اہلِ قلم اور اہلِ زبان مثلاً میر امّن۔ افسوس۔ حسینی۔ لطف۔ حیدری۔ جوان۔ للّو لال جی۔ نہال چند۔ اکرم علی ولا۔ سید محمد منیر۔ سید بشیر علی افسوس اور مداری لال گجراتی وغیرہ کلکتہ پہنچ گئے۔ حق یہ ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب نے ان بزرگوں کو نہایت خوشی سے اپنے کالج میں جگہ دی۔

ڈاکٹر صاحب کے علاوہ کپتان روبک۔ کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر کی خدمات بھی قابل تعریف ہیں۔
ڈاکٹر موصوف علالت کی وجہ سے پنشن لیکر ولایت گئے۔ لیکن اُردو سے ان کو ایسا عشق تھا۔ کہ ۱۸۱۶ء میں ایڈنبرا سے لنڈن میں آگئے۔ اور وہاں انڈین سول سروس کے اُمیدواروں کو مشرقی زبانوں کی تعلیم دینے لگے۔ ۱۸۱۸ء میں اورینٹل انسٹیٹوٹ میں اُردو کے پروفیسر ہوئے ۱۸۲۵ء میں اس ادارہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ پرائیویٹ طور پر ایک سال بھر شائقین کو اُردو پڑھاتے رہے۔ آخر ۸۲ برس کی عمر میں پیرس میں انتقال کیا۔
ڈاکٹر صاحب نے ہندوستانی زبان کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے انگریزی ہندوستانی ڈکشنری اورینٹل لنگواسٹ۔ ہندوستانی گرامر۔ اور ہندوستانی فلالوجی وغیرہ مشہور ہیں۔

میرامن دہلوی میر امن دہلی کے رہنے والے تھے اور لطف تخلص کرتے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد سلاطین مغلیہ کے زمانہ میں وظائف اور جاگیروں کے مالک تھے! احمد شاہ درانی کے حملۂ دہلی میں ان کی جائداد پر سورج مل جاٹ نے قبضہ کر لیا۔ اور میر امن خود پٹنے چلے گئے۔ وہاں کچھ دنوں رہکر کلکتہ گئے۔ جہاں نواب دلاور جنگ کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی تعلیم و تربیت ان کے سپرد ہوئی۔ اس زمانہ میں میر بہادر علی حسینی کے ذریعے ان کی ملاقات ڈاکٹر جان گلکرسٹ سے ہو گئی۔
ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش سے میر امن نے قصۂ چہار درویش کا آسان اُردو میں ترجمہ کیا اور اس کا تاریخی نام "باغ و بہار" رکھا۔ قصۂ چہار درویش امیر خسرو نے اپنے مرشد نظام الدین اولیا کی علالت کے زمانہ میں ان کا دل بہلانے کو فارسی میں لکھا تھا۔ حضرت کی دُعا تھی کہ جو بیمار اس کو سُنے گا شفا پائیگا۔ یہ قصہ اب تک مقبول ہے۔ اور بہت سی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے میر تحسین نے اس کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ لیکن اس کی عبارت مشکل تھی۔ اس لئے مقبول نہیں ہوا۔ پھر میر امن نے اس کو نہایت پاکیزہ زبان میں لکھا۔ بقول سرسید ان کو اُردو نثر میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو میر تقی کو نظم میں۔ یہ عجیب تر بات ہے۔ کہ یہ کتاب انگریزوں میں بہت مقبول ہے۔ شاید اس لئے کہ اس زمانے کے رسم و رواج کو مصنف نے نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔
اس کتاب کے علاوہ "گنجینۂ خوبی" بھی میر امن کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب مُلا حسین واعظ کاشفی کی اخلاق محسنی کی طرز پر ہے۔ منشی کریم الدین کا خیال ہے۔ کہ ان کا دیوان بھی تھا۔ لیکن ڈاکٹر فیلن نے

میر امن کی زبانی بیان کیا ہے کہ فن شعر میں ان کو کسی سے تلمذ نہ تھا۔

افسوس
سنہ ۱۷۳۵ء تا سنہ ۱۸۰۹ء

میر شیر علی افسوس دہلوی میر مظفر علی خاں کے بیٹے۔ امام جعفر صادق کی اولاد میں سے تھے۔ آبا و اجداد خاف کے رہنے والے تھے۔ ان کے بزرگ سید بدرالدین نارنول میں آکر رہے تھے۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ان کے والد اور چچا آگرے سے دہلی آئے اور نواب امیر خاں کی سرکار میں بیش قرار تنخواہ پر ملازم ہوئے۔ اسی زمانہ میں افسوس دہلی میں پیدا ہوئے۔ نواب کے انتقال کے بعد افسوس پٹنے چلے گئے۔ اور وہاں نواب میر قاسم اور میر جعفر کی سرکار میں سلحہ خانہ کے داروغہ ہوئے۔ میر جعفر کی معزولی کے بعد لکھنو آئے اور وہاں سے حیدرآباد گئے۔ آخر وہیں انتقال کیا۔

لکھنو کے قیام میں افسوس کو شاعری کا شوق ہوگیا۔ وہ اپنا کلام میر حیدر علی حیرآن کو دکھاتے تھے بعض کہتے ہیں میر حسن اور میر سوز سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ لکھنو میں افسوس کی سرپرستی نواب سالار جنگ بہادر اور ان کے بعد ان کے بیٹے نے کی۔ یہیں نواب رضا خاں نائب آصف الدولہ کی وساطت سے ان کی ملاقات کرنل سکاٹ سے ہوئی۔ کرنل سکاٹ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے دو سو روپے ماہوار پر کلکتہ بھجدیا۔ پانسو روپے زاد راہ کیلئے دیئے۔ کلکتہ پہنچ کر افسوس فورٹ ولیم کالج کے سٹاف میں داخل ہو گئے۔

تصانیف (۱) ترجمہ گلستان سعدی موسوم بہ باغ اردو بہت مقبول ہوا۔

(۲) آرائش محفل ہندوستان کے جغرافیائی حالات اور فتح اسلام تک ہندو راجاؤں کی مختصر تاریخ۔

(۳) ایک دیوان بھی ہے جو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کلیات سودا اپنی تصحیح سے چھپوایا۔ اور میر بہادر علی کو نثر بینظیر منشی عنایت اللہ کو مذہب عشق اور مولوی محمد سمعیل کو بہار دانش کی تصنیف میں بہت مدد دی۔

میر بہادر علی حسینی ان کے متعلق محض اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں میر منشی تھے۔ کتب ذیل ان کی تصنیف ہیں:۔

(۱) "اخلاق ہندی" یہ مفرح القلوب کا سلیس اردو ترجمہ ہے جو ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش سے سنہ ۱۸۰۲ء میں کیا تھا (۲) نثر بینظیر یعنی مثنوی میر حسن نثر میں۔ یہ مثنوی سے دو برس قبل سنہ ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی (۳) خلاصہ گرامر گلکرسٹ صاحب (۴) ترجمہ تاریخ آسام اس کے علاوہ قصۂ لقمان اور قرآن شریف کے ترجمے میں بھی انہوں نے مدد دی۔

سید حیدر بخش حیدری سید ابوالحسن کے بیٹے۔ دلی کے رہنے والے۔ بزرگ نجف اشرف سے آئے تھے۔ سید ابوالحسن اور حیدر بخش۔ لالہ سکھ دیو رائے کے ساتھ دہلی سے بنارس گئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی حیدری کو ان کے والد نے نواب علی ابراہیم خاں جج عدالت انگریزی مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم کے سپرد کیا کہ ان کی صحبت سے مستفیض ہوں۔ ان کی علوم مذہبی کی تعلیم غازی پوری کے سپرد ہوئی۔ جو نواب صاحب کی عدالت سے وابستہ تھے۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج میں چند قابل منشیوں کی ضرورت تھی۔ حیدری نے قصہ "مہر و ماہ" درخواست کے ساتھ ڈاکٹر گلکرسٹ کو بھیجا۔ اسے دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے انہیں اپنے کالج میں بلالیا۔ ۱۸۲۳ء میں انتقال ہوا۔ ان کے بیٹے عیاں اور ممتاز بھی مشہور ہیں۔ حیدری کی اکثر تصانیف فارسی کے تراجم ہیں۔

(۱) قصہ لیلیٰ مجنوں۔ امیر خسرو کی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ۔

(۲) طوطا کہانی۔ سید محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر کیا تھا۔

(۳) آرائش محفل ترجمہ حاتم طائی۔ نہایت سلیس اور دلچسپ ہے (اس کا میر شیر علی افسوس کی آرائش محفل سے کوئی تعلق نہیں)

(۴) تاریخ نادری۔ مرزا محمد مہدی کے نادر نامہ کا اردو ترجمہ۔

(۵) گل مغفرت۔ گلشن شہیداں یعنی ترجمہ روضۃ الشہدا کا خلاصہ ہے۔ اس کا دوسرا نام دہ مجلس ہے۔

(۶) گلزار دانش۔ شیخ عنایت اللہ کی بہار دانش کا اردو ترجمہ جس میں عورتوں کے فریب کے قصے ہیں۔

(۷) ہفت پیکر نظامی کا جواب۔

(۸) ایک دیوان چند مراثی اور ایک مجموعہ صد حکایات۔

مرزا کاظم علی جوان دلی کے باشندے تھے لیکن لکھنؤ میں آرہے تھے۔ ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ سے انہوں نے اپنے کلام نمونہ نواب علی ابراہیم خاں مصنف تذکرہ گلزار ابراہیم کو بھیجا۔ ۱۸۰۰ء میں کرنل سکاٹ نے ان کو لکھنؤ سے فورٹ ولیم کالج میں لے لیا۔ ۱۸۱۵ء میں گویا فورٹ ولیم کے مشاعروں تک زندہ تھے۔ کتب ذیل ان کی طرف منسوب ہیں:۔

(۱) شکنتلا مصنفہ کالیداس کا برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا تھا (۲) ترجمہ قرآن (۳) ترجمہ تاریخ فرشتہ متعلقہ خاندان بہمنی (۴) سنگھاسن بتیسی۔ اسکی تصنیف میں لالہ لال بھی شریک تھے (۵)

بارہ ماسہ یا دستورِ ہند۔ اِس میں ہندوستان کی فصلوں اور تہواروں کا ذکر ہے (۶) خرد افروز یعنی انتخاب کلام میر و سودا۔

نہال چند لاہوری دِلّی میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں زیادہ رہے۔ اِس لئے لاہوری مشہور ہیں۔ ۱۲۱۷ھ ۱۸۰۲ء میں کلکتہ گئے۔ جہاں کپتان ولورٹ نے ان کو ڈاکٹر گلکرسٹ سے ملایا۔ ڈاکٹر صاحب کی فرمائش سے قصۂ تاج الملوک اور گل بکاولی کا سنہ ۱۸۱۲ء میں فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

مظہر علی خاں وِلاؔ مرزا لطف علی المعروف مظہر علی خاں متخلّص بہ وِلا سلیمان علی خاں وداد کے بیٹے، دِلّی کے رہنے والے، مرزا جان طپش اور مصحفی کے شاگرد۔ گلشن بیخار میں میر نظام الدین ممنون کو ان کا اُستاد لکھا ہے۔ مرزا صاحب کلکتہ کے کالج میں منشی تھے۔ ذیل کی تصانیف ان کی طرف منسوب ہیں:۔
(۱) پند نامہ سعدی کا منظوم ترجمہ مُصنفہ سنہ ۱۸۰۲ء (۲) ہفت گلشن مُصنفہ ناصر علی خاں بلگرامی کا ترجمہ۔ یہ اخلاق و مواعظ کی کتاب ہے (۳) قصہ مادھونل و کام کنڈلا۔ برج بھاشا سے اُردو میں ڈھالا ہے (۴) صُورت کبیشر کی بیتال پچیسی بھاشا کا ترجمہ جو پچیس قصّوں پر مشتمل ہے (۵) فارسی تاریخ شیر شاہی کا ترجمہ (۶) دیوان ریختہ ۳۵۰ صفحات، معہ سوانح عمری مُصنّف۔

حفیظ الدین احمد خرد افروز کے نام سے سنہ ۱۸۰۳ء میں ابو الفضل کی عیار دانش کا اُردو ترجمہ کیا۔ عیار دانش مُلّا حسین واعظ کاشفی کی تخلیص اور انوار السہیلی کلیلہ دمنہ عربی کا ترجمہ ہے۔ جو سنسکرت سے ماخوذ ہے کتنے ہی لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ لیکن بستان حکمت مترجمہ فقیر محمّد گویا سب سے بہتر ہے۔

مولوی اکرام علی انہوں نے عربی کی مشہور کتاب اخوان الصفاء کا صرف وہاں تک اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جہاں حیوان اور انسان کی برتری کا سوال جنّوں کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں تمام جانور انسان کے ظلموں کے خلاف مقدمہ پیش کرتے ہیں۔ ہر جانور اپنا اپنا بیان دیتا ہے۔ اِس پوری کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر ڈیرٹس نے کیا۔ اور کپتان ٹیلر کی فرمائش سے مولوی صاحب نے اُس کا کچھ حصہ سلیس اُردو میں لکھا جو سنہ ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا۔

سنہ ۱۸۱۴ء میں کپتان لاکٹ کی سفارش سے جو اس وقت فورٹ ولیم کالج کے اعلیٰ افسر تھے مولوی صاحب فورٹ ولیم کالج میں محافظ دفتر مقرر ہوئے۔

للّو لال جی یہ گجرات کے برہمن تھے۔ لیکن شمالی ہند میں آ رہے تھے۔ ہندو ہونے کے باوجود اُردو کے بڑے ماہر تھے۔ شکنتلا ناٹک۔ سنگھاسن بتیسی۔ بیتال پچیسی اور قصہ مادھونل کی تصنیف میں انہوں نے

اصل مصنفین کوٹری مادری ۱۸۱۰ء میں "لطائف ہندی" کے نام سے لطیف حکایات ہندی زبان میں لکھیں۔

بینی نرائن | جہاں تخلّص۔ دیوان جہاں کے مُصنّف، جس میں ہندوستانی شعرا کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ یہ تذکرہ کپتان روبک سیکرٹری فورٹ ولیم کالج کی فرمائش پر ۱۸۱۲ء میں لکھا تھا۔ ایک فارسی قصّے کا ترجمہ "چہار گلشن" کے نام سے منشی امام بخش کی فرمائش پر لکھا۔ کپتان ٹیلر نے اس کو پسند کیا اور مُصنّف کو معقول انعام دیا۔ گارسن ڈیٹاسی کی تحقیق کے مطابق انہوں نے شاہ رفیع الدین کی تنبیہ الغافلین کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ آخر کار مسلمان ہو کر مولانا سید احمد صاحب بریلوی سے بیعت ہو گئے تھے۔

مرزا علی لُطف | کاظم بیگ خاں استر آبادی کے بیٹے تھے۔ جو نادر شاہ کے ساتھ ۱۱۵۴ھ ۱۷۴۱ء میں ہندوستان آئے، اور بعد میں المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں داخل ہوئے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، اپنے باپ کے شاگرد تھے، جو ہجر یا ہجری تخلّص کرتے تھے۔ اُردو شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ لُطف حیدر آباد دکن جانا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر گلکرسٹ نے روک لیا۔ اور تذکرہ گلشن ہند لکھوایا۔ اس کا سن تصنیف ۱۸۰۱ء ہے۔ اور ماخذ نواب علی ابراہیم خاں کا تذکرہ ابراہیم۔ انہوں نے خود بھی اس میں کافی اضافہ کیا۔ پہلے تذکرۂ گلشن ہند بالکل نایاب تھا۔ جب حیدر آباد میں طوفان آیا تو اس کی ایک جلد موسیٰ ندی میں سے کسی قدر دان نے بہتی ہوئی پکڑی۔ اب انجمن ترقّی اُردو نے اس کو نہایت اہتمام سے چھپوایا ہے۔ اس تذکرے سے اس زمانے کی سوسائٹی اور شاعروں کے دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے بیانات قابل وثوق نہیں۔ عبارت ضرورت سے زیادہ پُر تکلّف اور مسجع مقفّٰی ہے۔

مولوی امانت اللہ | شیدا تخلص، اخلاق جلالی کا ترجمہ ۱۸۰۵ء میں جامع الاخلاق کے نام سے کیا۔ ۱۸۰۴ء میں ہدایت الاسلام عربی اور اُردو میں لکھی۔ جس کا ترجمہ گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں کیا۔ ۱۸۱۵ء میں صرف اُردو کے نام سے صرف و نحو اُردو کو منظوم لکھا۔

اِس عہد کے دیگر منشی اور نثار | سیّد جعفر علی رواں لکھنوی۔ افتخار الدین شہرت۔ عبد الکریم خاں کریم دہلوی مرزا ہاشم علی خاں عیاں۔ مرزا قاسم علی ممتاز۔ میر عبد اللہ مسکین۔ مرزا جان طپش۔ مولوی خلیل علی خاں اشک اور مرزا محمد فطرت وغیرہ بھی اِس زمانے کے مشہور نثّار اور منشی تھے۔ اشک نے ۱۹۰۸ھ میں اکبر نامہ کا ترجمہ واقعات اکبر کے نام سے کیا جو شائع نہیں ہوا۔ طپش نے اُردو محاورات پر

ایک کتاب اور ایک طویل مثنوی بہار دانش کے نام سے لکھی۔ ان کا کلیات بھی فورٹ ولیم کالج کی طرف سے شائع ہوا تھا۔

تراجم قرآن اور شاہ ولی اللہ دہلوی اور اُن کے صاحبزادے

مولانا شاہ ولی اللہ اٹھارہویں صدی کے آخر اور اُنیسویں صدی کے شروع میں گذرے ہیں۔ وہ دہلی کے مشہور محدث اور صوفی تھے۔ حجۃ البالغہ۔ ازالۃ الخفا عن سیرۃ الخلفا ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

ان کے بڑے بیٹے مولانا شاہ عبدالعزیز زہد و تقویٰ اور علم و فضل میں اپنے والد سے کم نہ تھے۔ ان کا ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء میں انتقال ہوا۔ دوسرے صاحبزادے شاہ رفیع الدین (۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء تا ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء) بھی بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے قرآن کا اردو میں ترجمہ کیا۔ تیسرے بیٹے شاہ عبدالقادر (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء تا ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء) اپنے والد اور بھائیوں کی طرح ظاہری اور باطنی کمالات کے باعث مشہور تھے۔ انہوں نے ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں قرآن کا اردو میں ترجمہ کیا جو نہایت سلیس اور با محاورہ ہے۔ مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنے ترجمہ قرآن میں اس کی بہت تعریف کی ہے۔ انہوں نے ایک تفسیر بھی موضح القرآن کے نام سے لکھی تھی۔ یہ تراجم فارسی کے انحطاط اور اردو کے روز افزوں اقبال کا پتہ دیتے ہیں۔

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی

مولوی عبدالغنی کے بیٹے اور شاہ ولی اللہ محدث کے پوتے، اپنے عہد کے بہت بڑے عالم تھے۔ ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء میں سید احمد مجاہد بریلوی کے ساتھ قلعہ بالاکوٹ (پنجاب) پر جہاد کیلئے گئے اور وہیں شہید ہو گئے۔ شاہ نصیر نے اس واقعہ کو اس طرح نظم کیا ہے ؎

کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سیپارہ ۔۔۔ نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نص قرآنی
ہرن کی طرح میدان وغا میں چوکڑی بھولے ۔۔۔ اگرچہ تھے دم شمشیر سے وہ شیر نیستانی

یہ سن کر ان کے مرید شاہ نصیر پر چڑھ آئے۔ ان دنوں مرزا خانی کوتوال شہر تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب کو ان کے پنجے سے چھڑایا۔ رسالہ توحید صراط مستقیم تنویر العینین اور تقویۃ الایمان وغیرہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

تدوین صرف و نحو و لغات اردو

کتب درسیہ اور تراجم کے ساتھ ساتھ صرف و نحو پر پوری توجہ مبذول کی گئی۔ سب سے پہلے ہندوستانی گرامر ۱۷۱۵ء میں جان جوشوا کٹیلر نے تصنیف کی۔ وہ شاہ عالم اور جہاندار شاہ کے زمانے (۱۷۱۲ء) میں ہالینڈ سے سفیر ہو کر آئے تھے۔ انہوں نے آگرہ۔ دہلی اور لاہور کی بھی سیر کی۔ ۱۷۱۶ء میں وہ اپنے ملک کی طرف سے ایران میں سفیر ہو کر گئے۔ انہوں نے ہندوستانی زبان کی ایک

لُغت تیار کی جس کو ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا۔ کیٹلر صاحب نے توریت کے دس احکام اور لارڈز پریر کا ترجمہ بھی اُردو میں کیا۔

۱۷۴۵ء میں جرمن کے پادری شلز نے ایک اور ہندوستانی گرامر "گرامٹیکا ہندوستانی کا" لاطینی میں تیار کی اِس میں ہندوستانی الفاظ انگریزی اور فارسی رسم الخط میں چھپے تھے۔ اسی سال ہل نے ہندوستانی حروف تہجی اور ہندوستانی الفاظ پر ایک رسالہ لکھا۔ ۱۸۱۷ء میں جے۔ اے فرٹز نے اسی مضمون کی ایک اور کتاب لکھی۔ جس میں ہندوستانی حروف تہجی کا دُوسرے مُلکوں کے حروف سے مقابلہ کیا۔ ۱۷۶۱ء میں اسی قسم کی ایک اور کتاب اٹالوی پادری کیسیانو بیلی گاٹی نے "الفاظ ٹیم برہمانکم" کے نام سے تصنیف کی۔ اِس کتاب میں بھی ہندوستانی حروف ہندوستانی شکل میں چھپے۔ ۱۷۷۲ء میں ہیڈلی کی گرامر اور ۱۷۷۸ء میں پرتگالی میں "گرامیٹکا اندوستانا" شائع ہوئی۔ اِس کے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ کا زمانۂ تصنیف آیا۔ جو ۱۷۸۷ء سے بیس سال تک جاری رہا۔ انہوں نے تقریباً پندرہ کتابیں صرف ونحو۔ علم الالسنہ۔ لُغات تراجم اور امثال وغیرہ کی تصنیف کیں نیز ان کی نگرانی اور فرمائشوں پر بیشمار عُمدہ اور دلچسپ کتابیں لکھی گئیں۔ ان کو اِس عہد کی تصنیفات کی رُوحِ رواں کہنا بالکل درست ہے وہ نہایت قابل خلیق اور متواضع انگریز تھے۔ مُلک کے ہر گوشے سے اُن کی قدردانی کی شہرت سُن کر علماء اور فضلا کلکتہ میں جمع ہوئے اور انہوں نے حسب مراتب تنخواہیں مقرر کر کے انہیں اپنے کالج سٹاف میں داخل کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف انگریزی ہندوستانی ڈکشنری اور ہندوستانی گرامر ہے۔

۱۸۰۸ء میں کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر نے بھی ایک ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ترتیب دی۔ مولوی امانت اللہ نے ۱۸۱۰ء میں ہندوستانی صرف ونحو کو اُردو میں "صرف اُردو" کے نام سے نظم کیا۔ ۱۸۱۳ء میں جان شیکسپیئر کی ہندوستانی گرامر اور ۱۸۱۷ء میں ان کی ہندوستانی انگریزی ڈکشنری شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ کپتان پرائس اور ریٹیس۔ گارسن ڈیٹاسی۔ ڈنکن فاربس نے زبان اور لُغت کے متعلق بہت سی کتابیں لکھیں۔ سر ولیم ماتیر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے بانی تھے۔ انہوں نے اور ڈاکٹر طفیلن نے گرامر اور لُغت کی کُتب تصنیف کیں۔ پلیٹ کی گرامر ۱۸۷۴ء میں اور ڈکشنری ۱۸۸۴ء میں اور پادری کریون کی ڈکشنری ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ ڈکشنریاں طلبا کے لئے بہت مفید تھیں۔

ہندوستانیوں کے مرتب کردہ لُغات و کتب دیگر	ہندوستانیوں میں سب سے پہلے انشاء اور قتیل نے مل کر اُردو صرف ونحو "دریائے لطافت"

کے نام سے ۱۸۰۲ء میں لکھی۔ جو ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی منشی محمد ابراہیم نے اُردو کی صرف ونحو تحفہ الفنسٹن ۱۸۲۳ء

میں لکھی۔ مولوی احمد علی دہلوی نے اُردو صرف و نحو پر رسالہ چشمۂ فیض ۱۸۴۵ء میں، مولوی امام بخش صہبائی کا ترجمہ حدایق البلاغت ۱۸۴۹ء میں، منشی کریم الدین کی قواعد المبتدی۔ نثار علی بیگ۔ فیض اللہ خاں اور محمد احسن کے رسالہ جات صرف و نحو۔ مولوی محمد حسین آزاد کی جامع القواعد۔ جلال کی گلشن فیض مطبوعہ ۱۸۸۰ء جو اُردو ہندی الفاظ کی تحقیق کی لغت ہے اسی دور میں لکھی گئیں۔

زمانہ حال کی تصانیف میں امیر مینائی کی ناتمام امیر اللغات۔ مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ مولوی نور الحسن نیر کاکوروی کی نور اللغات قابل ذکر ہیں۔ انجمن ترقی اُردو نے بھی ایک قواعد اُردو ترتیب دی ہے۔ مگر پھر بھی ایک مکمل گرامر کی ضرورت باقی ہے ۱۹۳۲ء میں خواجہ عبد المجید مرحوم نے جامع اللغات کے نام سے ایک بہت جامع لغات ترتیب دیا۔ اِس لغات کو اگر زبان اُردو کا انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بجا ہے۔ لغت کی کتب میں جامع اللغات بہترین کتاب ہے۔

اُردو کی ترقی کے لئے عیسائی پادریوں کے کارنامے

سب سے پہلے بائیبل کے ترجمے بنجمن شلز اور کالنبرگ نے ۱۷۴۸ء میں کئے۔ مرزا محمد فطرت اور کالج کے دیگر منشیوں نے عہد جدید کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ جو ڈاکٹر ہنٹر کی نظر ثانی کے بعد ۱۸۰۵ء میں شائع ہوا۔ اسی طرح سیرام پور کے پادریوں نے بائیبل کے اُردو اور ہندی میں ترجمے کئے۔ پادری مارٹن نے عہد جدید کا ترجمہ ۱۸۱۹ء میں یونانی سے اُردو میں کیا جو مرزا محمد فطرت کی نظر ثانی کے بعد طبع ہوا۔ پوری بائیبل کا ترجمہ سیرام پور کے پادریوں نے ۱۸۱۹ء میں شائع کیا۔ پادری لوگ اپنے دین کی اشاعت کے لئے ہندوستانی زبان میں تحریر و تقریر کیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کی تبلیغ سے بھی اُردو زبان کو بہت وسعت اور ترقی ہوئی۔

(۱۷)

نثر اُردو کا دورِ متوسط و جدید

مطبوعات لکھنؤ

اگرچہ نثر اُردو کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی تھی۔ مگر لکھنؤ جو دہلی کی تباہی کے بعد اُردو کا مرکز بن گیا تھا۔ خدمات زبان میں کسی طرح پیچھے نہیں رہا۔ بستان حکمت۔ کلیلہ دمنہ۔ گل بکاؤلی۔ گلشن نوبہار۔ گل و صنوبر۔ نورتن وغیرہ بیشمار کتابوں نے جامۂ طباعت لکھنؤ ہی میں پہنا۔

نواب فقیر محمد گویا
متوفی ۱۸۵۰ء

نواب صاحب لکھنؤ کے ایک نامور رئیس اور شاہی فوج کے رسالدار تھے حسام الدولہ خطاب، گویا تخلص، ناسخ کے شاگرد، کہتے ہیں خواجہ وزیر سے بھی اصلاح لیتے رہے۔ ان کے مرنے کے ایک سال بعد منشی نولکشور نے ان کا دیوان چھپوایا۔

ان کی مشہور تصنیف بستان حکمت انوار سہیلی کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔ یہ لفظی ترجمہ نہیں۔ موقعہ بموقعہ مترجم نے اپنی قابلیت سے بھی کام لیا ہے۔ عربی فارسی الفاظ بکثرت ہیں۔ زبان بھی کچھ سلیس نہیں عربی الفاظ و امثال نے عبارت کو بے مزہ اور مشکل بنا دیا ہے۔ مگر یہ بات قابل تعریف ہے۔ کہ فسانۂ عجائب کی طرح مقفیٰ اور مسجع نہیں۔ ایک زمانہ میں بستان حکمت بہت مقبول ہوئی۔

مرزا رجب علی بیگ سرور
۱۲۰۱ھ تا ۱۲۸۴ھ
۱۷۸۶ء تا ۱۸۶۷ء

لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور نثار مرزا اصغر علی بیگ کے صاحبزادے، لکھنؤ میں پرورش اور تعلیم پائی۔ عربی فارسی خوب جانتے تھے اور اپنے زمانہ کے مشہور خوشنویسوں میں شمار ہوتے تھے۔ حافظ ابراہیم کے شاگرد تھے۔ فن موسیقی بھی خوب جانتے تھے۔ فن شعر میں میر سوز کے شاگرد آغا نوازش کے شاگرد تھے۔ ظریف اور خوبصورت آدمی تھے شرف الدین اور مرزا غالب سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔

کہا جاتا ہے ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء میں غازی الدین حیدر کے حکم سے جلاوطن ہوئے اور کانپور میں جا رہے لیکن کانپور سے وہ سخت بیزار تھے۔ فسانۂ عجائب کانپور میں ہی لکھی۔ اس کے دیباچے میں میر امن پر سخت حملے کئے گئے ہیں ۱۸۴۵ء میں سرور کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اسی سال واجد علی شاہ نے پچاس روپے ماہوار پر ان کو درباری شعراء میں داخل کیا۔ ۱۸۴۷ء میں بادشاہ کے حکم سے شمشیر خانی کا اردو ترجمہ سرور سلطانی کے نام سے کیا۔ اس کے بعد شرر عشق اور شگوفۂ محبت، بیگم بھوپال اور امجد علی خاں رئیس سندیلہ کی فرمائشوں پر لکھے۔

۱۸۵۶ء میں لکھنؤ کی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ سرور اس بربادی سے تباہ حال ہو گئے۔ کچھ دنوں سید امداد علی اور منشی شیو پرشاد نے امداد کی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر نے یہ سلسلہ بھی منقطع کر دیا۔ تھوڑی مدت بعد مہاراجہ ایشری پرشاد نارائن سنگھ نے بنارس بلا لیا۔ اور بڑی قدر و منزلت کی۔ اس زمانہ میں سرور نے گلزار اور شبستان سرور وغیرہ چھوٹی چھوٹی نظم و نثر کی کتابیں لکھیں۔

سرور کو مہاراجہ پٹیالہ اور مہاراجہ الور نے بھی بلایا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے ان کو سونے کے کڑوں کی جوڑی دی۔ سرور کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ دلی۔ لکھنؤ۔ میرٹھ اور راجپوتانے بھی گئے تھے۔

کہا جاتا ہے ایک مرتبہ ان پر قتل کا الزام بھی لگایا گیا تھا۔

۱۸۶۳ء میں سرور اپنی آنکھوں کے علاج کے لئے کلکتہ گئے۔ جہاں واجد علی شاہ سے بھی ملے کلکتہ میں آنکھوں کا علاج ناکام رہا۔ پھر لکھنؤ آکر ایک ہندوستانی ڈاکٹر کے علاج سے صحت ہوئی۔ اس کے بعد بنارس گئے جہاں ۱۸۶۷ء میں انتقال کیا۔

فسانۂ عجائب سرور کا سب سے بڑا کارنامہ فسانہ عجائب ہے۔ یہ معمولی حسن و عشق کا افسانہ ہے، جس کے مضمون اور واقعات میں کوئی جدت نہیں۔ عبارت اس زمانہ کی طرز کے مطابق مقفّٰی مسجّع اور تکلف و تعقید سے اُلجھی ہوئی ہے۔ اِس کتاب کو زمانۂ حال کے اصول سے جانچنا سخت غلطی ہے کیونکہ مُصنف پُرانی طرز کے آدمی تھے۔ اور اس زمانہ میں یہی رنگ مقبول خاص و عام تھا۔

فسانۂ عجائب کا دیباچہ نہایت قابل قدر چیز ہے۔ اس میں اس زمانہ کی لکھنؤ کی سوسائٹی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اصل کتاب میں بڑی خامی یہ بتائی جاتی ہے۔ کہ مُصنّف کسی کیرکٹر کو کامیابی سے بیان نہیں کر سکے۔ انہوں نے مناظر بہت عُمدہ کھینچے ہیں۔ لیکن ان میں جان نہیں ڈال سکے۔ ہر چیز خاموش نظر آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمام عالم پر بیہوشی سے طاری ہے۔

سرور نے فسانہ عجائب میں جذبہ حُبِّ وطن سے متاثر ہو کر اہل دہلی پر چوٹیں کیں جن کا جواب "افسانۂ سروش سخن" میں خواجہ فخر الدین حسین سُخن دہلوی نے ۱۸۶۰ء میں دیا۔ پھر محمد جعفر علی شیون لکھنوی نے ۱۸۸۲ء میں "طلسم حیرت" لکھ کر "سروش سخن" کے مطاعن کا جواب لکھا۔

سرشار اور سرور سرشار نے مختلف کیرکٹروں اور سوسائٹیوں کے نمونے دکھلائے۔ اور ہر خاص و عام بات نہایت ظریفانہ انداز میں بیان کی جس سے رنگینی اور دلچسپی خُوب پیدا ہو گئی۔ برخلاف اس کے سرور کے ہاں سوسائٹی کے مرقعے اور کیرکٹر نگاری مفقود ہے۔ وہ ہر چیز پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ سرشار ہر بات کی جزئیات تک بیان کر دیتے ہیں۔ اور بحیثیت ناولسٹ کیرکٹر نگاری اور تفصیل جزئیات کو مقدم سمجھتے ہیں۔

سرور کی تصانیف سرور سلطانی، یہ شاہنامہ فردوسی کا ملخص ہے طرز عبارت فسانہ عجائب کی طرح مقفّٰی اور مسجّع ہے۔ یہ طرز تاریخ کے لئے مناسب نہیں۔ اس میں ہندوستان کی تاریخ پڑھنے کے قابل ہے (۲) شرر عشق اس میں سارس کی مادہ کا نر پرست ہونا بیان کیا ہے (۳) شگوفہ محبت۔ مہر چند کھتری کا پُرانا قصہ

نئے انداز میں (۴) گلزار سرور - فارسی کی حدائق العشاق کا ترجمہ، مذہبی رنگ کی کتاب ہے (۵) شبستان سرور۔ الف لیلہ کے چند قصّوں کا ترجمہ (۶) ایڈورڈ ہفتم کی شادی کے موقعہ پر سرور نے "نثر نثرۂ نثار" کے نام سے تہنیت نامہ لکھا (۷) انشائے سرور یعنی سرور کے خطوط اُن کی خاص طرز میں۔

اُردو نثاروں میں سرور کا مرتبہ سرور اپنی خاص طرز تحریر میں قدیم نثاروں میں نہایت بلند مرتبے کے مالک ہیں - ان کی طرز تحریر پُر تکلف اور پُر تصنع ہونے کی وجہ سے بعد میں متروک ہو گئی - کیونکہ کاروباری دُنیا میں اس قسم کی رنگین مسجع اور مقفّی عبارت کا کامیاب ہونا ناممکن تھا - سرور کی تصنیفات ان کے زمانے بھی ادبی حلقوں میں نہایت مقبول و مرغوب تھیں اور اب بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں - ان کے ذریعے اس وقت کی طرز تحریر اور سوسائٹی کے دلچسپ حالات معلوم ہوتے ہیں - سرور خوشنویسی - موسیقی اور شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے - مگر نثاری کے سامنے اور کمالوں نے فروغ نہیں پایا - ان کا کوئی دیوان نہیں - البتہ ان کے اشعار ان کی کتابوں میں جا بجا ملتے ہیں - شاعری میں وہ دہلی سکول کے متبع معلوم ہوتے ہیں - لکھنؤ کا مبالغہ اور تصنع ان کے ہاں بہت کم ہے -

مرزا غالب بحیثیت نثار پہلے ادبی دُنیا میں غالب شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے - لیکن انکی تصانیف اُردو فارسی نے ان کو اُردو اور فارسی دونوں کا بے مثل نثار ثابت کیا۔ **نثر اُردو کی تصانیف** زیادہ تر خطوط - رُقعات - تقاریظ اور دیباچوں پر مشتمل ہیں - تین مختصر رسالے لطائف غیبی - تیغ تیز اور نامہ غالب برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب میں ہیں - ایک ناتمام قصہ بھی ہے - جو مرنے سے پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان سب میں ان کے وہ خطوط اور تقریظیں جو عودِ ہندی اور اُردوئے معلّیٰ کے نام سے چھپی ہیں بہت زیادہ مقبول ہیں

اُردوئے معلّیٰ اور عودِ ہندی مرزا غالب نے اپنے خطوط میں لکھا ہے وہ ۱۸۵۰ء تک فارسی میں خط و کتابت کیا کرتے تھے - اس کے بعد انہوں نے اُردو میں خط لکھنے شروع کئے - حق یہ ہے کہ انہی پر جدید اُردو نثر کی بُنیاد قائم ہوئی - آج تک بہت سے مشہور ادیبوں اور نثاروں کے خطوط چھپ چکے ہیں - لیکن کوئی بھی ایسے دلچسپ اور برجستہ خط نہیں لکھ سکا -

مرزا کے رنگ میں کسی قسم کا تکلف اور تصنع نہیں - عبارت کی روانی اور سلاست سے معلوم ہوتا ہے کہ

قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ہر چند ان کی عبارت بے تکلف اور روزمرہ ہے۔ مگر پھر بھی ابتذال اور سوقیت پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک ادبی شان نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی تحریر میں تقریر کا مزہ آتا ہے۔ بعض خطوط بالکل مکالمہ کی صورت میں ہیں۔ بعض میں مکتوب الیہ کو غائب تصور کر لیتے ہیں۔ اور اظہار مطلب ایسی سحر آفرینی سے کرتے ہیں۔ کہ دل لطف اٹھاتا ہے۔ ادب اردو پر مرزا کا بڑا بھاری احسان یہ ہے کہ انہوں نے نثر اردو کو خشکی اور بدمزگی کے الزام سے بچا لیا۔

خطوط نویسی میں مرزا نے یہ خاص جدت پیدا کی۔ کہ لمبے لمبے بے معنی القاب ترک کر دیئے۔ وہ پنج آہنگ میں لکھتے ہیں "خطوط نویسی میں میرا طریقہ یہ ہے۔ کہ جب خط لکھنے کے لئے قلم و کاغذ اٹھاتا ہوں۔ تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے پکارتا ہوں اور اسکے بعد فوراً ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں۔ آداب و القاب کا پرانا طریقہ اور شکر و شکوہ و شادی و غم کا قدیم رویہ میں نے بالکل اٹھا دیا۔"

مرزا کی اس جدت سے قدما کی طویل اور غیر دلچسپ پر تکلف طرز تحریر کا خاتمہ ہو گیا۔ اگرچہ شروع شروع میں ان کے معاصرین اس بے تکلفانہ طرز کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن زمانہ کے امتداد کے ساتھ یہ طرز مطبوع خاص و عام ہو گئی۔

مرزا نے خطوط میں اکثر اپنے حالات لکھے ہیں۔ اس لئے ان سے خود نوشت سوانحعمری مرتب کی جا سکتی ہے[1] ان کے خطوط ان کی جزئیات زندگی کی بولتی چالتی تصویریں ہیں۔ جن سے احباب اور معاصرین کے تعلقات، ان کے نظریئے اور قدیم و جدید شعرا کے متعلق ان کے مخصوص خیالات معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا مذاق بھی سب سے نرالا ہے۔ بلکہ اہل یورپ میں بھی ان جیسی لطیف ظرافت مفقود ہے۔ ہاں ان کی ظرافت کی لطافت اور نزاکت کا پرتو ایڈیسن کی تحریروں میں کسی قدر پایا جاتا ہے۔

مرزا کے خطوط کے نمونے

(۱) "آہاہا میرا پیارا مرزا جہاری آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رامپور ہے دار السرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے۔ وہ اور کہاں ہے۔"

(۲) "آؤ میاں سید زادہ آزادہ دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے"

[1] مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب نے حال ہی میں مرزا کے خطوط اور کلام وغیرہ سے نہایت شاندار سوانحعمری تیار کی ہے ۱۲

(۳) "میری جان تو کیا کہہ رہا ہے بنئے سے سیانا سو دیوانا۔ صبر و تسلیم۔ توکل و رضا شیوہ صوفیا کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا۔"

(۴) "سید صاحب اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے۔ بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا اور میرن صاحب کو اپنا ہمزبان کر لینا۔"

مرزا کی قدیم طرز تحریر

مرزا اگرچہ خطوط میں سادگی اور سلاست کے دلدادہ تھے لیکن رواج کے موافق احباب کی کتابوں پر تقریظیں مسجع اور مقفیٰ عبارت میں لکھتے تھے۔ مولانا حالی اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں، کہ تقریظیں لکھوانے والے حضرات بغیر ان تکلفات کے خوش نہیں ہوتے تھے۔

نمونہ تقریظ

سبحان اللہ خدا کی کیا نظر فروز صنعتیں ہیں۔ تعالیٰ اللہ کیا حیرت آور قدرتیں ہیں، جو حدائق العشاق فارسی زبان سے اردو میں نگارش پاتا ہے۔ اس مقام پر یہ ہیچ میرز جو موسوم بہ اسد اللہ خاں اور مخاطب بہ نجم الدولہ اور متخلص بہ غالب ہے۔ خدائے جہان آفرین سے توفیق اور خلق سے انصاف کا طالب ہے۔ ہاں اے صاحبان فہم و ادراک سرور سحر بیان کا اردو کی نثر میں کیا پایہ ہے۔ اور اسی بزرگوار کا کلام شاہد معنی کے واسطے کیسا گراں بہا پیرایہ ہے۔ مجھ کو دعویٰ تھا۔ کہ انداز بیان اور شوخی تقریر میں فسانہ عجائب بے نظیر ہے۔ جس نے میرے دعوے کو اور فسانہ عجائب کی یکتائی کو مٹا دیا۔ یہ وہ تحریر ہے۔

کتب رسائل اسلامی سے اردو کو تقویت

مولوی سید احمد شہید بریلوی اور ان کے استاد شاہ عبد العزیز اور شاہ عبد القادر کی کوششوں سے اشاعت وہابیت کی زبردست تحریک[1] شروع ہوئی۔ اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت سی کتب اور رسائل لکھے گئے۔ اگرچہ وہ ہندی رنگ میں تھے۔ لیکن ان کی زبان صاف اور سلیس تھی۔ یہ تحریک بھی زبان اردو کے لئے مفید ثابت ہوئی۔

مولوی سید احمد شہید بریلوی

مولوی صاحب ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے علوم دینیہ کی تکمیل شاہ عبد العزیز اور شاہ عبد القادر کی خدمت میں کی۔ بہت قابل اور فصیح بیان تھے۔ ان کی بصیرت افروز تقریریں سن کر خاص و عام بکثرت مرید ہوتے تھے۔ پہلے دہلی میں تبلیغ کرتے رہے پھر ۱۸۲۰ء میں کلکتہ گئے اور وہاں سے ۱۸۲۲ء میں حج کو چلے گئے۔ پھر قسطنطنیہ گئے اور چھ برس تک ترکی کی سیاحت اور اپنے ہمخیالوں کی جماعت

---

[1] انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں یہ تحریک شروع ہوئی تھی ۱۲

پیدا کرتے رہے۔ اِس کے بعد دہلی آئے۔ یہاں کے مُسلمانوں کی حالت دیکھ کر ان کے دل میں اصلاح کا خیال پیدا ہوُا۔ وہ نہایت پُرجوش مُسلمان تھے۔ انہوں نے سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ ۱۸۲۶ء میں مولوی اسمٰعیل کو ساتھ لیکر پشاور گئے۔ کہتے ہیں ان کے مُرید ایک لاکھ سے زائد تھے۔ اور وہ اپنے مشن میں اتنے کامیاب تھے کہ سارا پشاور اُن کی مٹھی میں تھا۔ لیکن ان کے اصولوں کی سختی کی وجہ سے افغان وعدے سے پھر گئے۔ یہ حالت دیکھ کر مولوی صاحب اٹک کے اس پار پہاڑوں میں جا چھپے جہاں ۱۸۳۱ء میں سکھوں کے ایک دستہ کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

شاہ عبدالعزیز شاہ عبدالعزیز نے قرآن کی "تفسیر عزیزی" فارسی میں لکھی جس کا اب اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان کے بھائی شاہ عبدالقادر نے قرآن کا اُردو میں ترجمہ کیا اور مولوی سیّد عبداللہ نے ہگلی میں ۱۸۲۹ء میں چھپوایا۔ مولوی سید احمد شہید کی تنبیہ الغافلین انہی مولوی عبداللہ نے اُردو میں ترجمہ کر کے ۱۸۳۰ء میں ہگلی میں شائع کی تھی۔ مولوی اسمٰعیل صاحب اور مولوی سید احمد صاحب نے بھی بہت سے رسالے اس زمانہ میں اشاعت دین کے لئے لکھے جن سے زبان اُردو کو بہت تقویت پہنچی۔

چھاپہ کی ابتدا چھاپے نے بھی اُردو کی اشاعت اور ترقّی میں بہت مدد دی۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ایک چھاپہ خانہ کھُلا جس میں ڈاکٹر گلکرسٹ اور ان کے منشیوں کی تصانیف چھپتی تھیں۔ مگر ان کی طباعت میں روپیہ بے انتہا خرچ ہوتا تھا۔ اِس لئے اِس مطبع کو بند کرنا پڑا۔ اِس زمانے کے ٹائپ کے مروّجہ حروف بھی نہایت بھدّے اور بدنما تھے۔

اسی زمانے میں سیرام پور (بنگال) کے پادریوں نے ایک پریس جاری کیا۔ اِس میں مختلف ہندوستانی زبانوں کی کتابیں چھپیں۔ ۱۸۱۲ء میں اس مطبع کو آگ لگی اور اکثر کتابیں جل گئیں۔ ۱۸۳۷ء میں ایک لیتھو کا چھاپہ خانہ دہلی میں قائم ہوُا۔ اس میں پُرانی کتابیں انگریزی اور غیر ملکی زبانوں کے ترجمے اور مختلف رسائل چھپے۔ غازی الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں بھی ایک ٹائپ کا مطبع صرف کثیر سے کھولا گیا۔ جہاں سے ہفت قلزم، مناقب الحیدریہ (عربی) محامد حیدری (فارسی) گلدستہ محبت (فارسی) پنجسورہ بخط طغرا تاج اللغات (عربی) وغیرہ شائع ہوئیں۔

۱۸۳۰ء میں مسٹر آرچر نے کانپور میں لیتھو کا پریس کھول رکھا تھا۔ نصیر الدین حیدر کے حکم سے لکھنؤ آکر انہوں نے ایک اور مطبع جاری کیا۔ اس میں ۱۸۳۱ء میں سائنس کے فوائد پر ایک کتاب چھپی

جو لارڈ بروہم کی کتاب کا ترجمہ تھی۔ یہ ترجمہ نہایت سلیس اُردو میں ہے۔ سب سے پہلے لکھنؤ کی لیتھو کی کتاب شرح الفیہ تھی۔ ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ میں تقریباً بارہ چھاپے خانے کھل گئے۔ جن میں مطبع میر حسن اور مصطفائی بہت مشہور تھے۔ ۱۸۴۹ء میں منشی کمال الدین حیدر میر منشی احمد شاہی نے خاندان شاہی کی تاریخ لکھی جو بادشاہ کو پسند نہ آئی۔ اِس لئے اِس کتاب کی طباعت روک دی گئی۔

اِس عہد کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے۔ کہ منشی نولکشور نے لکھنؤ میں اپنا مطبع کھولا جس کی بدولت عربی فارسی سنسکرت اور ہندی کی بہت سی نایاب کتب طبع ہوئیں۔ اِس مطبع سے مُلک کے تمام طبقوں کو یکساں فائدے پہنچے اور تعلیم و ترقی میں خوب ارزانی ہوئی۔

اُردو رسائل اور اخبارات

طباعت کی آسانیوں سے اُردو کے رسائل۔ جرائد اور اخبارات بکثرت نکلنے لگے گویا ہندوستانیوں پر دُنیا بھر کی اقتصادی اور تمدنی معلومات کا دروازہ کھل گیا۔ اور ترقیوں کی راہیں فراخ ہو گئیں۔ انگریزی کتابوں کے تراجم نے یورپ کی طرز انشا پردازی کو اُردو دانوں کے سامنے پیش کیا جس سے نثر و نظم میں انقلاب آنے لگا۔ ۱۸۳۲ء میں سرکاری دفاتر کی زبان فارسی سے اُردو ہوئی اور فارسی عربی وغیرہ کی تمام مروّجہ اصلاحات اُردو میں آگئیں۔

مغربی طرز تحریر سے سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ مسجع اور مقفی عبارت موقوف ہو گئی اور بجائے الفاظ کے نفس مضمون پر زور طبع صرف ہونے لگا۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجمے جو درسی ضرورت کے لئے کئے گئے۔ ان کی زبان نہایت صاف اور سلیس تھی۔ اب اُردو فارسی سے بے نیاز ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی۔ اِس وقت سر سید نے اپنے مساعی جمیلہ سے اُردو زبان کی بہت گرانقدر خدمات انجام دیں۔

سر سید احمد خاں
۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء

جواد الدولہ۔ عارف جنگ۔ سر سید احمد خاں بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی مسلمانوں کے مصلح اعظم جلیل القدر مدبر۔ فلسفی اور مُصنّف، جن کی قابلیت اور مقناطیسی اثر سے ہندوستان کے بہت بڑے بڑے علماء و فضلاء ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے ادبی کارناموں سے اُردو ادب خوب مالامال ہوا۔

سید احمد دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور خاندان کے ممبر تھے۔ ان کے بزرگ عرب سے ایران ہوتے ہوئے شاہجہان کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور یہاں آتے ہی ممتاز عہدے پائے۔

عالمگیر ثانی نے سید صاحب کے دادا کو جواد الدولہ کا خطاب دیا۔ جو حسن اتفاق سے سید صاحب کو بھی ملا۔ ان کے والد میر تقی نہایت قانع بزرگ تھے۔ اکبر شاہ ثانی نے اُن کو عہدۂ وزارت دیا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ سید صاحب کو ان کی والدہ عزیز النساء بیگم نے تعلیم و تربیت دی تھی۔ اور خوش قسمتی سے انہوں نے غالب، صہبائی، آزردہ، شیفتہ اور مومن وغیرہ کا زمانہ پایا تھا۔ وہ غالب کو چچا کہا کرتے تھے۔ اور ان سے بہت ارتباط رکھتے تھے۔

سید صاحب ۱۸۳۸ء میں دہلی میں سر رشتہ دار ہوئے۔ ۱۸۳۹ء میں نائب میر منشی اور ۱۸۴۱ء میں امتحان منصفی پاس کر کے منصف ہو گئے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دہلی کے صدر امین رہے۔ اسی زمانے میں آثار الصنادید لکھی جس میں دہلی کے آثار قدیمہ، علماء فضلا اور شعرا کا ذکر ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی اور فرنچ میں بھی ہو چکا ہے۔ اس کے بعد سید صاحب نے جلاء القلوب۔ تحفہ حسن۔ تحصیل فی جرح السائل۔ فوائد الافکار۔ قول متین۔ کلمۃ الحق۔ راہ سنت۔ سلسلۂ ملوک ہند۔ ترجمہ کیمیائے سعادت وغیرہ تصنیف کیں۔

۱۸۵۵ء میں سید صاحب بجنور تبدیل ہو گئے۔ وہاں تاریخ بجنور لکھی۔ اور آئین اکبری کی تصحیح اور تحشی بھی کی۔ غدر ۱۸۵۷ء کی خدمات کے صلے میں سید صاحب کو ایک علاقہ دیا گیا۔ لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ۱۸۵۸ء میں "بغاوت ہند" کے نام سے ایک پمفلٹ اور "وفادار مسلمانان ہند" کے نام سے ایک اور کتاب لکھی۔ ۱۸۶۰ء میں ان کی تفسیر بائیبل شائع ہوئی جس کو پرانے لوگوں نے ناپسند کیا۔ لیکن اہل یورپ نے اس کی بڑی قدر کی۔

۱۸۶۲ء میں سید صاحب غازی پور بدل کر گئے۔ وہاں انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ اس کا مقصد اہل یورپ کے خیالات سے اہل ہند کو واقف کرنا تھا۔ ڈیوک آف آرگائیل اس کے پیٹرن (مربی) اور گورنر پنجاب و بنگال اس کے وائس پیٹرن تھے۔ ایک زمانہ میں یہ سوسائٹی بہت مقبول رہی۔ اس کے ممبروں نے زراعت، فلاحت اور اقتصادیات پر بڑے کارآمد رسالے لکھے۔

۱۸۶۴ء میں سید صاحب کے ساتھ ان کی سوسائٹی بھی علیگڑھ منتقل ہو گئی۔ ۱۸۶۱ء میں انہوں نے ایک انگریزی سکول مراد آباد میں اور ۱۸۶۴ء میں اسی قسم کا ایک اور سکول غازی پور میں قائم کیا۔ مختلف مقامات پر انگریزی تعلیم اور اس کے فوائد پر کامیاب لیکچر دیئے۔ ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی اور اپنی سائنٹیفک سوسائٹی کی طرف سے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ نکالا۔ اس میں ان کے اپنے مضامین نکلتے اور

اچھے اچھے مضامین انگریزی اخباروں سے ترجمہ ہوتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں ان کا تبادلہ بنارس کا ہوگیا۔ لیکن پھر بھی تعلیمی سرگرمیاں برابر جاری رہیں۔ اِس زمانے میں انہوں نے گورنر جنرل کو ہندوستانی یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے ایک میموریل بھیجا۔ ۱۸۶۶ء میں انہوں نے "رسالہ احکام طعام با اہل کتاب" لکھا۔ اِس رسالے سے مذہب پرستوں میں ایک قسم کا ہیجان پیدا ہوگیا اور سب ان کے خلاف ہوگئے۔ ۱۸۶۹ء میں وہ اپنے بیٹے مسٹر محمود (جو بعد میں الہ آباد ہائیکورٹ کے جج ہوئے) کے ساتھ انگلستان گئے وہاں کے تعلیمی اور تمدنی حالات دیکھنے کے بعد ان کے دل میں آکسفورڈ اور کیمبرج کالجوں کی شان کا ایک رہائشی کالج ہندوستان میں کھولنے کا خیال پیدا ہوا۔ ولایت میں ان کو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اسی زمانے میں انہوں نے سر ولیم میور کی لائف آف محمدؐ کا نہایت دلیرانہ جواب لکھا۔ ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آئے۔ اور اپنا ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اِس رسالے میں ایسے مذہبی تمدنی اور تعلیمی مضامین شائع ہوئے۔ جن کے مُطالعہ سے مُسلمانوں کے مذہبی خیالات میں وسعت اور مُلاؤں کا اقتدار کم ہوگیا۔ اسی زمانہ میں سرسید نے قرآن کی تفسیر لکھی۔ اس میں بائیبل کے قصص سے بعض باتوں پر روشنی ڈالی۔ دوزخ بہشت اور معراج پر غیر اقوام کے اعتراضات کا جواب دیا۔ نیز ضعیف اور غیر معتبر احادیث سے احتراز کی ہدایات کیں۔ ان باتوں کی بدولت پُرانے خیالات کے مُلاؤں نے سرسید پر کفر۔ الحاد اور نیچری کے فتوے لگائے اور بہت سے اخبارات اور رسائل ان کے خیالات کا خاکہ اُڑانے کے لئے نکلے۔ اخبار اودھ پنچ میں ان کے خلاف ہمیشہ مضحکہ خیز مضامین نکلتے رہے۔ لیکن سرسید پر ان کا کچھ اثر نہ پڑا۔ ۱۸۷۶ء میں وہ سرکاری ملازمت سے کنارہ کش ہوئے اور بقیہ عمر اپنے محبوب کالج کی ترقی میں صرف کردی۔ ۱۸۹۸ء میں ایک طویل اور کامیاب زندگی بسر کرکے اِس دُنیا سے راہئی مُلک عدم ہوئے۔

سرسید کی طرزِ تحریر اُردو جرائد نگاروں میں سرسید کا مرتبہ بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔ ان کی طرزِ تحریر زور دار صاف اور سادہ ہے۔ اس میں کسی قسم کی عبارت آرائی نہیں محض نفسِ مضمون پر زور دیا گیا ہے۔ سید صاحب قواعد صرف و نحو اور اصول انشا پردازی کی مطلق پرواہ نہ کرتے تھے۔ اسی اجتہاد نے ان کی شہرت اور قابلیت کو چار چاند لگائے۔ ان کی سادہ طرزِ تحریر نے بیدل اور ظہوری کی مسجع اور مقفیٰ طرزِ تحریر کو ضرب کاری لگائی اور یہ ثابت کردیا کہ سادہ اور بے تکلف عبارت میں

بہت زیادہ خوبیاں ہیں۔ سادہ اور سلیس عبارت لکھنے میں وہ ایسے مشاق تھے۔ کہ دقیق ترین مضامین نہایت بے تکلفی اور سادگی سے لکھ دیتے تھے۔ مولانا حالی ان کو نثر اردو کا مورث اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں۔ کہ بے تکلف اور سادہ طرز تحریر کا نقش اول مرزا غالب کے ہاتھوں صورت پذیر ہوا تھا جن کو سرسید چچا کہا کرتے تھے۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ چچا غالب ہی سے سرسید نے یہ رنگ اڑایا ہو۔

سرسید کے رفقا

سرسید نے اپنے حواریوں کی ایک نہایت پر جوش جماعت پیدا کر لی تھی۔ اس جماعت نے ہندوستان میں اپنے ادبی اور سیاسی کارناموں سے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ ان لوگوں میں نواب محسن الملک نواب وقار الملک۔ مولوی چراغ علی۔ منشی ذکاء اللہ۔ مولانا حالی۔ شبلی نعمانی۔ مولانا نذیر احمد اور مولوی زین العابدین اپنے اپنے فن کے استاد تھے۔ اور سرسید کے اثر سے ان تمام بزرگوں کی کوششیں مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کے لئے وقف ہو گئی تھیں۔

نواب محسن الملک ۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۷ء

سید مہدی علی خاں اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ معمولی تعلیم پانے کے بعد دس روپے ماہوار پر کلرک ہو گئے۔ ترقی کر کے ۱۸۵۷ء میں اہلمد پھر سررشتہ دار اور ۱۸۶۱ء میں تحصیلدار ہوئے۔ اپنی خدمات کو نہایت قابلیت سے انجام دینے کے علاوہ قانون مال اور فوجداری پر دو مشہور کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۸۶۲ء میں ڈپٹی کلکٹری کا مقابلے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۶۷ء میں مرزا پور کے ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ ان کی شہرت سن کر سر سالار جنگ اول نے ۱۸۷۴ء میں حیدرآباد بلایا اور انسپکٹر جنرل مالیات مقرر کیا۔ محکمۂ بندوبست حیدرآباد میں مفید اصلاحیں کرنے کے علاوہ انہوں نے بجائے فارسی کے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ ۱۸۷۶ء میں ریونیو سیکرٹری اور ۱۸۸۴ء میں فنانشل اور پولیٹیکل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اور سرکار نظام سے محسن الدولہ محسن الملک میر نواز جنگ کا خطاب پایا۔ انہوں نے سفر انگلستان بھی کیا۔ آخر کار سیاسی سازشوں کے سبب سے آٹھ سو روپے ماہوار پنشن لے کر علی گڑھ چلے آئے۔ جہاں بقیہ عمر تعلیمی خدمات میں صرف کی۔ ۱۹۰۷ء میں انتقال فرمایا۔ اور سرسید کے برابر علی گڑھ میں دفن ہوئے۔

سرسید سے ان کے بہت پرانے مراسم تھے۔ مشہور ہے۔ شروع شروع میں مداخلت فی الدین کی وجہ سے وہ سرسید کو کافر سمجھتے رہے۔ لیکن تبادلۂ خیالات سے ان کے مداح اور معاون ہو گئے۔ ان کے

بہت سے مذہبی اور تاریخی مضامین تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے۔جو ان کی قابلیت اور درد قومی کی شہادت دیتے ہیں۔مولانا حالی کا قول ہے کہ محسن الملک نے مسلمانوں کے دلوں کو ان کے بزرگوں کے کارنامے یاد دلا کر ابھارا۔اور جو کچھ انہوں نے سرسید کی تائید میں لکھا۔وہ بڑے استدلال اور استناد سے لکھا۔

محسن الملک کی طرز تحریر کی مولانا شبلی نے بہت تعریف کی ہے۔ان کی عبارت نہایت زور دار ہے صفائی حسن بیان اور سلاست میں کہیں فرق نہیں آتا۔اگر کہیں پرانی طرز پر عبارت آرائی کرتے ہیں، تو وہ بھی بری معلوم نہیں ہوتی۔بلکہ حسن عبارت اس سے بڑھ جاتا ہے۔پر تکلف عبارت زیادہ نہیں لکھتے۔ان کے مضامین اکثر آسان اور سلیس اردو میں ہوتے تھے۔"آیات بینات" انکی مذہبی رنگ کی تصنیف ہے۔

نواب وقار الملک
سنہ ۱۸۳۹ء تا سنہ ۱۹۱۷ء

مولوی مشتاق حسین شیخ فضل حسین کے بیٹے، ایک کمبوہ خاندان میں امروہے کے مضافات میں پیدا ہوئے۔زمانہ قحط میں وہاں کچھ سرکاری خدمات انجام دیں۔ رفتہ رفتہ سر رشتہ دار اور منصرم صدر الصدور ہو گئے۔کچھ مدت سرسید کے ماتحت بھی کام کرتے رہے پھر سرسید کی سفارش سے حیدر آباد میں ناظم دیوانی ہوئے۔سازشوں کی وجہ سے ان کو بھی حیدر آباد چھوڑنا پڑا۔مگر پھر بلائے گئے۔سرکاری کاموں میں مفید اصلاحیں کیں جنکے صلے میں وقار الدولہ وقار الملک کا خطاب ملا۔سنہ ۱۸۹۱ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہو کر بقایا عمر علی گڑھ کالج کی خدمات میں صرف کی۔

نواب صاحب خلافت علیگڑھ کے خلیفہ ثانی کہلاتے تھے۔سائنٹیفک سوسائٹی کے ممبر اور تہذیب الاخلاق کے مہتمم بھی رہے۔تہذیب الاخلاق میں بڑے کار آمد مضامین لکھے۔ان کے علاوہ "فرنچ ریوولیوشن اینڈ نپولین" کا اردو میں ترجمہ کیا۔اس کام میں منشی گلزاری لال اور لالہ گنگا پرشاد نے بھی کچھ حصہ لیا۔یہ ترجمہ سرگذشت نپولین بوناپارٹ کے نام سے سنہ ۱۸۷۰ء میں نولکشور پریس میں چھپا۔

مولوی چراغ علی
سنہ ۱۸۴۴ء تا سنہ ۱۸۹۵ء

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی کے والد مولوی محمد بخش میرٹھ۔سہارنپور اور پنجاب میں سرکاری ملازم رہے۔ان کے چار بیٹے تھے۔جن میں چراغ علی سب سے بڑے تھے۔ چراغ علی معمولی تعلیم کے بعد ضلع بستی کے محکمہ خزانہ میں بیس روپے ماہوار پر ملازم ہوئے۔سنہ ۱۸۶۲ء میں عدالت جوڈیشل کمشنر اودھ کے ڈپٹی منصرم اور پھر سیتاپور کے تحصیلدار ہوئے۔سنہ ۱۸۷۶ء میں سرسید کی

کوشش سے حیدرآباد گئے۔ جہاں محسن الملک کے ماتحت چار سو روپے ماہوار پر نائب معتمد مال ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کرکے ریونیو اور پولٹیکل سیکرٹری ہوئے اور پندرہ سو روپے ماہوار تک تنخواہ لی۔

مولوی صاحب نہایت عالم فاضل بیدار مغز۔ غیر متعصب اور دیندار شخص تھے۔ کتب بینی کا اِس قدر شوق تھا کہ غیر ممالک سے بھی کتابیں منگاتے۔ ابتدا سے مذہبی رنگ کی مضمون نگاری کا ذوق تھا۔ پادریوں سے کامیاب مناظرے کرتے تھے۔ ان کی تصانیف بہت ہیں۔ بہت سی کتابیں حیدرآباد کے انتظامی معاملات کے متعلق بھی لکھیں۔ ان کے علاوہ "تحقیق الجہاد" "مسلمانوں نے اپنے زمانۂ حکومت میں کیا کیا اصلاحات کیں"، "رسول برحق"۔ اسلام کی دُنیاوی برکتیں۔ قدیم قوموں کی مختصر تاریخ وغیرہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

مولوی صاحب کے وہ مضامین جو تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے زوردار اور دلنشین تو ہیں، لیکن ادبی شان کے نہیں۔ خطوط مجموعہ رسائل" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ چند انگریزی اور اُردو پمفلٹ بھی اخلاقی مسائل پر لکھے ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۲۹ء تا ۱۹۱۰ء

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کا سنہ ولادت (ظہور اقبال ۱۲۴۵ھ) سے نکلتا ہے۔ ان کے والد کا نام مولانا محمد باقر تھا۔ سکینہ صاحب نے باقر علی اور باقر حسین غلط لکھا ہے۔ مولانا محمد باقر شمالی ہند میں اپنی مضمون نویسی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ وہ اُستاد ذوق کے دلی دوست تھے۔ اسی لئے آزاد نے شروع سے ذوق کی بابرکت صحبت میں پرورش پائی۔ آزاد عربی فارسی اپنے والد سے پڑھ کر دلی کالج میں داخل ہوئے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب (رائے بہادر) مولوی نذیر احمد۔ مولانا حالی۔ مولوی ذکاء اللہ وغیرہ ان کے ہم مکتب تھے۔ حسن اتفاق دیکھئے یہ سارے دوست شمس العلماء کے خطابات سے سرفراز ہوئے اور ادبی دُنیا میں آفتاب و ماہتاب ہو کر چمکے۔

مولانا آزاد کو شاعری کا بچپن سے شوق تھا۔ وہ ذوق کے ساتھ بڑے بڑے مشاعروں میں جاتے اور اُستادوں کا کلام سُنتے تھے۔ افسوس کہ ان پُرلطف صحبتوں کو ہنگامۂ غدر نے اس وقت منتشر کر دیا، جب ان کی عمر ۲۷ یا ۲۸ برس کی تھی۔ والد غدر میں شہید ہوئے۔ اور آزاد کو دہلی سے نکلنا پڑا۔ اس وقت بھرے گھر میں سے انہوں نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ فقط اُستاد کے کلام کے

پرزوں کو باندھا اور گھر سے نکل گئے۔ ان کا اپنا کلام غدر میں ضائع ہو گیا۔ اور اُستاد کے کلام کو وہ حرز جان بنائے پھرے۔

سکسینا صاحب نے لکھا ہے کہ ہنگامہ غدر فرو ہونے کے بعد مولانا آزاد کسی فوجی سکول میں مُلازم ہو گئے تھے۔ یہ بیان بالکل غلط ہے۔ وہ دہلی سے نکل کر لکھنؤ گئے۔ وہاں سے جینڈ آ کر تھوڑی مُدت مُلازمت کی۔ جینڈ سے لدھیانہ آئے۔ وہاں ارسطو جاہ مولوی رجب علی صاحب کے پریس میں پہلے کچھ دنوں کتابت کی اور بعد میں چار سال تک مینجر رہے۔ لدھیانہ سے لاہور آ کر ڈاک خانہ میں پندرہ روپے ماہوار پر سرشتہ دار ہوئے۔

میجر فلر محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ وہ علوم مشرقی سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے آزاد کی زباندانی اور قابلیت علمی کو بہت پسند کیا۔ اور ابتدائی درسی کتابیں لکھنے کو دیں، جن کو انہوں نے بہت محنت سے تیار کیا۔ اردو کی پہلی۔ دوسری۔ تیسری کتاب اور فارسی کی پہلی۔ دوسری۔ تیسری اور قصص ہند۔ رسوم ہند وغیرہ اسی زمانہ کی مشہور اور مقبول تصانیف ہیں۔

اس زمانے میں لاہور یونیورسٹی مشرقی علوم کی ترویج کے لئے کھولی گئی تھی۔ محکمۂ تعلیم سے مولنٰا کی خدمات اس درسگاہ کے لئے حاصل کر لی گئیں اور مولنٰا اُدھر سے اِدھر آ گئے۔ بعد میں مولنٰا گورنمنٹ کالج میں فارسی عربی کے پروفیسر ہو گئے اور وہیں سے پنشن پائی۔

۱۸۶۵ءمیں مولانا آزاد پنڈت من پھول کی معیت میں ایک سفارتی مشن پر کابل اور بخارا گئے۔ پھر ایک دفعہ ۱۸۶۵ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۸۸۳ء میں ایران کی سیاحت کی۔ اس سفر نے جدید فارسی سے ان کو آشنا کیا۔ فارسی ادب سے پہلے ہی خاص دلچسپی تھی۔ فارسی زبان کے متعلق ان کی تصانیف نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہیں۔

میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیم ہوئے۔ اہنیں اُردو زبان سے بہت دلچسپی تھی، مولنٰا آزاد نے ۱۸۷۴ء میں ان کو اس بات پر آمادہ کیا۔ کہ ان کی سرپرستی میں ایک ایسا مشاعرہ قائم کیا جائے جس کا مقصد اُردو شاعری کی مُبالغہ آمیزی اور تصنع کو حقیقت اور اصلیت سے بدلنا ہو۔ چنانچہ یہ مشاعرہ قائم کیا گیا۔ اس میں بجائے مصرع طرح کے نیچرل مضامین دیئے جاتے تھے۔ شروع شروع میں اس جدت کی سارے ہندوستان میں مخالفت ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک سال بعد یہ مشاعرہ

بند کرنا پڑا۔ لیکن مولانا آزاد ہمیشہ اپنے اس مشن کی تبلیغ کرتے رہے۔ آخر کار یہ رنگ ایسا مقبول ہوا، کہ پرانی شاعری کو لوگ بھول گئے۔ اور اس جدید طرز میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

کرنل ہالرائڈ نے آزاد کو اتالیق پنجاب (سرکاری اخبار) کا سب ایڈیٹر پچھتر روپے ماہوار پر مقرر کر دیا تھا جس کے ایڈیٹر منشی پیارے لال آشوب تھے۔ اس اخبار کے بند ہونے کے بعد پنجاب میگزین نکلا۔ آزاد اس کے بھی سب ایڈیٹر ہوئے۔

۱۸۸۷ء میں مولانا آزاد کو ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقعہ پر تعلیمی اور ادبی خدمات کے صلے میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اس زمانے میں اپنی پیاری بیٹی کی موت سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کے دماغ پر سخت صدمہ پڑا۔ سیر ایران کے دیباچے میں مولانا نے لکھا ہے۔ کہ میری بیٹی تصنیف و تالیف میں میرا دایاں ہاتھ تھی۔ اس پر سفر کی تکالیف اور دماغی محنت نے دماغ کو بالکل بیکار کر دیا۔ ۱۸۹۰ء میں وہ اس دکھوں بھری دنیا سے تمام علائق قطع کر کے بالکل آزاد ہو گئے۔ آزاد کا یہ دیوانہ پن عام قسم کا دیوانہ پن نہیں تھا۔ بیس سال تک یہی حالت جذب ان پر طاری رہی لیکن اس حالت میں بھی ان کے قلم نے دم نہیں لیا۔ اس عرصے میں انہوں نے سینکڑوں چھوٹے بڑے رسالے لکھے۔ جن میں سے جانورستان۔ فلسفہ الٰہیات اور سپاک و نماک وغیرہ چھپ چکے ہیں۔

تصانیف فارسی ریڈریں ۲ حصے۔ اردو ریڈریں ۳ حصے۔ اردو کا قاعدہ۔ قواعد اردو قصص ہند جامع القواعد رسوم ہند۔ آب حیات۔ نیرنگ خیال نظم آزاد۔ خمکدۂ آزاد۔ قند پارسی نصیحت کا کرن پھول سخندان فارس۔ دیوان ذوق۔ دربار اکبری۔ نگارستان پارس۔ سپاک و نماک۔ جانورستان۔ فلسفہ الٰہیات مجموعہ مکتوبات وغیرہ۔

ریڈریں اور سکول کی کتابیں ان سب کی عبارت نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔ یہ کتابیں ہندیوں کے لئے لکھی تھیں۔ اور حقیقتاً وہ بہت مفید ثابت ہوئیں۔ ان میں سے بعض اب تک سکولوں میں رائج ہیں۔ قصص ہند میں تاریخ ہند کے مشہور واقعات نہایت زوردار عبارت میں لکھے ہیں۔ یہ کتاب طلبا میں بیحد مقبول ہے۔ اس کے بیشمار ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ بچے اس کے دلچسپ واقعات سے لطف اٹھاتے اور ادبی مذاق کے لوگ اس کی طرز تحریر کے عاشق ہیں۔ جملوں کا توازن عبارت کی چستی۔ الفاظ کی شان اور پر زور طرز تحریر سے اس کو تاریخی کتابوں میں نہایت ممتاز حیثیت حاصل ہے

آب حیات آب حیات مولانا کی بہترین تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ اس میں زبان اردو کی تاریخ اور

مشہور شعرا کے حالات ان کے کلام کے نمونے اور ان پر دلچسپ اور فاضلانہ تنقیدیں ہیں۔ یوں تو شعرا کے بہت سے تذکرے موجود تھے۔ لیکن اس سے پہلے اس قسم کا تذکرہ کسی نے نہیں لکھا تھا۔ وہ ایک خزانۂ معلومات ہے جس سے بعد کے مصنفین نے بہت کچھ حاصل کیا۔ آب حیات لکھ کر مولانا نے اُردو ادب میں ایک جادو طرز تحریر کا اضافہ کیا جو حالی کی نثر کی طرح سادہ اور عاری از زیب و زینت نہیں اور نہ مولوی نذیر احمد کی نثر کی طرح ثقیل ہے۔ آزاد کی نثر زوردار اور سب سے جدا رنگ رکھتی ہے۔ اس میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں۔ جو احاطۂ بیان سے باہر ہیں۔ فقط دل ہی ان سے لطف اُٹھاتا ہے۔ سکسینا صاحب لکھتے ہیں "یہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ مولانا نے اپنے جوشِ شوق میں تاریخی مواد کو غور و خوض سے نہیں دیکھا۔ غیر موثق اور غیر معتبر حوالوں کی بنیاد پر سر بفلک عمارتیں کھڑی کر دی ہیں۔ اور بعض جگہ دلچسپی پیدا کرنے کے لئے واقعات میں کمی بیشی اور تبدیلی تک کو جائز رکھا ہے۔ اکثر جگہ جانب داری کا الزام بھی مصنف پر عائد ہوتا ہے مثلاً اپنے اُستاد ذوق کی بے حد تعریف اور غالب کے کمالات سے نسبتاً بے پروائی۔ مرزا دبیر کے خاندان کو کم کر کے دکھانا۔ آتش کے آخری زمانہ کے عبرت انگیز حالات وغیرہ اگر غلط نہیں تو مشکوک ضرور ہیں"۔

واقعی کچھ مدت سے یہ خیالات یقین کی حد کو پہنچ گئے تھے لیکن حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی نے اُستاد گرامی حضرت پروفیسر حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کی زیر نگرانی تذکرہ میر قاسم چھپوایا ہے۔ اس تذکرہ کو پڑھنے سے یہ شکوک بالکل دُور ہو جاتے ہیں۔ کہ آزاد نے واقعات میں کس قسم کی کمی بیشی کو روا رکھا ہے۔ تذکرۂ قاسم اس زمانہ کا نہایت معتبر اور قابل اعتماد تذکرہ ہے جو آب حیات کا ماخذ ہے اس کے علاوہ تذکرہ شورش سے بھی آب حیات میں بہت سے واقعات نقل کئے گئے ہیں جو ابھی تک کہیں سے برآمد نہیں ہوا۔ تذکرۂ قاسم کے چھپ جانے سے آب حیات کی تاریخی خوبیاں اور بھی نمایاں ہو گئی ہیں۔ اور اب کسی کو اس قسم کے اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں رہی۔

اُستاد ذوق کو غالب سے بڑھانا بھی کسی طرح قابل اعتراض نہیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں شہرت اور مقبولیت ذوق ہی کو حاصل تھی۔ یہی بات انیس اور دبیر پر بھی صادق آتی ہے۔ آج سے پچاس برس پہلے کے حالات کا ہم صحیح جائزہ نہیں لے سکتے۔ اگر ہم ان باتوں میں دخل دیں تو ہمیں کچھ کا کچھ نظر آتا ہے میر تقی کے متعلق جس قدر اعتراض تھے، ان کے جوابات بھی تذکرہ قاسم سے مل جاتے ہیں۔ اگرچہ آتش کی

آخری حالت کی مجالس رنگین اور تذکرہ میر قاسم سے تصدیق نہیں ہو سکی لیکن اُمید ہے کہ مستقبل قریب میں تذکرۂ شورش مل جائیگا۔ اور یہ بیان بھی ثبوت کو پہنچ جائیگا۔ تذکرہ میر قاسم دیکھنے کے بعد یہ صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ مولانا آزاد نے تاریخی واقعات نہایت ایمانداری سے نقل کئے ہیں۔ اور انکی رنگینئ عبارت۔ نیز جوش اور شوق نے ذراسی تبدیلی کو بھی روا نہیں رکھا۔

سکسینا صاحب یہ بھی لکھتے ہیں۔ کہ اس قسم کی اگر اور بھی غلطیاں نکل آئیں تو اس سے ہماری رائے میں آب حیات کی اصل خوبی اور قدر و قیمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کیونکہ اُردو میں تنقید کا صحیح معیار اسی کتاب سے قائم ہوا ہے۔ اور حالی کی یادگار غالب اسی کے مُطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ بحیثیت ایک قدیم تذکرہ خزانۂ واقعات وحکایات اور ناقابل تقلید کتاب ہونے کے یہ کتاب ہمیشہ آپ ہی اپنا جواب رہے گی۔

نیرنگ خیال یہ ایک بالکل جدید رنگ کی کتاب ہے جس میں خیالی افسانے ہیں اور خواب وخیال کے پردے میں نہایت عُمدہ اخلاقی نتائج نکالے ہیں۔ یہ کتاب دو حصّوں میں ہے۔ آزاد نے اپنے قصّوں کی بُنیاد زیادہ تر یونانی تصاویر پر رکھی ہے۔ ان سے مصنف کی یونانی علم الاصنام کی واقفیت کا پتہ چلتا ہے یہ کتاب بھی ڈاکٹر لائٹنر کی ترغیب سے لکھی تھی۔ اس کی عبارت اور طرز بیان نفس مضمون سے زیادہ دلچسپ ہے۔ حق یہ ہے کہ نثر میں نظم کا لُطف آتا ہے۔

سخندان فارس یہ کتاب علم فلالوجی پر اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں فارسی اور سنسکرت کو متحدالاصل ثابت کیا گیا ہے۔ ایران اور ہندوستان کے رسم و رواج کا مقابلہ بھی نہایت دلچسپ ہے جو مُصنّف کی سیاحت ایران اور علمی مکاشفات کا پتہ دیتا ہے۔ اِس کتاب کو نگارستان فارس کے بغیر مکمل نہیں کہا جاسکتا جس میں آزاد نے فارسی شعرا کے حالات اور انتقاد لکھے ہیں۔

قندپارسی اور نصیحت کا کرن پھول قندپارسی جدید فارسی کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس میں مولانا کے سفر ایران کے حالات بھی ملتے ہیں۔ نصیحت کا کرن پھول ایک مکالمہ ہے۔ جو نصائح کے پیرائے میں بچیوں اور عورتوں کے لئے نہایت آسان اُردو میں لکھا ہے۔

دیوان ذوق اس کتاب کی ترتیب و تالیف سے مولٰنا نے ادب اُردو کی بیش بہا خدمات کے علاوہ اپنے اُستاد اور ان کے کلام کو گمنامی سے بچایا ہے۔ مولٰنا کے دلچسپ نوٹوں نے ذوق کے اشعار کو مزید

دلچسپ بنا دیا ہے۔ اور ان میں ایک "رومان" کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

دربارِ اکبری یہ ضخیم بالشان تصنیف اکبر بادشاہ کے عہد اور اس کے اراکین سلطنت کے حال میں ہے۔ اس کی عبارت اپنے رنگ میں لاجواب ہے سیکینا صاحب کا یہ خیال غلط ہے۔ کہ اس پر نظر ثانی نہیں ہو سکی۔ اس کتاب میں عہد اکبری کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔ کہ تمام مناظر جیتی جاگتی تصویروں کی طرح آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے۔

دیگر تصانیف سپاک ونماک اور جانورستان اُس زمانہ کی تصانیف ہیں جب مولانا مجذوبیت کی ادبی زندگی بسر کرتے تھے۔ سپاک ونماک میں متصوفانہ خیالات ہیں۔ لیکن اکثر جگہ غیر مربوط ہو جاتے ہیں۔ اس سے ان کے شوق تصنیف و تالیف کا پتہ چلتا ہے۔ کہ تعطل دماغ بھی ان کو تصنیف و تالیف سے باز نہیں رکھ سکا۔ جانورستان بھی اس زمانے کی تصنیف ہے۔ اس میں جانوروں کے حالات نہایت پاکیزہ اُردو میں لکھے ہیں۔ کہیں کہیں مجذوبیت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ فلسفۂ الٰہیات بھی اسی زمانے کی تصنیف ہے۔

نگارستان فارس میں رودکی سے لے کر آرزو تک شعرائے فارسی کے حالات ہیں۔ حاشیہ پر ان کتابوں کے نام بھی درج ہیں۔ جن سے ان کے حالات اخذ کئے گئے ہیں۔ طرز تحریر سادہ ہے۔ مگر آب حیات کی سی شان نہیں۔ اس لئے اکثر لوگوں کا خیال ہے۔ کہ یہ ابتدائی تصنیف ہے یا نظر ثانی سے محروم رہ گئی ہے۔

اُردو نثاروں میں آزاد کا مرتبہ اُردو نثر نگاروں میں آزاد کی شخصیت بہت نمایاں اور بلند ہے۔ وہ طرز جدید کے بانی۔ فطری شاعری کے پیشرو۔ فارسی کے سکالر۔ قدیم و جدید رنگ کے ماہر۔ ماہر تعلیم۔ اعلیٰ مضمون نگار۔ زبردست ناقد۔ اُردو فارسی کی کتابوں کے مشہور و معروف مُصنّف اور اپنے زمانہ کے عدیم المثال مقرر تھے۔ مگر جس چیز نے ان کو زندہ جاوید کیا۔ وہ ان کی طرز تحریر ہے۔ جس کی تقلید آج تک کوئی نہیں کر سکا۔ ان کی طرز تحریر کی یہ خاص صفات ہیں۔ کہ فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں، دُور از کار تشبیہیں اور صنائع بدائع ان کے ہاں بالکل نہیں۔ ان کی عبارت میں بھاشا کی سادگی اور بے تکلفی۔ انگریزی کی صاف گوئی اور فارسی کی حُسن و خوبصورتی ملی جلی ہے۔ ان کی نثر میں ایک موسیقی ہے جو دل و دماغ کو لُطف اندوز کرتی ہے۔ ان کی تحریریں تکلّف اور تصنّع سے پاک ہیں۔ لطیف

استعارے اور خوبصورت تشبیہیں اس کے حُسن کو دوبالا کرتی ہیں۔ ڈی کوئینسی۔ لیمب اور سٹیونسن جیسے صاحبان طرز سے ان کا مقابلہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

مولانا آزاد اپنے زمانہ میں بھی نہایت مقبول تھے اور اب بھی ہیں۔ حالی نے آب حیات اور نیرنگ خیال کی تقریظوں میں ان کی بہت تعریف کی اور جدید شاعری کا ان کو موجد لکھا۔ مولانا شبلی نے ان کی موت پر ان کو خدائے اُردو کہہ کر یاد کیا۔ مولوی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ بھی ان کے بڑے مداح تھے۔

مولانا کی نثر کی دوست اور دشمن غرض سبھی نے تعریفیں کی ہیں شعر الہند اور گل رعنا کے مُصنف ان کی جادو بیانی سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں۔ جو واقعات آزاد نے غلط بیان کر دیئے ہیں۔ اگر ہم ان کے خلاف سندیں بھی پیش کریں۔ تو کوئی یقین نہیں کرتا۔ حقیقتاً یہ تنقید بہت کڑی ہے۔ کیونکہ اس سے مصنف کی صحیح بیانی اور تاریخ دانی پر سخت حملہ ہوتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ ثابت ہو رہا ہے کہ آزاد تاریخی واقعات بیان کرنے میں نہایت ایمانداری اور احتیاط سے کام لیتے تھے۔

آزاد نہایت ظریف الطبع اور مہذب و متین تھے۔ ان کا دل بالکل آزاد تھا۔ ذیل کے اشعار میں انہوں نے اپنی طبیعت کا بالکل صحیح نقشہ کھینچا ہے ؎

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں — کرتا ہے اس کو چرخ عدو کے علاج میں
کرجاتا صاف دُشمن بد ہیں یہ چوٹ ہے — اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل ہیں کھوٹ ہے
کھوٹا اگر زبان کا ہے دل کا کھرا تو ہے — اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

مولانا حالی حالی کے حالات حصۂ نظم میں لکھے جا چکے ہیں۔ یہاں ان کا ذکر بحیثیت نثار کیا جاتا ہے ان کی تصانیف نثر حسب ذیل ہیں :۔

(۱) تریاق مسموم (۲) علم طبقات الارض (۳) مجلس النساء دو حصے (۴) حیات سعدی (۵) مقدمۂ شعر و شاعری (۶) یادگار غالب (۷) حیات جاوید یعنی سوانحعمری سرسید (۸) مضامین حالی جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔

ابتدائی تصانیف پانی پت کے ایک مسلمان نے عیسائی ہو کر اسلام پر اعتراض کئے تھے۔ تریاق مسموم ان اعتراضات کے جواب میں ہے۔ اس میں کوئی ادبی خوبی نہیں۔ طبقات الارض ایک عربی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر لائٹنر کے عہد میں محکمہ تعلیم پنجاب کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ مجلس النساء لکھنے پر حکومت ہند نے مولانا کو چار سو روپے انعام دیئے تھے۔ یہ لڑکیوں کے اسکولوں میں بھی پڑھائی جاتی تھی۔

حیات سعدی اس کتاب میں شیخ سعدی کے مفصّل حالات اور ان کے کلام پر بحث بہت دلنشین پیرائے میں ہے۔ اسی تصنیف سے مولٰنا نے اُردو نثاروں کی صف اوّل میں جگہ پائی تھی۔

مقدمہ شعر و شاعری یہ کتاب مولانا حالی کے دیوان کا مقدمہ کہلاتی ہے۔ اس تصنیف نے ادبی دُنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ مولانا کی شہرت کا یہی کتاب سنگ بُنیاد ہے۔ اس میں مولٰنا نے شاعری کا آئیڈیل قائم کیا اور مشرقی اور مغربی نقّادوں کے شعر کے متعلق خیالات قلمبند کئے۔ فن تنقید میں یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے مُطالعہ سے قدیم طرز کے شعرا کے سامنے جدید طرز کا دروازہ کُھل جاتا ہے اور دونوں طرزوں کی خوبیاں اور بُرائیاں اظہر من الشمس ہو جاتی ہیں۔

یادگار غالب یہ مولٰنا کی ہر دلعزیز تصنیف ہے۔ غالب پر اس سے بہتر کتاب کسی اور شخص نے نہیں لکھی۔ اس میں غالب کے حالات واقعات اور ان کے لطائف و ظرائف نہایت دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہوئے ان کے فارسی اور اُردو کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ بعض مشکل اور پیچیدہ اشعار کو نہایت خوبصورتی سے سمجھایا ہے۔ اس تصنیف سے حالی نے حق شاگردی اسی طرح ادا کیا ہے جس طرح مولانا آزاد نے دیوان ذوق مرتب کر کے۔ اگرچہ مولانا نے نہایت منصفانہ انداز سے اپنے اُستاد کے کلام پر تنقید کی ہے مگر پھر بھی جوش عقیدت جادۂ انصاف سے کہیں کہیں ہٹا دیتا ہے۔

حیات جاوید یہ کتاب بھی حالی کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں سرسید کے پورے سوانح عمر بیان کئے ہیں بلکہ ان کے رفقا کے بھی حالات لکھے ہیں مُصنّف نے سرسیّد کی تعریف میں مُبالغے سے کام لیا ہے۔ مولٰنا شبلی کی یہ تنقید درست ہے۔ کہ اس کتاب میں تصویر کا ایک رُخ دکھایا ہے۔ اور معائب سے یا تو چشم پوشی کی گئی ہے یا ان کی توجیہ کر دی ہے سکسینا صاحب کہتے ہیں۔ کہ اس تصنیف کو اس قدر سختی سے نہیں جانچنا چاہئے۔ ہماری زبان میں سوانح نگاری ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ سخت تنقیدوں سے اس فن کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

طرز تحریر مولانا کی عبارت صاف سادہ اور زوردار ہوتی ہے لیکن اس میں آزاد کی شوخی اور رنگینی اور مولانا نذیر احمد کی سی لطیف ظرافت نہیں ہوتی۔ اگرچہ حالی نثر میں صاحب طرز نہیں لیکن بہترین نثار ہیں وہ اسلوب بیان سے زیادہ نفس مضمون کا خیال رکھتے ہیں محض لفاظی اور عبارت آرائی کہیں نہیں کرتے۔ وہ جدید نثر اُردو کے زبردست حامیوں اور غالب اور سرسیّد کی طرز تحریر کے زندہ رکھنے والوں

میں سے ہیں۔

مولانا نذیر احمد — ۱۸۳۱ء تا ۱۹۱۲ء

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد موضع راہر ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علم و فضل میں مشہور تھا۔ اپنے والد مولوی سعادت علی سے ابتدائی تعلیم پائی۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ ڈپٹی کلکٹر بجنور سے بھی کچھ پڑھا۔ ۱۸۴۲ء میں دلی آئے اور مولوی عبدالخالق کے شاگرد ہوئے۔ بعد میں انہی کی پوتی سے ان کا عقد ہوا۔ مولوی مملوک علی دلی کالج کے پروفیسر تھے۔ ان کے اصرار سے مولوی صاحب کالج میں داخل ہوئے۔ اور وہاں ادب عربی۔ فلسفہ اور ریاضی وغیرہ کی تکمیل کی۔ کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر کی ترغیب سے انہوں نے انگریزی بھی شروع کی۔ لیکن والدہ کی مخالفت سے چھوڑ دی۔ مولانا آزاد۔ حالی۔ منشی کریم الدین۔ مولوی ذکاء اللہ اور ماسٹر پیارے لال آشوب وغیرہ اسی کالج میں ہم مکتب تھے۔

ابتدا میں مولوی صاحب پنجاب میں پچیس روپے ماہوار پر ٹیچر ہوئے۔ پھر سو روپیہ پر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ غدر میں ایک میم کی جان بچانے پر انہیں ایک تمغہ اور ایک معقول رقم انعام میں ملی۔ مدارس کے حالات بہتر ہونے پر ڈپٹی انسپکٹر ہو گئے۔ کچھ مدت بعد ان کا تبادلہ الہ آباد کا ہوا۔ جہاں انہوں نے ضرورت کے لائق انگریزی بھی پڑھی۔ ۱۸۶۱ء میں انڈین پینل کوڈ کے ترجمہ کی خدمت پر مامور ہوئے۔ ترجمہ تعزیرات ہند کے صلے میں پہلے تحصیلدار اور پھر افسر بندوبست ہو گئے۔ ایک نجوم کی کتاب کا انگریزی سے ترجمہ کرنے پر ایک ہزار روپیہ انعام پایا۔ ان کی قابلیت کا شہرہ سن کر سالار جنگ اول نے ان کی خدمات گورنمنٹ سے مستعار لے کر آٹھ سو روپے ماہوار پر حیدرآباد میں افسر بندوبست مقرر کیا۔ اس عرصہ میں انہوں نے قرآن حفظ کیا۔ بعد میں سر سالار جنگ کے ایما پر انگریزی ملازمت چھوڑ کر سرکار نظام کی مستقل ملازمت کر لی۔ حیدرآباد میں ترقی کرتے کرتے مولوی صاحب اعلیٰ ممبر مال ہو گئے۔ اور سترہ سو روپے ماہوار پانے لگے۔ ان کے بیٹے مولوی بشیر الدین احمد بھی وہیں ڈپٹی کلکٹر تھے۔

سر سالار جنگ کے حکم سے مولوی صاحب نے ایک نصاب تعلیم بھی تیار کیا تھا۔ آخر کار مولوی صاحب اپنے عہدے سے دستکش ہو کر دہلی میں آ رہے۔ جہاں بقیہ عمر تصنیف و تالیف اور سر سید کے ساتھ قومی خدمات میں صرف کر کے ۱۹۱۲ء میں فوت ہوئے۔

لے حیات النذیر میں لکھا ہے کہ کالج میں امتحان ہو رہا تھا۔ وہ اتفاق سے ادھر جا نکلے۔ پرنسپل کے ایما سے مولوی مملوک علی نے ان کا امتحان لیا۔ وہ بہت اچھے طالب علم ثابت ہوئے اور کالج میں داخل ہو گئے۔

تصانیف مولانا کثیر التصنیف اور سریع تصنیف تھے۔ ما یغنیک فی الصرف مبادی الحکمت منتخب الحکایات اور رسم الخط وغیرہ سکول کے طلباء کے لئے بہت مفید کتابیں ثابت ہوئیں۔ انہوں نے سرکاری ایکٹوں کے ترجمے گورنمنٹ کے حکم سے کئے۔

مجموعہ تعزیرات ہند اور دیگر قانونی تراجم کو انہوں نے محنت اور قابلیت سے مکمل کیا۔ "افسانۂ غدر" ایڈورڈ کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ان کے علاوہ سات آٹھ چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔ جو حیدر آباد میں وہاں کے عمال کے لئے لکھیں۔

مذہبی کتب اس زمانے میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں اکثر مباحثے رہتے تھے۔ سرسید۔ مولوی چراغ علی۔ نواب محسن الملک ان میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ ایک عیسائی مبلغ نے "امہات المومنین" لکھی اور اس میں ازواج مطہرات پر بے جا الزامات لگائے۔ مولوی صاحب نے اس کے جواب میں "امہات الامہ" لکھی اس کتاب کی بیباک زبان پر اکثر لوگوں کو اعتراض ہؤا۔ اس پر مولوی صاحب کی بُری طرح خبر لی گئی۔ بلکہ ان پر کفر کا فتویٰ بھی لگ گیا۔ آخر کار اس کی بقیہ جلدیں جلا دی گئیں۔ معقول ترمیم کے بعد اب یہ کتاب دوبارہ چھپ گئی ہے۔

ترجمۂ قرآن ان کا بڑا شاندار کارنامہ ہے۔ یہ چار عالموں کی مدد سے تین سال میں پورا ہؤا تھا۔ اس کی زبان بہت زیادہ بامحاورہ ہے۔ اس وجہ سے اکثر مقامات پر مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ تشریح و تمثیل کی کثرت سے ترجمہ نے تفسیر کی شان اختیار کر لی ہے۔

آخر عمر میں مولوی صاحب نے ادعیۃ القرآن۔ ذہ سورہ اور الحقوق والفرائض بھی تصنیف کیں۔ الحقوق والفرائض بہت جامع کتاب ہے۔ آخری تصنیف مطالب القرآن ان کے بعد چھپی۔

اخلاقی ناول (۱) مراۃ العروس۔ مولوی صاحب کی یہ سب سے پہلی تصنیف ہے جس سے انکی شہرت ہوئی۔ یہ ایک معزز مسلمان خاندان کی پرائیویٹ زندگی کا قصہ ہے۔ اس میں یہ دکھایا ہے۔ کہ ایک جاہل بے پڑھی لکھی لڑکی ایک شریف گھرانے کی تعلیم سے کس طرح بدل گئی۔ یہ کتاب ہندو مسلمان عورتیں بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔ اس کی زبان بھی عورتوں کی ہے۔ جو نہایت بامحاورہ اور سلیس ہے۔ اس پر مولانا کو ایکہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ ہندوستان کی اور زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

(۲) بنات النعش۔ یہ بھی مراۃ العروس کی طرح عورتوں کے لئے لکھی ہے۔ اس میں عام

معلومات کی نہایت دلچسپ باتیں بیان کی گئی ہیں۔

(۳) توبۃ النصوح۔ مولانا کا سب سے بہتر ناول ہے۔ نصوح ایک فاجر و فاسق شخص ہے وہ بیمار ہو کر تائب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا لڑکا راہ راست پر نہیں آتا۔ اس میں مولانا نے اولاد کی تربیت کو بڑی خوبی سے دکھایا ہے۔

(۴) ابن الوقت۔ اس میں ایک ہندوستانی کا ذکر ہے۔ جو غدر میں انگریزوں کا ساتھ دیتا ہے اور اس کے صلے میں دولت اور بلند مرتبہ پاتا ہے۔ وہ دیسی لوگوں کو حقارت سے دیکھتا ہے اور انگریزوں کی معاشرت کو پسند کرتا ہے۔ اس کے عزیز اس سے قطع تعلق کر دیتے ہیں جب انگریز چلے جاتے ہیں تو وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ اس میں مولانا نے اپنی سرگذشت بیان کی ہے۔ یہ بڑی دلچسپ کتاب ہے۔

(۵) ایامیٰ۔ اس میں مولانا نے بیوہ عورتوں کے نکاح پر زور دیا ہے۔ اور ایک بیوہ کی درد بھری داستان نہایت دردناک اور نصیحت آموز پیرائے میں لکھی ہے۔

(۶) محصنات میں تعدد ازدواج کا نقصان دکھایا ہے۔

(۷) رویائے صادقہ میں اہل اسلام کے مذہبی عقائد پر ایک دلچسپ مکالمہ کی صورت میں نتیجہ خیز بحث کی ہے ۔ مولانا کی تمام کتابیں نصیحت آموز اور دلچسپ ہیں۔

لکچر اور تقریریں ملازمت سے کنارہ کش ہونے کے بعد مولانا نے ایک واعظ اور لیکچرار کی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ انجمن حمایت اسلام لاہور۔ طبی کالج دہلی۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں وہ بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ اور سامعین کو اپنی پُرمغز اور ہنسانے رُلانے والی تقریروں سے مسحور کر دیا کرتے تھے۔ ان کا مجموعہ لیکچر بھی چھپ گیا ہے۔

بحیثیت شاعر آخر عمر میں مولوی صاحب کو شعر کہنے کا بھی شوق ہوا۔ لیکن بیشتر اشعار میں شعریت بالکل نہیں۔ ان کا کلام "مجموعہ نظم بے نظیر" کے نام سے چھپ چکا ہے۔

اخلاق و عادات مولانا نہایت سادہ مزاج اور بہت ظریف طبع تھے۔ اگرچہ اللہ نے سب کچھ ہی دے رکھا تھا لیکن زندگی نہایت سادگی سے بسر کرتے تھے۔ روپیہ جمع کرنے کا بیحد شوق تھا۔ آخر عمر میں تجارت میں بھی روپیہ لگاتے تھے جس سے آمدنی میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ تعلیم و تعلّم کا مشغلہ

انہوں نے مرتے دم تک جاری رکھا۔ علیگڑھ کالج اور سر سید کے زبردست معاون تھے ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء ہوئے اور ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی سے ایل۔ایل۔ڈی اور ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ڈی۔او۔ایل کی اعزازی ڈگریاں ملیں۔ گورنر پنجاب بحیثیت چانسلر جلسہ تقسیم اسناد کے صدر تھے۔ انہوں نے سند دیتے وقت مولوی صاحب کے علم و فضل کی بہت تعریفیں کیں۔

طرز تحریر مولانا کی عبارت عام طور پر آسان اور سادہ ہوتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں عربی فارسی کے ثقیل الفاظ بہت بے لطفی پیدا کر دیتے ہیں۔ بعض مواقع پر انگریزی الفاظ اور صنائع بدائع بھی صرف کرتے ہیں جن سے عبارت بھونڈی اور غیر دلچسپ بن جاتی ہے۔ مولانا آزاد کی نثر کی سی لطافت اور شیرینی ان کے ہاں نہیں۔ البتہ ان کی لطیف اور دلچسپ ظرافت ان کو اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کی ظرافت میں سوقیانہ پن مطلق نہیں ہوتا۔

شہرت میں مولانا اپنے معاصرین سے سبقت لے گئے تھے۔ وہ قوانین کے ترجمے سے گورنمنٹ سے روشناس ہوئے۔ قرآن کے ترجمے سے مسلمانوں میں ان کی شہرت ہوئی۔ اور اپنے اخلاقی ناولوں کی بدولت ہر گھر میں ان کا نام پہنچا۔

مولوی ذکاءاللہ ۱۸۳۲ء تا ۱۹۱۰ء ۱۸۳۲ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حافظ ثناءاللہ بہادر شاہ بادشاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے کے اتالیق تھے۔ ذکاءاللہ بارہ برس کی عمر میں دلی کالج میں داخل ہوئے۔ آزاد۔ نذیر احمد وغیرہ ان کے ہم مکتب تھے۔ یہ تینوں آپس میں گہرے دوست تھے۔ حسن اتفاق یہ کہ تینوں شمس العلما ہوئے۔

مولوی صاحب تعلیم کے بعد دلی کالج میں ریاضی کے پروفیسر ہو گئے۔ سات آٹھ سال کے بعد ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر بلند شہر اور مراد آباد میں گیارہ سال رہے۔ ۱۸۶۹ء میں دلی نارمل سکولوں کے مدرس اعلیٰ ہوئے۔ اور ۱۸۷۲ء میں اورینٹل کالج لاہور کی پروفیسری کے لئے نامزد ہوئے۔ مگر اس عہدے کا چارج لینے سے پہلے وہ میور سنٹرل کالج الہ آباد میں عربی فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ جہاں ۲۶ برس ملازمت کرنیکے بعد پنشن پائی۔ چوبیس برس پنشن کھا کر ۱۹۱۰ء میں دہلی میں فوت ہوئے۔

تعلیم نسواں کی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ سے خلعت پایا۔ علمی خدمات میں پندرہ سو روپے انعام اور خطابات خان بہادر اور شمس العلماء ملے۔ سر سید کے گہرے دوست اور معاون تھے۔

تصانیف ان کی تصانیف بکثرت ہیں۔ اور لُطف یہ ہے کہ وہ ریاضی۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ ادب اخلاق۔ طبعیات۔ کیمیا اور سیاسیات وغیرہ میں ایک ماہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا حالی کہا کرتے تھے "مولوی ذکاءاللہ کا دماغ ایک بنئے کی دُکان ہے جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے"۔ ممکن ہے اس میں یہ بھی اشارہ ہو کہ بنئے کے ہاں عمدہ اور قیمتی چیزیں نہیں ہوتیں۔ بہرحال مولوی صاحب کی تحریریں نہایت صاف اور سلیس ہیں۔ ان کی تصانیف مطبوعہ وغیر مطبوعہ ڈیڑھ سو سے کم نہیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر طلبا کے لئے لکھی ہیں۔ شاید اسی لئے ان میں ادبی شان بالکل نہیں۔ مولوی صاحب بحیثیت ریاضی دان۔ مترجم اور مورّخ کے مشہور ہیں۔ ریاضی میں ان کا پایہ کچھ بلند نہ تھا۔ ان کی کوششیں انگریزی ترجمے اور شرحیں لکھنے تک محدود تھیں۔ تاریخ ہند لکھنے میں بہت محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ تاریخ ہندوستان دس جلدوں کی ضخیم کتاب ہے۔ "حمات عظیم" میں اُن لڑائیوں کا ذکر ہے۔ جو ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں انگلستان اور دُوسرے ممالک میں ہوئیں۔ "آئین قیصری" میں ملکہ وکٹوریا کے عہد کی انتظامی تبدیلیاں درج ہیں۔ ایک اور کتاب تین جلدوں میں ہے جس میں وکٹوریا کے عہد کے حالات اور ترقیاں جمع کی ہیں۔ "فرہنگ فرنگ" میں یورپین شائستگی کی تاریخ اور وکٹوریا اور ان کے شوہر کے حالات لکھے ہیں۔ مولوی سمیع اللہ نے سوانح عمری بھی لکھی تھی۔ آخر عُمر میں تعلیم اسلام لکھ رہے تھے۔ کہ انتقال ہو گیا۔ اور کتاب ناتمام رہ گئی۔

مولوی سید احمد دہلوی ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید عبدالرحمن ایک معزز خاندان سادات کے رُکن تھے۔ مولوی صاحب کی تعلیم سرکاری سکول اور نارمل سکول میں ہوئی۔ بچپن ہی سے تصنیف وتالیف کا شوق تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں "طفلی نامہ" کے عنوان سے ایک فارسی نظم اور "تقویۃ الصبیان" ایک انشا کی کتاب لکھی۔ ۱۸۶۸ء سے فرہنگ آصفیہ کے لئے مصالح جمع کر رہے تھے۔ ۱۸۶۹ء میں "کنز الفوائد" چھپی جس پر ان کو دو سو روپے انعام ملا۔ ۱۸۷۱ء میں "قواعد اردو" شائع ہوئی اور ڈیڑھ سو روپے انعام میں ملے۔ اس اثنا میں ڈاکٹر فیلن انسپکٹر مدارس صوبہ بہار نے اپنی ڈکشنری تیار کرنے کے لئے بلا لیا۔ مولوی صاحب نے یہ کام سات برس میں ختم کیا اور ساتھ کے ساتھ اپنا فرہنگ بھی تیار کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے ہادی النساء لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ ۱۸۸۰ء میں مہاراجہ الور کا سفرنامہ مرتب کیا۔ اس کے بعد پنجاب بک ڈپو کے

نائب مترجم ہو گئے۔ اس زمانہ میں ان کی ذیل کی مفید تصانیف شائع ہوئیں۔
تکمیل الکلام میں پیشہ وروں کی اصطلاحات ہیں "تحقیق الکلام" میں اردو زبان کے نکات، "رس کھان" میں ہندی دوہے پہیلیاں اور گیت، "ریت بکھان" میں ہنود کے رسم و رواج، "ناری کتھا" میں ہندو عورتوں کی مخصوص بولی، قواعد اردو تعلیم نسواں۔ لغات النساء۔ تحریر النساء۔ راحت زمانی کا قصہ۔ اخلاق النساء۔ علم النساء۔ رسوم دہلی۔ سیر شملہ۔ ضرب الامثال۔ روزمرۂ دہلی۔ رسوم اعلیٰ ہندوان دہلی وغیرہ ان کی اپنی طرز میں مفید اور دلچسپ کتابیں ہیں۔

فرہنگ آصفیہ اتنی بڑی کتاب کا چھاپنا آسان کام نہ تھا حسن اتفاق سے ۱۸۸۸ء میں سرعثمان جاہ شملے آئے۔ وہاں مولوی صاحب کسی سکول میں ملازم تھے۔ انہوں نے وزیر اعظم کی معرفت اپنی فرہنگ کا مسودہ پیش کیا۔ وہ سید علی بلگرامی کے معائنہ کے بعد منظور کر لیا گیا۔ اور انعام کا وعدہ ہوا جب ۱۸۹۲ء میں کتاب ختم ہوئی۔ تو اس کا نام فرہنگ آصفیہ رکھا۔ اس تصنیف پر سرکار نظام سے پانچ ہزار روپے انعام اور پچاس روپے ماہوار بطور وظیفہ ملے۔ گورنمنٹ پنجاب نے بھی اس کی بہت قدر کی۔ فی الحقیقت یہ کتاب لغات اردو میں خاص درجہ رکھتی ہے۔ آجکل اس فرہنگ کے نہ ملنے سے ادبی دنیا کو سخت بے چینی ہے۔

شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ وکالت کرتے تھے۔ ابتدائی کتابیں مولوی شکر اللہ سے پڑھیں۔ پھر مولانا فاروق چریا کوٹی ہیڈ مولوی غازی پور سے عربی ادب اور معقولات پڑھیں۔ شوق تعلیم میں رامپور گئے۔ اور وہاں مولوی عبدالحق خیر آبادی سے معقول اور مولوی ارشاد حسین محدث سے حدیث اور فقہ کے اسباق لئے۔ پھر لاہور آ کر مولوی فیض الحسن سے حماسہ پڑھا۔ وہاں سے سہارنپور آئے اور مولوی احمد علی سے حدیث کی تکمیل کی۔ ۱۸۷۶ء میں انیس سال کے تھے کہ حج کو گئے اور راستے میں جوش عقیدت میں ایک پرزور فارسی قصیدہ لکھا۔ حج سے واپس آ کر اعظم گڑھ میں سلسلۂ درس و تدریس جاری رکھا۔ شوق کتب بینی کا یہ حال تھا۔ کہ کتب فروشوں کی دکان پر بیٹھ کر کتابیں پڑھا کرتے اور بازار کا شور و غل ان کے انہماک میں حارج نہ ہوتا۔ اس زمانہ میں انہوں نے رد وہابیہ میں چند رسالے لکھے۔ کہتے ہیں وکالت کا امتحان پاس کر کے اعظم گڑھ میں وکالت بھی کی تھی۔ جب دل

اُکتا گیا تو سرکاری مُلازمت کی۔ لیکن وہ بھی چھوڑ دی اور علمی مشاغل اختیار کر لئے۔

مولانا شبلی کثیر الاشواق اور جامع الاذواق تھے۔ وہ نہایت کامیاب شاعر فلسفی مورخ۔ ناقد۔ ماہر تعلیم معلّم۔ واعظ مصلح۔ جریدہ نگار۔ فقیہہ اور محدّث تھے۔ اور اپنے زمانے کے قابل ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔

۱۸۸۲ء میں اپنے چھوٹے بھائی مہدی سے علی گڑھ کالج میں ملنے گئے۔ وہاں خان بہادر محمد کریم ڈپٹی کلکٹر کے ذریعہ مولوی سمیع اللہ خاں سے ملے، اور ان کی معرفت سر سید سے مُلاقات ہو گئی۔ ان دنوں کالج میں فارسی کے پروفیسر کی جگہ خالی تھی۔ مولٰنا نے اس کے لئے درخواست دی جو منظور ہو گئی۔ شروع میں کچھ دنوں شہر میں رہے۔ اس کے بعد سر سید کے بنگلے کے قریب آ رہے۔

قیام علیگڈھ اس زمانہ میں وہاں بڑے بڑے ارباب کمال جمع تھے۔ لیکن سر سید اور حالی وغیرہ کی صحبت سے بہت فائدہ پہنچا۔ پروفیسر آرنلڈ سے فرنچ سیکھی، اور ان کو عربی پڑھائی۔ اگر مولٰنا نے مغربی فن تنقید پروفیسر موصوف سے حاصل کیا تو اکثر باتوں کے لئے پروفیسر صاحب کی "پریچنگ آف اسلام" ان کی ممنون ہے"۔

ابتدائی تصانیف ۱۸۸۳ء میں "مثنوی صبح اُمید" لکھی جس میں اسلام کی شان و شوکت، مُسلمانوں کی نکبت اور فلاکت اور ان کو اس مُصیبت سے نجات دلانے کیلئے سر سید کی کوششوں کا بہت پُر اثر اور زوردار الفاظ میں ذکر کیا۔

"مُسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" ۱۸۸۶ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں بطور ایڈریس کے پڑھی۔ اس سے ان کی تاریخی معلومات اور تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے۔ اب ان کے دل میں خیال آیا کہ بلاد اسلامیہ کا سفر کر کے خلفائے عباسیہ کی ایک مکمل تاریخ مرتب کی جائے۔ سب سے پہلے المامون اور سیرۃ النعمان لکھی۔ الفاروق شروع کرنے والے تھے۔ کہ سفر روم و شام اختیار کیا۔ اس سفر میں پروفیسر آرنلڈ بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے قسطنطنیہ۔ ایشیائے کوچک اور شام و مصر کے بڑے بڑے شہروں کی سیر کی۔ اس سفر کی زیادہ تر غرض یہ تھی کہ الفاروق کے لئے صحیح اور معتبر مآخذ کا پتہ لگے اور بلاد اسلامی کی شان و شوکت اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ واپس آ کر انہوں نے "سفرنامہ روم و شام" چھپوایا۔ جو نہایت دلچسپ ہے۔

مولانا ۱۸۹۸ء میں سر سید کے انتقال سے دل برداشتہ ہو گئے اور کالج کی ملازمت ترک کر کے اعظم گڑھ میں جا رہے۔ اب وہ الفاروق کی تیاری میں ہمہ تن مصروف تھے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے ایک قومی سکول کی ترقی کے لئے کوششیں کیں۔ ۱۸۹۹ء میں کشمیر گئے۔ وہاں جا کر بیمار ہو گئے۔ اور اسی حالت میں الفاروق کو مکمل کیا۔

قیام حیدرآباد نواب وقار الامراء کی وزارت کے زمانہ میں حیدر آباد گئے۔ اور سید علی بلگرامی کی کوشش سے دو سو روپے پر ناظم محکمہ تعلیم ہوئے۔ بعد میں ان کی تنخواہ تین سو روپے ہو گئی۔ وہاں چار برس رہے محکمہ تعلیم میں بہت کچھ مفید اصلاحیں بھی کیں اور سلسلۂ تصنیف و تالیف بھی برابر جاری رکھا۔ الغزالی۔ سوانح مولانا روم۔ الکلام۔ علم الکلام۔ موازنۂ انیس و دبیر وغیرہ اسی زمانے کی تصانیف ہیں۔ انہوں نے حیدر آباد میں ایک مشرقی یونیورسٹی کھولنے کی سکیم بھی تیار کی تھی۔

ندوۃ العلماء ندوۃ العلماء کی تحریک کے بانی مولوی عبد الغفور ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مگر اس کی تکمیل مولوی سید محمد علی کانپوری خلیفہ مولانا فضل الرحمن مراد آبادی کے ہاتھوں ۱۸۹۴ء میں ہوئی۔ مولانا شبلی اور مولوی عبد الحق مفسر (تفسیر حقانی) نے اس کے قواعد و ضوابط مرتب کئے۔ سر سید محسن الملک اور وقار الملک بھی اس کے حامی تھے۔ اس کے مقاصد خاص طور پر یہ تھے۔ کہ عربی مدارس کے لئے ایک مفید نصاب تعلیم ضروریات زمانہ کا خیال رکھ کر بنایا جائے۔ اور مسلمانان ہند کے باہمی اختلافات کو دور کیا جائے۔

مولانا شبلی کی تحریک سے ۱۸۹۸ء میں دار العلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھولے گئے۔ ۱۸۹۹ء میں شاہجہانپور کے رؤساء نے ندوۃ العلماء کو کچھ زمینداری بطور وقف دی جس کی آمدنی تقریباً سات سو روپیہ تھی۔ پھر ایک عظیم الشان کتبخانہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس میں دس ہزار سے زائد نایاب کتابیں موجود ہیں۔ ایک زمانہ میں ندوہ کی بڑھتی ہوئی تحریک کو دیکھ کر گورنمنٹ کو شبہ ہوا کہ یہ جماعت سیاسی سازشوں سے تعلق رکھتی ہے۔ چاروں طرف اس کی مخالفت میں رسالے نکلنے لگے اور ندوہ کے مقابلے میں "جدوہ" قائم ہوا۔

حیدر آباد سے آ کر مولانا شبلی نے ندوہ کے ابتر انتظامات کو سنبھالا۔ اور بڑی کوششوں سے گورنمنٹ کے شکوک رفع کئے۔ ندوہ کی مالی حالت درست کرنے کیلئے وہ اسلامی ریاستوں میں گئے۔ اور رام پور سے پانسو۔ بھوپال سے ڈھائی سو۔ آغا خاں سے پانسو روپے سالانہ کی اعانتی رقوم

مقرر کرائیں۔ نواب صاحب بھاولپور کی والدہ نے پچاس ہزار روپے تعمیر عمارت کیلئے عنایت کئے گورنمنٹ نے دارالعلوم کے لئے ایک وسیع قطعہ زمین دریائے گومتی کے کنارے لکھنؤ میں عطا کیا، اور چھ ہزار روپے سالانہ کی امداد انگریزی اور دینی علوم کی تعلیم کے لئے دینی منظور کی ۱۹۰۸ء میں گورنر ممالک متحدہ نے دارالعلوم کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ ندوہ کے ماتحت مولانا نے عربی فارسی کے سکالروں کے لئے ایک درجہ کھولا جس میں ریسرچ کا کام ہوتا ہے۔ حقیقتاً ندوہ کے مقاصد ابھی تکمیل کو نہیں پہنچے۔ لیکن اس تھوڑی سی مدت میں اس نے ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ ندوہ نے قرآن کا صحیح انگریزی ترجمہ کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ مسلمانوں کی تاریخی غلطیوں کی نہایت عمدگی سے اصلاح کی۔ قانون وقف و میراث کے پیچیدہ مسائل پر روشنی ڈالی۔ اسلامی علوم اور تمدن کا ہندوستان میں ایک مرکز قائم کیا۔ اور وہاں سے الندوہ کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ جس کے مدیر مولانا شبلی اور حبیب الرحمٰن شروانی تھے۔ اس رسالے میں بہت عمدہ مضامین نکلتے تھے۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ

سرسید کی صحبت نے مولانا کو کسی قدر آزاد خیال بنا دیا تھا۔ اس لئے ندوہ کے علماء ان پر پورا اعتماد نہ رکھتے تھے۔ آخر مولانا لکھنؤ سے دل برداشتہ ہو کر اعظم گڑھ چلے آئے۔ اعظم گڑھ میں انہوں نے دارالمصنفین کی بنیاد رکھی۔ اور اپنی جائداد اس کے لئے وقف کر دی۔ اس زمانہ میں مولانا نے "سیرۃ النبی" اور شعر العجم کا پانچواں حصہ لکھا۔ انہی ایام میں سوء اتفاق سے مولانا کی ٹانگ پر گولی لگی اور آخر کار اسے کٹوانا پڑا۔

آجکل دارالمصنفین کے نگران سید سلیمان صاحب ندوی ہیں۔ اور مولانا حمید الدین، مولانا عبدالہادی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی۔ پروفیسر نواب علی اور مولانا عبدالسلام اس کے پُرجوش کارکن، مولانا حمید الدین انگریزی کے علاوہ فارسی عربی ادب اور علم القرآن کے مستند فاضل ہیں مولانا عبدالہادی نے برکلے کے فلسفہ کا سلیس اُردو میں ترجمہ کیا۔ اور اس کے علاوہ فلسفہ کی اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔

دارالمصنفین اُردو ادب کی نہایت شاندار خدمات انجام دے رہا ہے۔ اسکی مطبوعات میں عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ اور اس کی تمام تر توجہ علوم اسلامی کی نشر و اشاعت کی طرف مبذول ہے۔ دارالمصنفین کے کارکنوں کا فرض ہونا چاہئے۔ کہ وہ تمام علوم مغربی و مشرقی کی طرف توجہ کریں، اور یہ خیال رکھیں کہ معمولی اُردو جاننے والے بھی ان کی مطبوعات سے مستفید ہوں۔

خدماتِ شبلی | سلطان ٹرکی نے ۱۸۹۲ء میں تمغۂ مجیدی عنایت کیا۔ اور اسی زمانہ میں گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ مولانا الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو اور مختلف تعلیمی کمیٹیوں کے معزز رکن رہے۔

اخلاق و عادات | مولانا شبلی ایک سچے راستباز خلیق اور متواضع بزرگ تھے۔ ان کی گفتگو نہایت شیریں اور معلومات سے پُر ہوتی تھی۔ حافظہ نہایت اچھا پایا تھا۔ روپے کو آزادی سے خرچ کرتے تھے۔ اور ہندو مُسلم اتحاد کے دل سے خواہاں تھے۔

تصانیف | ان کی تصانیف بکثرت ہیں۔ حسب ذیل بہت مشہور ہیں :-

سیرۃ النبیؐ ۲ حصے۔ شعر العجم پانچ حصے۔ اورنگ زیب عالمگیر۔ الفاروق۔ المامون۔ سیرۃ النعمان۔ الغزالی۔ الکلام۔ علم الکلام۔ سوانح مولانا رُوم۔ موازنہ انیس و دبیر۔ الجزیہ، مقالات شبلی۔ رسائل شبلی۔ دیوان شبلی۔ مجموعہ نظم وغیرہ۔

بحیثیت مورخ | مولانا نے اسلام کی قدیمی شان و شوکت کو طرز جدید میں لکھا۔ تاریخی تصانیف میں تجسّس تلاش اور عمیق مُطالعہ سے کام لیا۔ اور جدید طرز تنقید کے مطابق بیکار چیزوں کو ترک کر دیا۔ الفاروق، المامون۔ الغزالی۔ سیرۃ النعمان ان کی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں۔ اور ان کے وسیع مُطالعہ اور گہری تحقیق اور تجسّس کا پتہ دیتی ہیں۔

بحیثیت نقاد | مولانا اپنے زمانہ کے صائب الرائے ناقد تھے۔ سکسینا صاحب لکھتے ہیں۔ کہ شعر العجم وُسعتِ مُطالعہ اور تحقیق کے ساتھ فصاحت بلاغت اور سلاست زبان کا بہترین مجموعہ ہے، اور اس کی غلطیاں نکالنے سے اس کی قدر و قیمت اور مولانا کی تبحر علمی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سکسینا صاحب کی یہ تنقید عجیب طرح کی ہے۔ مستشرقین کے نزدیک تاریخی حیثیت سے شعر العجم بالکل بے وقعت ہے۔ ہاں شعرا پر تنقیدیں واقعی نہایت دلچسپ اور عالمانہ ہیں۔ جو مولانا کے بلند نقطہ نظر اور تبحر علمی کا ثبوت ہیں "موازنہ انیس و دبیر" بھی بہت دلچسپ اور قابل قدر کتاب ہے لیکن اس میں دبیر کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔

طرزِ تحریر | مولانا ہمیشہ صفائی اور سادگی کو پسند کرتے ہیں۔ ان کی عبارت میں ایک قسم کی تڑپ ہوتی ہے سر سیّد کہا کرتے تھے۔ "شبلی تم دِلّی والوں کے لئے باعثِ رشک ہو"۔ ان کی نثر میں صنائع بدائع او

ف تنقید شعر العجم از پروفیسر شیرانی مطبوعہ انجمن ترقی اُردو۔

تکلف بالکل نہیں۔ قابل تعریف بات یہ ہے۔ کہ ہر کتاب میں مناسب حال انداز بیان اختیار کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی زور بیان کم نہیں ہوتا۔

سکسینا صاحب لکھتے ہیں۔ جن کی زبان کو آزاد کی اردو کا چٹخارہ ہے ممکن ہے ان کو مولانا کا رنگ روکھا پھیکا اور بے مزہ معلوم ہو۔ مگر کاروباری نثر کا وہ بے مثل نمونہ ہے اور دور موجودہ کا سب سے بڑا کارنامہ،

مولانا کی نثر میں نیشلیزم کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے۔ کہ علوم مشرقی کو مغربی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ نہایت بلند نظری سے ہر شعر کو جانچتے ہیں، اور اس کے حسن و قبح کو نہایت ہی دلنشین انداز میں بیان کرتے ہیں۔

سید سلیمان ندوی سید صاحب مولانا شبلی کے جانشین اور عربی فارسی کے زبردست عالم ہیں۔ مولانا شبلی ان سے محبت کرتے تھے۔ اور وہ بھی اپنی علمی اور ادبی قابلیت کے باعث مولانا کے دوسرے شاگردوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے سید صاحب نے مولانا کے بعد ان کی روایات کو زندہ رکھا۔ دار المصنفین انہی کی نگرانی میں عربی فارسی کی نایاب کتابوں کے ترجمے اور مفید کتابیں تصنیف و تالیف کر رہا ہے۔ وہ "معارف" کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ جو اردو زبان کا نہایت بلند پایہ رسالہ ہے۔ بلاد اسلامیہ کا سفر کر چکے ہیں۔ سیرۃ النبیؐ کے دو حصے مولانا شبلی نے لکھے تھے اس کے باقی حصے اسی شان سے مولانا لکھ رہے ہیں۔ سیرۃ العائشہؓ۔ ارض القرآن۔ لغات جدیدہ اور عرب و ہند کے تعلقات آپ کی نہایت مقبول اور مفید تصانیف ہیں۔

عبد السلام ندوی دار المصنفین کے پر جوش کارکن ہیں۔ ان کے بلند پایہ مضامین معارف میں اکثر چھپتے رہتے ہیں۔ سیرۃ عمر بن عبد العزیز۔ اسوۂ صحابیات۔ شعر الہند ہر دو حصے۔ ابن یمین وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔

شعر الہند۔ اپنی نوعیت کی نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس میں نظم اردو پر ایک خاص نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ مگر بہت سے ایسے لوگوں کو نظر انداز کر دیا ہے جنہوں نے زبان کی ترقی میں بے حد کوششیں صرف کی ہیں۔ سکسینا صاحب لکھتے ہیں۔ کہ کتاب کا نام اسم غیر مسمّٰی ہے۔ بہر حال اس میں بعض باتیں ایسی ہیں۔ جو دوسرے تذکروں میں نہیں ملتیں۔

عبدالماجد دریا آبادی مولانا عبدالماجد بی۔اے مولوی عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر کے فرزند ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوئے گھر میں ابتدائی عربی فارسی کی تعلیم سے فراغت پاکر سیتاپور ہائی سکول سے انٹرنیس پاس کیا اور کنگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے ۱۹۱۲ء میں بی۔اے کیا۔ایم۔اے کے لئے علیگڑھ گئے۔لیکن والد کے انتقال کے سبب مطالعہ جاری نہ رکھ سکے۔واپس لکھنؤ آکر سلسلۂ تصنیف وتالیف جاری کیا۔۱۹۱۷ء میں دارالترجمہ حیدرآباد دکن سے تعلق ہوگیا۔مگر کچھ مدت بعد ملازمت ترک کردی۔اب بھی نظام گورنمنٹ سے وظیفہ پاتے ہیں۔اور کچھ نہ کچھ ادبی خدمات عثمانیہ یونیورسٹی کی کرتے رہتے ہیں۔ سیاسیات سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں اور سیاسی حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ہفتہ وار اخبار "سچ" آپ کی ادارت میں نکلتا ہے۔

فلسفہ جذبات۔روح الاجتماع۔تاریخ اخلاق یورپ مکالمات برکلے۔پیام امن۔بحر المحبت (مثنوی مصحفی) زود پشیماں (ناٹک) سائیکالوجی آف لیڈرشپ (انگریزی) تصوف اسلام۔ فلسفیانہ مضامین وغیرہ اُن کی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں۔اپنی قابل قدر تصانیف کی بدولت ان کو ادبی دنیا میں خاص شہرت حاصل ہے۔

مولانا کا مطالعۂ فلسفہ بہت عمیق ہے۔اور فلسفیانہ مضامین اور ترجمے کرنے کا خاص ملکہ ہے کبھی کبھی تفنن طبع کے لئے سبک چیزوں کی طرف بھی متوجہ ہوجاتے ہیں۔چنانچہ "زود پشیماں" اسی قسم کا ناٹک ہے۔اگرچہ سٹیج کے لائق نہیں۔لیکن نہایت دلچسپ ہے۔کبھی کبھی متصوفانہ رنگ میں شعر بھی کہتے ہیں۔ان کے علمی ادبی اور فلسفیانہ مضامین علمیت۔اور ریجنیلٹی اور اعتدال پسندی میں یکتا ہوتے ہیں۔اور اکثر بلند پایہ رسائل اور جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ان کی تصانیف سے اردو اور اردو داں افراد کو بہت فائدے پہنچ رہے ہیں۔

جدید علوم کی ترویج دِلّی کالج کا قیام ۱۸۲۷ء میں انگریزی کی تعلیم کے لئے دِلّی کالج میں ایک درجہ کھولا گیا۔انگریزی تعلیم کی سخت مخالفت کے باوجود ۱۸۳۱ء میں وہاں تین سو طلبا انگریزی پڑھتے تھے۔ پہلے یہ کالج اجمیری دروازے کے قریب تھا۔مگر جب طلبا کی تعداد زیادہ ہوگئی تو ۱۸۴۳ء میں کشمیری دروازہ شاہی کتب خانہ کی عمارت میں منتقل ہوگیا۔چونکہ عام جذبات انگریزی تعلیم کے خلاف تھے اس لئے طلباء سے فیس نہیں لی جاتی تھی۔بلکہ انگریزی تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لئے اچھے

وظائف دیئے جاتے تھے۔ ریاضی کی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانہ پر دی جاتی تھی۔ اس وقت خاص و عام انگریزی ادب اور زبان کے خلاف تھے۔ مگر طلبا مغربی علوم اور ریاضی کے بہت گرویدہ ہو رہے تھے انگریزی تعلیم زیادہ تر لکچروں کے ذریعے ہوتی تھی۔ کیونکہ انگریزی کتابیں دقت سے ملتی تھیں۔ ان لکچروں کو طلبا بہت دلچسپی سے سُنتے تھے۔ ریاضی کے مسائل اور کیمیاوی طبیعی۔ برقی اور مقناطیسی تجربے دیکھ کر ان کے دل میں خیال پیدا ہوتا تھا۔ کہ ہم ایک نئی علمی دُنیا میں قدم رکھ رہے ہیں۔ ابھی مزید انکشافات کے خواب ہی دیکھے جا رہے تھے۔ کہ ہنگامہ غدر نے سب کھیل بگاڑ دیا۔

پروفیسر رام چندر لکچرار ریاضی۔ پنڈت اجودھیا پرشاد اور مسٹر ٹیلر پرنسپل کالج طلباء کی تعلیم و ترقی میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ مولانا امام بخش صہبائی عربی فارسی پڑھاتے تھے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب۔ مولانا آزاد۔ مولوی نذیر احمد۔ مولانا حالی اور مولوی ذکاءاللہ وغیرہ نے اسی کالج میں تعلیم پائی۔ ان لوگوں نے زبان۔ مُلک اور قوم کی نہایت قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اور ہندوستان میں اپنا نام روشن کیا - مولوی شہامت علی ریاست اندور کے وزیر اعظم ہوئے۔ ڈاکٹر مکند لال شمالی ہند کے نہایت مشہور ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر چمن لال بھی بہت مشہور تھے۔

۱۸۴۲ء میں دلّی کالج کی سرپرستی میں ایک ادبی انجمن کھولی گئی جس کی رُوح رواں پروفیسر رامچندر اور مولانا صہبائی تھے۔ اس انجمن کی کوششوں سے اکثر مفید کتابوں کے انگریزی سے اُردو میں ترجمے ہوئے۔ آگرہ۔ بنارس اور لکھنؤ وغیرہ میں بھی اس قسم کی کتابیں تیار ہوئیں۔ ان ترجموں اور تالیفوں سے اُردو نثر صاف اور بے تکلف ہو کر اس قابل بن گئی۔ کہ اس میں کاروباری دُنیا کی باتیں لکھی جا سکیں۔

۱۸۶۴ء میں رائے بہادر پیارے لال آشوب نے دلّی میں ایک ادبی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس سوسائٹی کے وہ خود سیکرٹری تھے۔ اکثر اجلاس میں انہوں نے بڑے مفید اور کارآمد لکچر دیئے۔ سیکسینا صاحب نے لکھا ہے۔ کہ ماسٹر پیارے لال آشوب مولانا حالی کو اکثر چیزیں ترجمہ کر کے دیتے تھے۔ کہ وہ ان کو اُردو کا جامہ پہنائیں اور انہی کی توجہ اور مدد سے آزاد اور حالی نے جدید رنگ کی شاعری شروع کی۔ سیکسینا صاحب کا یہ خیال بے بُنیاد ہے۔

پروفیسر رام چندر پروفیسر صاحب دلّی کالج میں ریاضی کے مشہور پروفیسر تھے۔ ٹیلر صاحب پرنسپل کے اثر سے عیسائی ہو گئے تھے۔ یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے دلّی کالج کے انگریزی سکول میں

تعلیم پائی تھی۔ بہت ذہین اور عقلمند تھے۔ ریاضی کا ایک نیا مسئلہ دریافت کرنے کی وجہ سے یورپ کے مشہور مہندسوں میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا آزاد۔ نذیر احمدؒ اور ذکاءاللہ وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔ مولوی ذکاءاللہ چونکہ ریاضی سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لئے پروفیسر صاحب کے محبوب شاگرد تھے۔

پروفیسر رام چندر نہایت بیخوف، راستباز اور راسخ الاعتقاد شخص تھے عیسائی ہونیکی وجہ سے تمام برادری نے ان کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھانے سے ان کے مزاج میں تُندی پیدا ہو گئی تھی۔ جو اکثر مباحثے اور مناظرے کی صُورت اختیار کر لیتی تھی۔ پھر بھی رحمدل اور معاملے کے "پکّے" تھے۔ غدر میں ان کے ایک شاگرد نے بروقت اطلاع دیکر ان کی جان بچائی۔ پہلے وہ چند دن ایک مکان میں چھپے رہے۔ پھر وہاں سے بھیس بدل کر شہر سے باہر چلے گئے۔ جب امن قائم ہوا تو واپس آئے، اور اپنی کوششوں سے بعض دوستوں کو بھی شہر میں بُلوایا۔ آخر میں پروفیسر صاحب ریاست پٹیالہ کے ڈائرکٹر تعلیمات ہو گئے تھے۔

"تذکرۃ الکاملین" ان کی تصنیف ہے۔ اس میں یونان اور روما کے مشہور فلاسفروں اور شعرا کے حالات انگریزی اور عربی کتابوں سے اخذ کر کے لکھے ہیں۔ ہندوستانی فلاسفروں اور شاعروں مثلاً والمیک، شنکراچارج اور بھاسکر جوتشی وغیرہ کے حالات بھی شامل ہیں۔ اُصول علم ہیئت اور عجائب روزگار بھی انہی کی تصانیف ہیں۔ زبان نہایت صاف اور سلیس ہے۔

مولوی امام بخش صہبائی قدیم دِلّی کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر تھے۔ فارسی میں کمال حاصل تھا۔ نہایت روشن خیال اور قابل عالم تھے۔ سرسیّد کو آثار الصنادید کی تصنیف میں انہوں نے بڑی مدد دی۔ طلباء پر ان کا بہت گہرا اثر تھا۔ فن شعر میں اُستاد مشہور تھے۔ قلعہ کے اکثر شاہزادے ان سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ زمانۂ غدر میں مارے گئے۔ اور ان کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔ متعدد کتابیں ان کی تصنیف ہیں۔

مولوی غلام امام شہید مولوی غلام محمدؐ کے بیٹے، امیٹھی ضلع لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں شمار ہوتے تھے نعت بہت اچھی کہتے تھے۔ اس لئے مداحِ نبیؐ اور عاشقِ رسولؐ کے لقب سے مشہور تھے۔ قتیل اور مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ اور فارسی نظم و نثر آغا سید اسمٰعیل مازندرانی کو دکھاتے تھے۔ الہ آباد میں پیشکار تھے۔ پھر ملازمت سے دستکش ہو گئے۔ ریاست حیدرآباد سے ایک معقول رقم بطور پنشن ملا کرتی تھی۔ حیدرآباد

مُراد آباد۔ رام پور اور آگرے میں ان کے شاگرد بکثرت تھے۔ حیدر آباد کے رؤسا بڑی عزت کرتے تھے۔ مجموعہ میلاد شریف۔ انشاء بیخبر۔ ال اور چند قصائد و غزلیات ان سے یادگار ہیں۔ تاج گنج آگرہ کا حال پرانے رنگ کی نثر میں خوب لکھا ہے۔

منشی غلام غوث بیخبر | بزرگ اپنے وطن کشمیر میں معزز عہدوں پر سرفراز تھے۔ والد خواجہ حضور اللہ کشمیر سے تبت اور وہاں سے نیپال آئے۔ وہیں خواجہ غلام غوث سنہ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ چار برس کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ بنارس آئے۔ وہاں قدیم رنگ کی تعلیم پاکر سنہ ۱۸۴۲ء میں اپنے ماموں خان بہادر سید محمد خاں میر منشی گورنر ممالک مشرقی و شمالی کے ماتحت ملازم ہو گئے۔ قلعہ گوالیار کی جنگ میں ان کے ماموں کو اعزازی خلعت ملا۔ ماموں کے انتقال کے بعد میر منشی ہو گئے۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں نہایت قابلیت سے فرائض منصبی ادا کرکے ملازمت سے دستکش ہو گئے۔ خواجہ صاحب نے خان بہادری کے معزز خطاب کے علاوہ بہت سے انعام خلعت اور طلائی تمغہ حاصل کیا۔ مرزا غالب کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ فغان بیخبر اور خونبابۂ جگر ان کی بیش بہا تصانیف ہیں۔ عام طور پر صاف اور سلیس نثر لکھتے تھے۔ لیکن تقریظیں غالب کی طرح قدیم رنگ میں ہیں۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔

سید علی بلگرامی | شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی بلگرام کے مشہور خاندان سے تھے۔ ہندوستان میں تعلیم ختم کرنے کے بعد سالار جنگ کے خرچ پر انگلستان گئے۔ جہاں ہندوستان سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی۔ سنسکرت فارسی عربی کے علاوہ بنگلہ۔ مرہٹی اور تلنگی بھی خوب جانتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے زبردست معاون تھے۔

تمدن عرب اور تمدن ہند ان کی بیحد مشہور کتابیں ہیں جو حضور نظام کے ایماء سے لکھی تھیں۔ تمدن عرب ڈاکٹر لیبان کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک ڈاکٹری کی کتاب کا بھی اردو ترجمہ کیا

سید حسین بلگرامی | آنریبل نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی سی۔ آئی۔ ای۔ ڈاکٹر سید علی بلگرامی کے بڑے بھائی۔ علمی اور ادبی قابلیت میں اگرچہ چھوٹے بھائی سے چھوٹے تھے لیکن پبلک اور سیاسی زندگی میں ان سے یقیناً افضل تھے۔ عرصہ دراز تک حیدرآباد میں معزز عہدوں پر سرفراز رہے۔ پھر سیکرٹری آف سٹیٹ کی کونسل میں چلے گئے۔

کوئی تصنیف یادگار نہیں چھوڑی۔ صرف چند علمی مضامین ہیں۔ جو ساڑھے چار سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ دائرۃ المعارف جس کا مقصد کمیاب اور مفید عربی کتابیں شائع کرنا تھا۔ انہی کی کوشش سے قائم ہوا تھا۔ انہوں نے بہت سا وقت قرآن کے انگریزی ترجمے پر بھی صرف کیا۔ مگر افسوس کہ وہ ناتمام رہ گیا۔

مولوی عزیز مرزا | مولوی عزیز مرزا بی۔ اے اپنے زمانہ کے مشہور نثاروں میں سے تھے۔ انہوں نے ۱۸۵۵ء میں علیگڑھ کالج سے بی۔ اے کیا۔ حیدرآباد میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ آخر میں ہوم سیکرٹری ہو گئے تھے۔ فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد اپنا وقت علمی مشاغل میں صرف کرتے تھے۔ گلگشت فرنگ یعنی اُردو ترجمہ سفرنامہ انگلستان نواب فتح نواز جنگ مہدی حسن، سیرۃ المحمود یعنی شاہان بہمنی کے مشہور وزیر خواجہ جہاں عماد الدین محمود گاواں کے حالات زندگی اور کالیداس کے مشہور ڈرامے "وکرم اروسی" کا اُردو ترجمہ ان کی تصانیف ہیں۔

مولوی صاحب کو پُرانے سکّے جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ ان کا مجموعہ سکہ جات بہت اعلیٰ درجے کا خیال کیا جاتا تھا۔ مضامین "خیالات عزیز" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ علی گڑھ کالج اور مُسلمانوں کی تعلیم سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ مُلازمت کے بعد آل انڈیا مُسلم لیگ کے سیکرٹری ہوئے۔ اور اپنے فرائض نہایت قابلیّت سے انجام دیئے۔ ۱۹۱۲ء میں انتقال ہوا۔ ان کی تحریریں نہایت سلیس۔ دلکش اور بیجا لفاظی سے مُعرّا ہیں۔

مولوی عبدالحق | مولوی عبدالحق صاحب انجمن ترقّی اُردو کے آنریری سیکرٹری اور رسالہ اُردو کے قابل ایڈیٹر ہیں۔ مولوی صاحب انجمن ترقّی اُردو کی رُوح ہیں۔ دکن میں ان کی محنت اور جانفشانی سے زبان اُردو نے بیحد ترقی کی۔ ان کی زیر نگرانی نہایت مفید تراجم تالیفات تصنیفات اور نایاب عربی فارسی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اکثر مطبوعات پر نہایت مفید اور فاضلانہ مقدمہ لکھے ہیں۔ جن سے انکی تحقیقات علمی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین رسالہ اُردو اور دوسرے جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

مولوی صاحب مُنکسرالمزاج اور خاموش کام کرنے والوں میں سے ہیں۔ ان کی تنقیدیں نہایت عالمانہ اور مُنصفانہ ہوتی ہیں۔ اُردو نثر لکھنے والوں میں ان کا رُتبہ بہت بلند ہے ان کی تحریریں نہایت سادہ

اور عام فہم ہوتی ہیں۔ زبان پر پوری قدرت حاصل ہے سکسینا صاحب کا خیال ہے ان کی طرز تحریر حالی سے ملتی ہے بلکہ زمانہ حال کی ضرورتوں اور جدت طرازیوں کا خیال کیا جائے تو ان سے بھی بہتر ہے۔

مولوی وحیدالدین سلیم سلیم صاحب بھی موجودہ زمانے کے نامور نثاروں میں سے تھے۔ ان کے والد حاجی مولوی فیروز الدین اپنے وطن پانی پت میں شاہ شرف علی قلندر کے مزار کے متولی تھے سلیم ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور گئے۔ وہاں عربی کی تکمیل مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے کی۔ اور معقول و منقول مولانا عبداللہ ٹونکی سے پڑھے۔ انٹرنس اور منشی فاضل بھی پاس کیا۔ ابتدا میں قانون کی طرف خیال تھا، لیکن ریاست بہاولپور کے محکمہ تعلیم میں کوئی جگہ مل گئی۔ پھر رام پور ہائی سکول کے ہیڈ مولوی ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد اُن کے مربی اور قدردان جنرل عظیم الدین خاں کے قتل کا ناگوار حادثہ پیش آیا۔ دل برداشتہ ہو کر ملازمت ترک کر دی، اور پانی پت آکر مطب اور دواخانہ کھول لیا۔ مولانا حالی کی وساطت سے سرسید سے ملاقات ہو گئی۔ سرسید ان سے مل کر اس قدر خوش ہوئے کہ اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنا لیا۔ سلیم سرسید کی زندگی بھر ان کے ساتھ رہے۔ وہ سرسید کو تصنیف و تالیف کے کام میں بہت مدد دیتے تھے۔

سرسید کے بعد انہوں نے رسالہ معارف نکالا جو کچھ مدت تک کامیابی سے چلا۔ پھر نواب محسن الملک کے اصرار پر علی گڑھ گزٹ کے ایڈیٹر ہو گئے۔ مگر تھوڑے دنوں بعد بوجہ علالت دستبردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد مسلم گزٹ لکھنؤ کے ایڈیٹر ہوئے۔ مسجد کانپور کے ہنگامے کے متعلق کچھ تیز مضامین لکھنے پر یہ جگہ بھی چھوڑنی پڑی۔ کچھ مدت زمیندار اخبار کے بھی چیف ایڈیٹر رہے۔ آخر زمیندار کی ضمانت ضبط ہو جانے سے ان کو بھی علیحدہ ہونا پڑا۔

ان کی مضمون نگاری اور ترجمے کی شہرت سن کر دارالترجمہ حیدرآباد بلایا گیا۔ وہاں رہ کر وضع اصطلاحات تصنیف کی۔ جب عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو اسسٹنٹ پروفیسر اردو ہوئے اور چار برس بعد پروفیسر ہو گئے۔

سلیم مرحوم کی طرز تحریر نہایت زوردار سلیس اور معنی خیز ہے۔ ان کے ہاں کہیں کہیں جذبات کے مرقعے بھی نظر آتے ہیں۔ غیر مانوس عربی فارسی الفاظ کے شائق کے نہیں۔ بلکہ مولانا حالی کی طرح شستہ اور سریلے الفاظ اپنی تحریروں میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ وضع اصطلاحات ان کی

معرکۃ الآرا تصنیف ہے "تلسی داس کی شاعری" "اردو دیومالا" اور "عرب کی شاعری" پر اعلیٰ درجے کے مضامین رسالہ "اردو" میں لکھے تھے۔

شیخ عبدالقادر | خان بہادر سر عبدالقادر اردو ادب کے مستقل محسنوں میں سے ہیں۔ لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ والد لدھیانہ میں محکمہ مال میں ملازم تھے۔ شیخ صاحب پندرہ برس کے تھے۔ کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ۱۸۹۴ء میں فورمین کرسچین کالج لاہور سے بی۔ اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اور پنجاب آبزرور کے ایڈیٹوریل سٹاف میں داخل ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں چیف ایڈیٹر ہو گئے۔ ۱۹۰۴ء میں اخبار سے قطع تعلق کر کے بیرسٹری کے لئے انگلستان گئے۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد ممالک یورپ اور بلاد اسلامیہ کی سیر کرتے ہوئے ہندوستان واپس آئے۔ پہلے دو برس دہلی میں پریکٹس کی پھر لاہور آ گئے۔ ۱۹۱۱ء میں لائل پور میں سرکاری وکیل ہوئے، اور ۱۹۲۰ء میں یہ عہدہ ترک کر کے لاہور میں پھر وکالت شروع کی۔ ۱۹۲۱ء میں پنجاب ہائیکورٹ کے عارضی جج مقرر ہوئے۔ پھر ایک سال تک ایڈیشنل جج رہے۔

۱۹۲۳ء میں لیجسلیٹو کونسل پنجاب کے ممبر منتخب ہوئے۔ اور پھر ڈپٹی پریزیڈنٹ اور پریزیڈنٹ بھی رہے۔ ۱۹۲۵ء میں پنجاب کے وزیر تعلیمات ہوئے۔ اور ۱۹۲۶ء میں بین الاقوامی لیگ کے ساتویں اجلاس میں ہندوستان کی طرف سے نمائندہ ہو کر جینوا گئے۔ چند سال انگلستان میں انڈیا کونسل کے ممبر رہے۔ اور اپنے فرائض منصبی نہایت نیک نامی سے انجام دیئے۔ شیخ صاحب پبلک اور گورنمنٹ دونوں کے نزدیک نہایت عزیز اور محترم ہیں۔

آپ کو زبان اردو کے ساتھ ایک خاص لگاؤ ہے۔ گذشتہ صدی میں زمانہ حال کے شعرا اور نثاروں پر انگریزی میں لکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ جو کتاب کی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ اور ادبی دنیا میں بیحد مقبول ہیں۔

۱۹۰۱ء میں شیخ صاحب نے رسالہ "مخزن" جاری کیا۔ ۱۹۱۱ء تک آپ خود ہی اس کے ایڈیٹر رہے۔ اس رسالے کے ذریعے انہوں نے اردو ادب کی ایسی شاندار خدمات انجام دیں جو اردو زبان کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔ اس رسالے میں ہندوستان کے چوٹی کے ادیبوں کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ شیخ صاحب نے اپنے حسن اخلاق سے ہر خیال کے ادیبوں کو اردو زبان کی خدمت کیلئے

اِس طرح اپنا ہم خیال کر لیا تھا۔ کہ اس کی نظیر ہندوستان میں کوئی دُوسرا رسالہ پیش نہیں کر سکا۔
شیخ صاحب کے زمانے کے مخزن کے چیدہ چیدہ مضامین انتخاب مخزن کے نام سے کئی جلدوں میں چھپے ہیں۔ نیز ان کے اپنے مضامین بھی الگ شائع ہو گئے ہیں۔ جو بیش قیمت معلومات، پُر لطف خیالات کا مجموعہ ہیں۔ اور سادہ اور دلچسپ طرز تحریر کی بدولت مقبول خاص و عام ہیں۔

پنڈت منوہر لال زتشی ۱۸۷۶ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت کنہیا لال پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں مُلازم تھے۔ ۱۸۸۶ء میں والد کا انتقال ہوا۔ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے کننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کیا۔ ۱۸۹۷ء میں ٹریننگ کا امتحان پاس کر کے کسی سکول میں ٹیچر ہو گئے۔ ۱۹۰۲ء میں ایم۔ اے کا امتحان دیا اور اوّل رہے۔ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۰ء تک ٹریننگ کالج الہ آباد میں پروفیسر رہے۔
اس مُدت میں انہوں نے انگریزی اُردو رسالوں میں عالمانہ مضامین لکھے۔ ۱۹۱۶ء میں چند سال ہیڈ ماسٹر رہنے کے بعد انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ ایک سال بنارس یونیورسٹی کے رجسٹرار اور ایک سال ٹریننگ کالج الہ آباد کے پرنسپل بھی رہے۔ ۱۹۱۹ء میں لوکل گورنمنٹ کے انڈر سیکرٹری اور ۱۹۲۱ء میں ایک سال کے لئے قائم مقام اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات ہوئے۔ جوبلی کالج لکھنؤ کے پرنسپل ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔ گلدستہ ادب اور "ایجوکیشن ان برٹش انڈیا" ان کی تصنیف ہیں۔ غالب اور چکبست پر کچھ نہایت فاضلانہ مضمون لکھے۔ اکثر ادبی مباحثوں میں بڑے شوق سے حصّہ لیتے تھے۔ کُتب بینی کا بہت شوق تھا۔ بہت مُنصف مزاج اور غیر جانب دار نقاد تھے۔ کبھی کبھی پُرانے رنگ اور زمانۂ حال کے زبردستی کے شاعروں کی خُوب خبر لیا کرتے تھے۔

منشی دیا نرائن نگم ۱۸۸۲ء میں کانپور میں ایک معزز کایستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا منشی شیو سہائے ایک مشہور وکیل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیئرمین تھے۔ نگم صاحب نے ۱۸۹۹ء میں کرائسٹ چرچ کالج کانپور سے بی۔ اے کیا۔ اور اسی سال اپنا قابل فخر رسالہ "زمانہ" نکالا۔ ۱۹۱۲ء میں "آزاد" جاری کیا۔ جو چند روز روزانہ رہ کر ہفتہ وار ہو گیا۔ منشی صاحب ۱۹۱۵ء میں آنریری مجسٹریٹ بھی ہو گئے تھے۔ معاشی۔ سیاسی۔ علمی۔ ادبی تعلیمی اور اخباری مشاغل میں ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ اصلاح معاشرہ کے معاملات میں نہایت آزاد خیال اور سیاسیات میں اعتدال پسند ہیں۔ رسالہ "زمانہ" ان کو بہت محبوب ہے۔ اور وہ اب تک نہایت کامیابی سے جاری ہے۔ نگم صاحب اپنا عزیز وقت اور روپیہ

اس پر بے دریغ صرف کرتے ہیں۔ اس رسالے کے ذریعہ وہ اُردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ "زمانہ" کی بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ اس میں ہندو مسلمان برابر کا حصّہ لیتے ہیں۔ اور اعلیٰ درجے کے علمی ادبی مضامین اس میں نکلتے رہتے ہیں۔ ان کے اپنے مضامین نہایت عمدہ اور غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ نگم صاحب ہندوستانی اکاڈیمی کے ایک پُرجوش ممبر ہیں۔

لالہ سری رام دہلوی لالہ سری رام ایم۔ اے دہلی کے ایک مشہور خاندان سے تھے جس کا سلسلہ اکبر کے وزیر راجہ ٹوڈرمل سے ملتا ہے۔ ان کے بزرگ سلاطین مغلیہ کے عہد میں معزز عہدوں پر ممتاز رہے اور والد آنریبل رائے بہادر مدن گوپال ایم۔ اے بار ایٹ لاء اور عم بزرگوار رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب کو کون نہیں جانتا۔ آشوب فن تعلیم کے ماہر اور آزاد اور حالی کے دوست تھے۔

سری رام ۱۸۷۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی میں پاکر اپنے والد کے ساتھ لاہور گئے۔ وہاں بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۸۹۵ء میں ایم۔ اے اور منصفی کا امتحان پاس کر کے منصف ہوئے۔ لاہور اور امرتسر میں چند سال منصفی کی۔ آخر دمہ کی شدت سے ۱۹۰۷ء میں سرکاری مُلازمت سے مستعفی ہو گئے۔ بقیہ عمر علمی مشاغل اور جائداد کے انتظام میں صرف کی۔ نہایت قابل۔ خوش تقریر خلیق اور ملنسار تھے۔ ان کا خاندان ہمیشہ سے علم و فضل۔ پبلک خدمات اور سخاوت و امارت کی وجہ سے مشہور رہا ہے۔ ان کی لائبریری میں نادر علمی کتابوں۔ تصویروں اور دیوانوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ یہ تمام چیزیں ان کے انتقال کے بعد بنارس یونیورسٹی کو دیدی گئیں۔ تذکرہ ہزار داستان المعروف بہ خمخانۂ جاوید کے مُصنّف ہیں۔ اس تذکرے کی پانچ ضخیم جلدیں چھپ چکی ہیں اور ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ اس کی ترتیب میں انہوں نے بیحد محنت اور روپیہ صرف کیا۔ اس تذکرہ کو اگر نظم اُردو کی انسائیکلوپیڈیا یعنی قاموس اعظم کہیں تو بیجا نہیں۔ اس کے ذریعے سینکڑوں گمنام شاعر رُوشناس ہوئے۔ ان میں سے بعض کا ذکر اگر ہم تک نہ بھی پہنچتا تو کوئی ہرج نہ تھا۔ انداز بیان اس قدر مہذّب ہے کہ اچھوں کا تو ذکر ہی کیا بُروں کو بھی بُرا نہیں کہا۔ بعض جگہ کچھ غلط بیانیاں بھی ہو گئی ہیں۔ جن کی بعض لوگوں نے تصحیح کر دی ہے۔ اتنی بڑی کتاب میں غلطیاں ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ فاضل مُصنّف نے نہایت محنت سے ہر شاعر کے چوٹی کے

اشعار منتخب کئے ہیں۔ عبارت بھی نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے۔

لالہ صاحب نے ۱۸۹۸ء میں دیوان انور اور ۱۹۰۲ء میں مہتاب داغ اور ضمیمہ مہتاب داغ بھی نہایت عمدگی سے شائع کیا تھا۔

دیگر نثاران اُردو | آجکل نامور اردو نثاروں کی بہت کثرت ہے حقیقتاً ان کے حالات لکھنے کے لئے ایک علیحدہ تذکرے کی ضرورت ہے۔ اِس لئے یہاں ان کے نام ہی لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) پنڈت بشن نرائن دُر شاعر بھی تھے۔ اُردو اور انگریزی میں نہایت فاضلانہ تنقیدیں بھی لکھا کرتے تھے۔ سرشار کے متعلق ان کے مضامین اور شیخ عبدالقادر کے نیو سکول آف اُردو لٹریچر پر ان کی تقریظ بہت دلچسپ اور پُراز معلومات ہے۔

(۲) مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، ڈپٹی کلکٹر نہایت خوشگو شاعر اور سخن سنج ہیں۔ ان کا کلام نہایت صاف اور زوردار ہے۔ میر اور سودا کے متعلق ان کے مضمون نہایت عمدہ ہیں۔

(۳) احسن مارہروی، فن تنقید میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ دیوان ولی کو نہایت قابلیت سے مرتب کیا۔ "اُردو لشکر" ان کی عمدہ تصنیف ہے۔ اس میں نظم اُردو کی درجہ بدرجہ ترقیوں کو نہایت خوبی سے دکھایا ہے۔ خیالات آزاد اور زبان زوردار ہے۔ لیکن ذاتیات کی بحث بدمزگی پیدا کر دیتی ہے۔

(۴) حامد اللہ افسر۔ رشید احمد صدیقی۔ سید مسعود حسن رضوی۔ عبدالمجید سالک۔ پروفیسر نامی۔ پروفیسر ضامن علی لکچرار الہ آباد یونیورسٹی اُردو زبان کے نہایت اعلیٰ درجے کے ادیب ہیں۔

(۵) حسرت موہانی۔ نظم اُردو اور فن تنقید میں عدیم المثال ہیں۔ ان کے خیالات اکثر طبع زاد اور مؤثر ہوتے ہیں۔

(۶) سلطان حیدر جوش ایک مخصوص رنگ کے نہایت عمدہ لکھنے والے ہیں۔

(۷) سید سجاد حیدر یلدرم۔ افسانہ نما نثر بہت خوب لکھتے تھے۔ عبارت نہایت دلچسپ اور دلفریب ہے۔ ترکی بھی جانتے تھے۔ خیالستان ان کی مشہور و مقبول تصنیف ہے۔ چند اور کتابوں کے بھی مصنّف ہیں۔

(۸) مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار، اخبار نویسی میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ زبردست مضمون نگار اور محسن زبان ہیں۔ ان کی اکثر تصانیف چھپ چکی ہیں۔ فی البدیہہ کہنے میں مشاق ہیں۔

(۹) مولانا ہاشمی فریدآبادی، بہت سی کتابوں کے مصنّف ہیں۔ ادبائے دکن میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

(۱۰) مہدی حسن، بہت اچھے لفظی مصوّر اور صاحب طرز تھے۔ افادات مہدی کے نام سے ان کے مضمون چھپ گئے ہیں۔ افسوس کہ جوانی میں فوت ہو گئے۔

جدید نثر اُردو کی دو طرزیں زمانہ حال میں ادیبوں نے اس قدر طرزیں اختیار کی ہیں۔ کہ ان پر رائے زنی کرنی بہت دُشوار ہے۔ یہاں صرف دو مخصوص طرزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلی طرز عربی اُردو اور ہندی اُردو اکثر لوگ اپنی عبارت میں عربی فارسی کے مشکل اور غیر مانوس الفاظ اس لئے استعمال کرتے ہیں۔ کہ عبارت شاندار معلوم ہو۔ اس طرز کی ابتدا اس طرح ہوئی۔ کہ سر سیّد اور ان کے رفقائے سیدھی سادی عبارت لکھنی شروع کی۔ تھوڑی مدّت بعد یہ طرز جدّت پسند طبیعتوں کو روکھی پھیکی معلوم ہونے لگی۔ انہوں نے اس میں رنگینی اور علمیّت ظاہر کرنے کے لئے عربی فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ اس طرز کو سر سیّد کی طرز کا ردّ عمل کہا جا سکتا ہے۔

سکسینا صاحب کے نزدیک اس طرز کے مخترع مولنٰا ابو الکلام آزاد ہیں۔ لیکن ان کی تحریروں میں وہ خرابیاں اور لغزشیں مطلق نہیں ہوتیں۔ جو ان کے مقلدوں کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ یہ طرز ان لوگوں کو نہایت مرغوب ہے جو مذہب کے دعویدار ہیں۔

اس مذہبی طرز کے مقابلے میں ہندوؤں نے بھی ایک نئی طرز اختیار کی جس میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بکثرت استعمال کرنے شروع کئے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس قسم کی تحریریں ایک مختصر جماعت تک محدود ہیں۔ اور ہی خواہانِ اُردو اس کے خلاف سخت صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔

دُوسری طرز۔ خیالی یعنی ٹیگوری اُردو یہ طرز سر رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور تصنیف گیتان جلی کے تتبع میں اختیار کی گئی ہے لیکن نقالوں کی تحریروں میں سوائے تسلسل الفاظ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ تصوف سے واقف ہیں، نہ حقیقی تخئیل کو جانتے ہیں۔ ان کی تحریریں عام طور پر مطلق العنان ہوتی ہیں۔ اور مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ اس قسم کی نثر افسانہ سے شروع ہوئی ہے۔ اس کی بدولت سے لوگ بے تکلفانہ نثار بن بیٹھے۔ اس سے بھی ادب اُردو کو کچھ نہ کچھ ضرور فائدہ پہنچا۔ یہ طرز اب غیر مقبول ہو گئی ہے۔

پُرانی اخبار نویسی کی دُنیا ۱۸۳۶ء میں پریس کو آزادی ملی۔ ۱۸۳۸ء میں مولانا آزاد کے والد مولانا محمد باقر نے

دلی سے اُردو کا سب سے پہلا اخبار جاری کیا۔ یہ ادبی شان کا پرچہ تھا۔ اس میں ذوق۔ غالب۔ مومن اور معاصرین کی غزلیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ کبھی زبان اور محاورات کی بحث بھی چھڑ جاتی تھی۔ مدتوں تک اُستاد ذوق کی وفات کی تاریخیں اور شہیدی کی شاعری پر مباحثہ مسلسل اس میں چھپا تھا۔

۱۸۶۰ء میں ہرسکھ رائے نے لاہور سے کوہ نور نکالا۔ یہ پرچہ ریاستوں میں بھی مقبول تھا۔ مہاراجہ کشمیر و پٹیالہ اس کی اور اس کے مالک کی بڑی قدر کرتے تھے۔ پہلے ہفتہ وار تھا۔ پھر دو مرتبہ ہو کر تین بار نکلنے لگا۔ آخر کوہ نور کو انہی لوگوں کے ہاتھوں زوال ہوا جو اس میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے یہاں سے کام سیکھ کر اپنے پرچے نکالنے شروع کر دیئے۔ منشی نولکشور بھی اسی کے سٹاف میں تھے۔

شعلہ طور اور مطلع نور کانپور سے پنجابی اخبار اور انجم الاخبار لاہور سے۔ اشرف الاخبار دہلی سے۔ وکٹوریا سیالکوٹ سے۔ قاسم الاخبار بنگلور سے۔ کشف الاخبار بمبئی سے۔ کارنامہ لکھنؤ سے اور جریدہ روزگار مدراس سے نکلا۔ مگر تھوڑی تھوڑی مدت بعد یہ پرچے بند ہو گئے۔

اودھ اخبار منشی نولکشور نے ۱۸۵۸ء میں جاری کیا۔ یہ اخبار اب تک نکلتا اور اپنے صوبے کے اعلیٰ درجے کے اخباروں میں شمار ہوتا ہے۔ شروع میں اس میں محض خبریں شائع ہوتی تھیں۔ کوئی خاص پالیسی بھی نہ تھی وہ محض سیاسی شورش کے خلاف تھا۔ پہلے ہفتہ وار، پھر روزانہ ہوا۔ اس کا سٹاف نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔ شمس الاخبار مدراس اس کا معاصر اور مسلمانوں کا اخبار تھا۔ لیکن تھوڑی مدت چل کر بند ہو گیا۔ اخبار عام لاہور سے پنڈت مکند رام نے نکالا۔ وہ بھی کوہ نور میں ملازم تھے۔ یہ پرچہ مدتوں گورنمنٹ میں مقبول رہا۔ اس کی کم قیمت نے لوگوں کے دلوں میں اخبار بینی کا شوق پیدا کر دیا۔ اس کی زبان اخباری تھی۔ اور اس میں کوئی خاص خوبی نہ تھی۔ پہلے ہفتہ وار تھا۔ پھر سہ روزہ اور دو روزہ ہو گیا۔

"اودھ پنچ" ہندوستان کا مشہور ظرافت کا پرچہ لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا۔ وہ ہر بات نہایت آزادی سے ظریفانہ انداز میں لکھتا تھا۔ اس کی انشاپردازی اعلیٰ درجے کی تھی کسی خاص فرقہ سے تعلق نہ تھا۔ منشی سجاد حسین اس کے قابل ایڈیٹر تھے۔ اس اخبار کی سینکڑوں نے نقالی کی۔ لیکن اس معیار پر کوئی نہیں پہنچ سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پرچے نے اخباری دنیا میں ترقی کے نئے نئے راستے کھول دیئے۔

۱۸۸۳ء میں "ہندوستانی" لکھنؤ سے جاری ہوا۔ یہ پہلا پرچہ تھا۔ جو سیاسیات پر بڑی آزادی اور زور سے بحث کرتا تھا۔ پہلے ہفتہ وار تھا۔ پھر سہ روزہ ہو گیا۔ اس کی زبان میں ادبیت نہ تھی۔ اسی شان کا دوسرا پرچہ

لاہور سے رفیق ہند نکلتا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں لاہور سے مولوی محبوب عالم نے پیسہ اخبار نکالا۔ جو ارزاں قیمت اور عمدگی مضامین کے باعث مدتوں مقبول رہا۔

ادبی اُردو رسالے

ادبی رسالوں میں مولانا شرر کا "دلگداز" پرانا رسالہ ہے۔ جو ابھی نکل رہا ہے۔ "زمانہ" کانپور سے منشی دیا نرائن نگم نکالتے ہیں۔ ادیب الہ آباد کا نہایت عمدہ رسالہ تھا۔ مگر تھوڑی مدت بعد بند ہو گیا۔ الناظر مولانا ظفر الملک کا نہایت آزاد خیال پرچہ ہے ہزار داستان لاہور میں صرف افسانے نکلا کرتے تھے۔ شباب اردو اور ہمایوں اب تک لاہور سے نکل رہے ہیں "نگار" کو مولانا نیاز فتحپوری آجکل لکھنؤ سے شائع کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں اردو ادب کا سب سے سستا اور عمدہ پرچہ مولانا تاجور کا "ادبی دنیا" تھا۔ جو اب بھی لاہور سے بڑی شان وشوکت کے ساتھ نکلتا ہے۔

موجودہ دور میں شاہکار و ہمایوں لاہور۔ ساقی دہلی۔ معارف اعظم گڑھ اور اردو انجمن ترقی اُردو دہلی بہترین ادبی رسالے ہیں۔ سہیل علی گڑھ سے بہت درخشندہ مستقبل لے کر نکلا تھا۔ لیکن تھوڑی مدت بعد بند ہو گیا۔ ایک زمانہ میں مولانا حسرت موہانی کا اُردوئے معلّٰی بھی بہت پائے کا پرچہ تھا۔

سب اُردو رسائل کے نام گنوانا بہت مشکل کام ہے۔ اکثر رسائل بڑی آب و تاب سے جاری ہوتے ہیں۔ مگر بہت جلدی ناکامیاب ہو کر بند ہو جاتے ہیں۔ اخبار نویسوں اور ایڈیٹروں کے حالات لکھنے کی ان تنگ صفحات میں گنجائش نہیں۔ ادبی رسالوں کے ایڈیٹروں میں مولانا ظفر الملک۔ میاں بشیر احمد ایڈیٹر "ہمایوں" اور شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی ایڈیٹر مجلہ "شاہکار" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اخباروں کے ایڈیٹروں کے متعلق مولوی محمد الدین فوق ایڈیٹر اخبار کشمیری لاہور نے "اخبار نویسوں کے حالات" کے نام سے ایک مختصر سی کتاب لکھی ہے۔ جو قیمتی معلومات سے لبریز ہے۔

(۱۸)

اُردو ناول کی ابتدا

شرر اور سرشار کا زمانہ

اُردو کے پُرانے قصے

افسانے اور قصے سُننے کا شوق اِنسان کے دل میں فطری طور پر موجود ہے۔ جب اُردو زبان نے مستقل حیثیت اختیار کی تو اس میں بھی افسانوں اور قصوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بہت سے قصے فارسی سے اُردو میں ترجمہ ہوئے۔ بعض عربی اور سنسکرت سے براہ راست آئے یا دونوں زبانوں کے قصوں کو گھٹا بڑھا کر اخذ کئے گئے۔

عام طور پر ان قصوں میں جنوں اور پریوں کے ذکر ہیں بعض اخلاقی ہیں اور بعض مخرب الاخلاق، انداز بیان سب کا ایک ہی طرح پر ہے۔ واقعات تقریباً یکساں ہیں۔ عجائب و غرائب کا ذکر بھی عام طور پر ہر ایک قصے میں موجود ہے۔ اِنسان دیو پریاں آپس میں بے تکلفانہ ملتے ہیں۔ جادو کا بیان کیا جاتا ہے۔ غرض ہر قصہ روزمرہ کے واقعات سے خالی اور جدت سے عاری ہے۔ شروع میں یہ قصے فورٹ ولیم کالج سے شائع ہوئے۔ اور اب مطبع نولکشور میں بڑی آب و تاب سے چھپتے ہیں۔

اقسام قصص

(۱) الف لیلہ (۲) بوستان خیال (۳) داستان امیر حمزہ معہ طلسم ہوشربا (۴) قصہ حاتم طائی و باغ و بہار وغیرہ (۵) ہندوستانی قصے مثلاً گل بکاولی۔ کلیلہ دمنہ۔ بیتال پچیسی۔ سنگاسن بتیسی وغیرہ۔

مطبع نولکشور لکھنؤ

اس مطبع کے بانی منشی نولکشور تھے۔ نولکشور ۱۸۳۶ء میں بستوئی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا آگرے میں سرکاری خزانچی تھے اور والد منشی جمنا داس کچھ کاروبار کرتے تھے۔ منشی نولکشور خود ساختہ آدمی تھے۔ ان کو اخبارات کا بہت شوق تھا۔ وہ ایک مُدت تک ہرسکھ رائے کے ماتحت اخبار کوہ نور لاہور میں بھی کام کرتے رہے۔ غدر کے بعد مُلازمت ترک کر کے لکھنؤ میں سر رابرٹ منٹگمری اور کرنل ایبٹ کی سرپرستی میں مطبع نولکشور جاری کیا۔ جو بہت جلد ممالک ایشیا کے بڑے بڑے مطابع میں شمار ہونے لگا۔

منشی صاحب نے زر کثیر صرف کر کے عربی۔ فارسی سنسکرت اور ہندی وغیرہ کی کمیاب اور نادر کتابیں ان کے ترجمے اور شرحیں وغیرہ چھپوائیں۔ یہ کہنا بیجا نہیں کہ ہندوستان کی علمی ترقی کا باعث انہی کی ذات تھی۔ ۱۸۵۸ء میں انہوں نے اخبار اودھ نکالا۔ یہ اخبار بھی نہایت کامیاب پرچوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۸۹۵ء میں منشی صاحب نے انتقال کیا۔ اور تقریباً ایک کروڑ کا کاروبار چھوڑا۔ ان کے لائق فرزند رائے بہادر منشی پراگ نرائن نے بھی اپنے والد کی طرح خوب علمی خدمات کیں۔ اور اب ان کے فرزند منشی بشن نرائن نہایت کامیابی سے علم و ادب کی خدمات کر رہے ہیں۔

داستان امیر حمزہ صاحبقران یہ کتاب بہت ضخیم جلدوں میں ہے۔ اصل کتاب فارسی میں فیضی نے اکبر اعظم کی تفریح طبع کے لئے لکھی تھی۔ اس کے آٹھ دفتر ہیں، اور ہر دفتر میں صدہا صفحات کی کئی کئی جلدیں جن کی مجموعی تعداد سترہ ہے۔ سب سے مشہور دفتر اول یعنی نوشیروان نامہ دو جلدوں میں اور دفتر پنجم یعنی طلسم ہوشربا سات جلدوں میں ہے۔ طلسم ہوشربا کی اول چار جلدوں کا اُردو ترجمہ میر محمد حسین جاہ اور آخر تین جلدوں کا احمد حسین قمر نے کیا۔ ایک منظوم ترجمہ طوطا رام شایاں نے بھی کیا۔ نوشیروان نامہ کا ترجمہ منشی نولکشور نے شیخ تصدق حسین داستان گو سے کرایا۔ اس میں حضرت امیر حمزہ پیغمبر اسلام کے عم بزرگوار کا فرضی افسانہ لکھا ہے۔ اس ایک افسانے سے ہزاروں افسانے پیدا ہوتے چلے گئے ہیں۔

بوستان خیال یہ کتاب نو ضخیم جلدوں میں چار ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے مُصنّف میر تقی خیال سمجھے جاتے ہیں۔ جو گجرات کے رہنے والے تھے۔ مگر آخر میں دہلی میں آ رہے تھے۔ یہ قصہ انہوں نے اپنی معشوقہ کی دلچسپی کے لئے داستان امیر حمزہ کی طرز پر لکھا تھا۔ اس کتاب کو محمد شاہ رنگیلے نے بہت پسند کیا اور انہی کے حکم سے اس کی تکمیل ہوئی۔ پانچ جلدوں کا ترجمہ اُردو خواجہ بدر الدین المعروف خواجہ امان دہلوی نے اور دو جلدوں کا لکھنؤ میں چھوٹے آغا نے کیا۔ خواجہ صاحب نے پوری کتاب پر نظر ثانی بھی کی تھی۔

افسانہ اور ناول کی بیچ کی کڑی مرزا رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب سے لوگوں کے دلوں میں افسانے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کی عبارت مقفی اور مسجع ہے۔ فسانہ عجائب کو ناول تو نہیں کہہ سکتے لیکن ناول کی آفرینش میں اس سے بہت مدد ملی۔

مولوی نذیر احمد کے بعض قصے موجودہ ناول کی حدود تک پہنچ جاتے ہیں۔ مگر ان میں بھی ناول نویسی کے پُورے قواعد کو مد نظر نہیں رکھا گیا۔ وہ اول سے آخر تک نصیحت آمیز ہیں اور ایک وعظ کی حیثیت

رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب کا بڑا کمال یہ ہے۔ کہ انہوں نے گذشتہ زمانے کی طرز چھوڑ کر واقعات زندگی کو بیان کیا۔ زبان پران کو پوری قدرت حاصل ہے۔ اور سلسلہ واقعات کو خوب قائم رکھتے ہیں۔ کیریکٹر دلچسپ ہیں مگر ضرورت سے زیادہ ادب آموز۔ زبان میں بھی کہیں کہیں ثقالت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی سلاست اور روانی میں فرق نہیں آتا۔

اودھ پنچ اور اسکی ادبی خدمات منشی سجاد حسین مرحوم نے ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ جاری کر کے ہندوستانی اخبار نویسی اور اردو ادب میں ظرافت کی بنیاد ڈالی۔ زبان میں عمدہ الفاظ شامل کئے۔ ناول نویسی کو ترقی دی۔ اور نہایت بلند نقطہ نظر سے ادبی کتابوں پر تنقیدیں لکھیں۔ اودھ پنچ سب سے پہلا پرچہ ہے جس نے پبلک اور گورنمنٹ پر آزادانہ نکتہ چینی شروع کی۔ وہ ہندوستانی رؤساء کا ناصح اور محتسب۔ سوشل معاملات میں قدامت پسند۔ سرسید کا مخالف تعلیم نسواں اور ترک پردہ کا مخالف۔ اور کانگریس کے اصولوں کا حامی تھا۔

اودھ پنچ کی ظرافت جب ذاتیات پر آتی۔ تو اکثر غیر مہذب ہو جاتی تھی۔ اس میں حالی۔ داغ۔ گلزار نسیم اور فسانہ آزاد کے متعلق اکثر مضامین تہذیب سے گرے ہوئے نکلے۔ لکھنؤ کی طرز معاشرت اور سیر تماشے کے مضمون نہایت شاندار اور مزیدار ہیں۔

منشی سجاد حسین کے بعد اودھ پنچ مردہ ہو گیا۔ لیکن اس کی عنان ادارت حکیم ممتاز حسین عثمانی نے خود سنبھال کر ایک دفعہ پھر اس کی پرانی روایات کو زندہ کر دیا۔ اس وقت وہ ہندوستان بھر میں اپنے رنگ کا عدیم المثال پرچہ ہے۔

قدیم اور جدید اودھ پنچ کے نامہ نگاروں میں منشی سجاد حسین۔ مرزا مچھو بیگ عاشق (جو ستم ظریف کے نام سے لکھتے تھے) سرشار۔ تربھون ناتھ ہجر۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ اکبر الہ آبادی۔ نواب سید محمد آزاد وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ منشی صاحب کے والد منشی منصور علی ڈپٹی کلکٹر گورنمنٹ سے پنشن لیکر حیدرآباد گئے اور وہاں سول جج ہو گئے۔ سجاد حسین کاکوری میں ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے۔ انٹرنس پاس کر کے مختلف ملازمتیں کیں۔ آخر ۱۸۷۷ء میں اخبار اودھ پنچ لکھنؤ سے نکالا۔ سجاد حسین صاحب پہلے شخص ہیں، جنہوں نے ظریفانہ اخبار نویسی کی ہندوستان میں بنیاد ڈالی۔ نہایت نیکدل اور غیر متعصب شخص تھے۔ انہوں نے مذہبیت کو اپنے اخبار میں کبھی جگہ نہیں دی۔

ان کی تحریریں معلومات عامہ اور لطیف ظرافت سے مملو ہوتی ہیں۔ عبارت میں شستگی اور بیساختگی ہمیشہ نمایاں رہتی تھی۔ ان کے ناول حاجی بغلول۔ طرحدار لونڈی۔ پیاری دُنیا۔ احمق الذین۔ میٹھی چھری۔ کایا پلٹ۔ حیات شیخ چلی بہت مشہور ہیں۔ منشی صاحب ۱۹۰۱ء میں فالج میں مبتلا ہو کر بہت تکالیف کی زندگی بسر کر کے ۱۹۰۵ء میں فوت ہوئے۔

مرزا مچھو بیگ عاشق | مرزا محمد مرتضیٰ نام، عاشق تخلص کرتے تھے۔ ان کے والد مرزا اصغر علی شرفائے لکھنؤ میں بہت ممتاز تھے۔ بچپن میں ورزش کا بہت شوق تھا۔ شاعری میں نسیم دہلوی کے شاگرد تھے۔ رنگین طبع شاعر تھے۔ مگر ادبی دُنیا میں اپنی نثر کی بدولت مشہور ہوئے۔ ستم ظریف کے نام سے اودھ پنچ میں مضمون لکھا کرتے تھے۔ ان کے مضامین کی زبان نہایت صاف شستہ اور بذلہ سنجی نہایت لطیف ہوتی تھی۔ وہ خود بھی نہایت ظریف۔ متواضع۔ خلیق اور وسیع الاحباب تھے۔ خودداری اور آزادی کی وجہ سے مُلازمت نہیں کرتے تھے۔ سیاسیات سے گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ایک دفعہ کانگرس کے ڈیلی گیٹ بھی منتخب ہوئے۔ منشی گپتا ان کے مشہور شاگرد تھے۔

تصانیف منظوم "گلزار نجات" میلاد شریف۔ آفتاب قیامت، لکچر کے انداز میں ظریفانہ نظم، "بہار ہند"۔ اُردو محاورات کی ناتمام لُغات اور مثنوی نیرنگ خیال" "چشم بصیرت یعنی مجموعۂ مضامین۔

تربھون ناتھ ہجر | پنڈت بشمبر ناتھ سپرو کے بیٹے ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ کننگ کالج لکھنؤ میں انگریزی تعلیم پا کر اخبار نویسی کا مشغلہ اختیار کیا۔ کچھ دنوں لکھنؤ میں وکالت بھی کی۔ نہایت شریف ملنسار اور ہر دلعزیز انسان تھے۔

نواب سید محمد آزاد | نواب صاحب ۱۸۴۶ء میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ مشرقی بنگال کے ایک معزز اور دولتمند خاندان کے رُکن تھے۔ ابتدائی تعلیم آغا احمد علی اصفہانی سے حاصل کی۔ یہ اصفہانی وہی بزرگ ہیں۔ جن سے مرزا غالب کے ساتھ برہان قاطع کے متعلق معرکے ہوئے تھے۔ نواب صاحب نے انگریزی بھی پرائیویٹ طور پر پڑھی تھی۔ پہلے سب رجسٹرار ہوئے۔ پھر ترقی کرتے کرتے انسپکٹر جنرل ہو گئے۔ دو دفعہ بنگال کونسل کے ممبر بھی ہوئے۔ عمدہ خدمات کے صلے میں انہیں آئی۔ ایس۔ او (امپریل سروس آرڈر) کا اعزازی نشان ملا۔ ۱۹۱۲ء میں ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔

شروع میں نواب صاحب فارسی اخبار میں مضامین لکھا کرتے تھے اس کے بعد اودھ پنچ۔ اودھ اخبار وغیرہ میں اُردو میں مضامین لکھنے لگے۔ ۱۸۷۸ء میں ان کا مشہور ناول "نوابی دربار" شائع ہوا۔ جس میں

فاقہ مست نوابوں کا بڑے ظریفانہ انداز میں خاکہ اُڑایا تھا۔ "نئی لغات" ان کی ظریفانہ رنگ کی مقفیٰ عبارت کی کتاب ہے۔ وہ خطوط جو انہوں نے انگلستان جا کر بھیجے تھے نہایت دلچسپ ہیں۔

جوالاپرشاد برق | برق ۱۸۶۳ء میں سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ کھیری سے انٹرینس اور ۱۸۸۲ء میں کنگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کر کے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۸۵ء میں منصف ہوئے اور پھر ترقی کرتے کرتے قائم مقام ڈسٹرکٹ جج اور سشن جج ہو گئے۔ ۱۹۰۹ء میں گریفن کمیٹی کے ممبر ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں پلیگ میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے۔ نہایت قابل شاعر اور نثار، فسانۂ آزاد کی طرز کے دلدادہ تھے۔ ان کی مثنوی بہار سرسید مرحوم کو بہت پسند تھی بنگالی دُلہن، پرتاب، روہنی، مرنالنی اور ما آستین وغیرہ بنکم چیٹرجی کے ناولوں کے ترجمے ہیں مگر ترجمہ معلوم نہیں ہوتے۔ شیکسپیئر کے بعض ڈراموں کے بھی ترجمے کئے۔ مگر وہ شائع نہ ہو سکے۔

احمد علی شوق قدوائی | شوق مرحوم آسیر کے شاگردوں میں سے تھے۔ غزل اور مثنوی خوب کہتے تھے۔ چند ناٹک بھی ان سے یادگار ہیں۔ جن میں "قاسم و زہرہ" اور "میکفرسن دلوسی" بہت مشہور ہیں۔ مثنوی لکھنے میں وہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ مثنوی زہر عشق اور عالم خیال ان کی بہت مقبول مثنویاں ہیں۔ عالم خیال ایک ستم رسیدہ عورت کی دُکھ بھری داستان ہے۔ جو اپنے شوہر کے انتظار میں بےچین ہے۔ ان کا دیوان بھی شائع ہو گیا ہے۔ فن عروض سے پوری طرح واقف تھے۔ نظم و نثر میں صفائی اور صحت زبان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ آخر عمر میں ریاست رامپور سے تعلق ہو گیا تھا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار | سرشار ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء میں لکھنؤ میں ایک معزز کشمیری خاندان میں پیدا ہوئے۔ چار برس کے تھے۔ کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ چھوٹے بھائی پنڈت بشمبر ناتھ در ڈپٹی کلکٹر اور بیٹے پنڈت نرنجن ناتھ در سرکاری خزانے میں مُلازم تھے۔

سرشار اپنے زمانہ میں نہایت باکمال اور زندہ دل شخص تھے۔ انگریزی۔ عربی۔ فارسی۔ تینوں زبانوں سے واقف تھے۔ انگریزی تعلیم کنگ کالج لکھنؤ میں پائی۔ سب سے پہلے ڈسٹرکٹ سکول کھیری میں ٹیچر ہوئے۔ اس وقت بھی وہ "اودھ پنچ" اور "مراسلہ کشمیری" میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ ترجمہ کرنے میں بڑی مہارت تھی۔ ڈائرکٹر تعلیم ان کے تراجم کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ انہیں کی معرفت وہ منشی نولکشور کے اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہوئے۔ انہوں نے سائنس کی کسی کتاب کا ترجمہ شمس الضحیٰ کے نام سے کیا۔ اس میں بعض اصطلاحات کا ترجمہ نہایت سلیس اردو میں ہے۔ اودھ اخبار کی

ایڈیٹری کے زمانہ میں انہوں نے فسانۂ آزاد کا سلسلہ شروع کیا۔ جو ۱۸۸۰ء میں کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔ اسی عرصے میں اودھ اخبار اور اودھ پنچ کی اخباری جنگ شروع ہوگئی۔ اس جنگ میں سرشار نے ترکی بہ ترکی جواب دیئے۔ آخر دوستوں کی کوشش سے مصالحت ہوگئی۔

سرشار کی تصانیف۔ سیر کہسار۔ جام سرشار۔ کامنی اور خدائی فوجدار بہت مشہور ہیں۔ کڑم دھڑم بچھڑی دلہن۔ طوفانِ بے تمیزی۔ پی کہاں وغیرہ میں ان کا زورِ بیان کچھ کم ہے۔

حیدرآباد جانے سے کچھ دنوں پہلے الہ آباد ہائیکورٹ میں مترجم ہوگئے تھے لیکن قواعد کی سختی سے تنگ آکر ملازمت ترک کر دی۔ ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد گئے۔ حضور نظام نے ان کو معزز درباریوں میں شامل کیا۔ مہاراجہ سرکرشن پرشاد نے دو سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا اور اپنا کلام نظم و نثر اصلاح کے لئے دیا۔

حیدرآباد میں کچھ عرصے تک "دبدبۂ آصفیہ" کے ایڈیٹر رہے۔ اس زمانے کی تصانیف گورِ غریباں اور چنچل کوئی خاص ادبی حیثیت نہیں رکھتیں۔ آخر عمر میں مے نوشی بہت بڑھ گئی تھی۔ اسی کی بدولت قبل از وقت ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔

سرشار شاعری میں اسیر کے شاگرد تھے۔ اور شعر خوب کہتے تھے۔ مثنوی تحفۂ سرشار جو انہوں نے پنڈت بشن نرائن در کی انگلستان سے واپسی پر لکھی تھی بہت مشہور ہے۔ اسی مثنوی کے ذریعہ انہوں نے قدامت پرست پنڈتوں کے دلوں سے اس برہمی کو دور کیا۔ جو ان کے انگلستان جانے سے پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک زوردار قصیدہ بھی ۱۸۹۴ء میں کشمیری کانفرنس میں پڑھا۔

اخلاق و عادات سرشار نہایت آزاد مزاج اور ظریف طبع تھے۔ حافظہ بہت اچھا پایا تھا۔ باتیں بڑے مزے کی کیا کرتے تھے۔ افسوس شراب خواری نے ان کی زندگی کا خاتمہ بہت جلد کر دیا۔ انگریزی طرز کے ارُدو ناول سب سے پہلے انہی نے لکھنے شروع کئے۔ وہ مشہور مصنف۔ زبردست جرنلسٹ اور نہایت عمدہ زبان داں تھے اور ایک خاص طرز کے موجد بھی۔ سکسینا صاحب لکھتے ہیں "ان کی شہرت کو کچھ لوگوں کے تعصب نے اور کچھ ان کی بے پروائی نے کم کر دیا۔ ان کی تصانیف میں جس قدر رطب و یابس اور گری ہوئی باتیں ہیں وہ ان کے مزاج کی جلد بازی۔ بے پروائی اور شراب نوشی کی وجہ سے ہیں لیکن جہاں شراب ان کا دماغ معطل اور بیکار کرتی ہے، وہاں ان کے تخیل میں قوت بلند پروازی بھی پیدا کر دیتی ہے۔" وہ کبھی اپنے مسودہ کو دوبارہ نہ دیکھتے تھے۔ ہمیشہ برجستہ مضامین لکھتے تھے۔ اگر کبھی قلم نہ ملتا تو تنکے ہی سے کام چلا لیتے تھے۔ مالک مطبع شراب کی

بوتل پیش کر کے ان سے جس قسم کا چاہتے فوراً مضمون لکھوا لیتے تھے۔ اسی بے اصولی کی وجہ سے اکثر انکے پلاٹ اور کیرکٹر بے ربط اور غیر مسلسل ہیں۔ باوجود ان کمزوریوں کے وہ خوددار اس قدر تھے۔ کہ کسی امیر یا رئیس کی خوشامد نہیں کی۔ اور جتنی شہرت پیدا کی اپنے کمالات سے کی۔

فسانۂ آزاد جب فسانۂ آزاد اودھ اخبار میں نکلتا تھا۔ تو لوگ ہر دوسرے پرچے کیلئے بیتاب رہتے تھے۔ اُردو دان حلقوں میں اس کتاب نے ایک عجیب ہلچل ڈال دی تھی۔

قصہ کا پلاٹ بہت بے ربط ہے۔ لیکن عبارت آرائی اس غضب کی ہے۔ کہ ہر سطر پر بے تحاشہ ہنسی آتی ہے، اور مطالعہ کا شوق مشتعل ہوتا جاتا ہے۔ یہ قصہ ڈھائی ہزار صفحوں پر پھیلا ہوا ہے لیکن کیا مجال جو کہیں پڑھنے والا بے لطف ہو جائے۔

اصل قصہ کا ہیرو آزاد بہت رنگین مزاج شخص ہے۔ پہلے ایک بھٹیاری کا عاشق تھا۔ پھر ایک دولتمند حسینہ پر بھی عاشق ہو جاتا ہے۔ وہ اس شرط پر عقد کرنے کو طیار ہوتی ہے۔ کہ میاں آزاد رُوسیوں کے خلاف لڑنے کیلئے ٹرکی جائیں۔ آزاد وہاں جاتا ہے اور زندہ واپس آکر اپنی معشوقہ سے نکاح کرتا ہے۔

اس معمولی سے قصے کو سرشار نے نگار خانۂ چین بنا دیا ہے۔ ساری دلچسپی اور عمدگی افراد قصہ کی باتوں میں ہے۔ نہ کہ قصہ میں۔ سرشار مکالمہ کے اُستاد ہیں۔ اور کیریکٹر اشخاص کی گفتگو سے دکھاتے ہیں۔

سرشار کی مرقع نگاری سرشار نہ تو رجب علی بیگ سرور کی طرح پُر تکلف اور مقفی عبارت لکھتے ہیں اور نہ سوتی ہوئی دُنیا کی سیر کراتے ہیں۔ ان کے اشخاص قصہ سائے کی طرح ہمارے سامنے سے نہیں گذرتے بلکہ وہ انسانوں کی طرح بولتے چالتے اور چلتے پھرتے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ برائیوں کو چھپاتے ہیں نہ اچھائیوں کو چمکاتے ہیں۔ بلکہ ہو بہو تصویریں کھینچتے اور جزئیات تک بیان کرتے ہیں۔ لکھنؤ کی اعلیٰ وادنیٰ سوسائٹی کی انہوں نے صحیح ترین تصویریں کھینچی ہیں۔ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ کہ حرم سراؤں کے اندرونی حالات کا مطالعہ انہوں نے کس طرح کیا۔ شوخی اور ظرافت ان کا کہیں ساتھ نہیں چھوڑتی۔ لکھنؤ کے مٹتے ہوئے آخری تمدن کے صحیح مرقعے انہوں نے نہایت عمدگی سے دکھائے ہیں۔

سرشار کی شوخی اور ظرافت عام طور پر ان کا مذاق مہذب ہے۔ لیکن مضمون کے زور میں اور محاکات کے شوق میں وہ اس قدر بے قابو ہو جاتے ہیں کہ فواحش کی بھی پروا نہیں کرتے۔ مکالمات لکھنے میں ان کو خاص کمال حاصل ہے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ اشخص کی بولیاں الگ معلوم ہو جاتی ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس میں اصلیت ہوتی ہے۔

سوسائٹی کا نقشہ ہو بہو کھینچ دیتے ہیں۔ سرشار پُرانے رسم ورواج کے مخالف اور آزادانہ تحریک کے حامی تھے۔ ان کی اصلاح کا خاص طریقہ یہ ہے کہ وہ پُرانے لوگوں پر خود ہنستے ہیں۔ اوروں کو ہنساتے ہیں، اور آخرکار اپنے مقصد میں فتحیاب ہوتے ہیں۔

سرشار کی کیریکٹر نگاری

سرشار کیریکٹر نگاری کے اُستاد ہیں۔ وہ ہو بہو نقشے نہیں کھینچتے بلکہ اصلیت کے ساتھ مُبالغہ کو ملا لیتے ہیں۔ اپنے کیریکٹروں کی خصوصیات چُن لیتے ہیں۔ اور انہی میں لُطف و ظرافت پیدا کرتے ہیں سیکسینا صاحب لکھتے ہیں کہ ان کیریکٹروں کو اس نظر سے نہ دیکھو کہ وہ بالکل نیچر کے مطابق ہیں۔ بلکہ ان کو پڑھو اور ہنسو۔ سرشار کا خاص ہنسنے ہنسانے والا کیریکٹر خوجی ہے۔ حق یہ ہے کہ اُردو ادب اب تک اس کا مدمقابل پیدا نہیں کرسکا۔ وہ ظرافت کی دُنیا کی عجیب ترین مخلوق ہے۔

سرشار کی تصانیف انسانی زندگی کے اصلی واقعات کا بیان ہے، اور غیر فطری واقعات سے قطعی طور پر احتراز کیا گیا ہے۔ مولوی نذیر احمد کے قصے محض اخلاقی ہیں۔ اِس لئے ان میں دلچسپی اور حیرت انگیزی کم ہے۔ لیکن سرشار کے قصے محض دل کے بہلانے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اور یہی زمانہ حال کے ناولوں کی اصلی غرض ہے جس کو سرشار نے سب سے پہلے عملی جامہ پہنایا۔

نقائص سرشار

(۱) پلاٹ مربوط اور منظم نہیں۔ اور یہ ان کی بے پروائی اور بے قاعدگی کا نتیجہ ہے۔

(۲) واقعات میں عدم تسلسل ہے کیریکٹروں میں ہمواری اور یکرنگی نہیں۔ وقتی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہیں کیریکٹروں کے خصائص ان کے دماغ میں محفوظ نہیں رہتے۔ اس وجہ سے ان کو نباہ نہیں سکتے۔

(۳) کبھی تخیل بہت بلند ہوتا ہے اور کبھی بہت پست۔ یہ خرابی شراب نوشی۔ فطری بے پروائی اور بہت زیادہ لکھنے کا نتیجہ ہے۔

(۴) فلسفہ اور اخلاق آموزی کی کمی ہے: بحیثیت واعظ کے ان کی تحریریں بے مزہ ہیں۔ جب اس کوچہ میں قدم رکھتے ہیں۔ تو وہ سرشار معلوم نہیں ہوتے۔

(۵) جذبات نگاری کی کمی ہے۔ اور جہاں کہیں ہوتی ہے مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔

(۶) بعض جگہ فحش اور اخلاق سے گرے ہوئے بیانات بھی ہیں۔ اس کے دو جواب ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس وقت سوسائٹی کا رنگ یہی تھا۔ دُوسرے جب تک کسی کی خُوبیاں اور عیوب نہ دکھائے جائیں اس کی اصلیت ظاہر نہیں ہوسکتی۔

(۱) ان کے قصوں میں کیریکٹر بہت ہیں۔ جن کی وجہ سے واقعات کا تسلسل پڑھنے والے کے دماغ میں محفوظ نہیں رہ سکتا۔ پھر بھی ان کی تصانیف سے اُردو ادب میں بے انتہا ترقی ہوئی۔

سرشار بحیثیت صاحب طرز سرشار کا مرتبہ بحیثیت زبان اور صاحب طرز کے بہت بلند ہے۔ صاف سلیس۔ با محاورہ اور زوردار عبارت لکھتے ہیں وہ اپنے ہمعصروں پر فوقیت رکھتے ہیں، اور بحیثیت صاحب طرز کے مولانا آزاد سے دُوسرے نمبر پر ہیں۔ مگر اور سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک ایسی طرز اختیار کی جو افسانہ نویسی کے واسطے نہایت موزوں تھی۔ ان کی تصانیف میں لوگ نفس قصہ کی نسبت عبارت میں دلچسپی لیتے ہیں کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ محاورات اور اصطلاحات صرف کرتے ہیں۔ اور یہ وفور خیالات اور قدرت زبان کا نتیجہ ہے۔

سرشار اور سرور کا مقابلہ مرزا رجب علی بیگ سرور کے ہاں تکلف اور آورد بہت ہے سرشار کی عبارت بالکل بے تکلف اور نیچرل ہے۔ سرور چیزوں کا بیان کرتے ہیں سرشار آدمیوں کا۔ سرور خیالی تصویریں کھینچ کر ان کے محاسن کو اُبھارتے اور معائب کو چھپاتے ہیں۔ برخلاف اس کے سرشار بالکل سچی تصویریں پیش کرتے، اور ان کی اچھائیاں بُرائیاں سب ظاہر کر دیتے ہیں۔

سرور کے مرقعے اس وجہ سے بھی زیادہ دلچسپ اور حسین ہیں۔ کہ وہ جن چیزوں کا بیان کرتے ہیں ان میں کوئی عیب نہیں دیکھتے۔ سرشار جس سوسائٹی کا نقشہ کھینچتے ہیں وہ اس کو پسند نہیں کرتے۔ اِس لئے اپنی محبت اور ناراضی کو نہیں چھپاتے۔ سرور قدامت پسند ہیں، اور زمانہ قدیم سے تعلق رکھتے ہیں، اور فنون لطیفہ کو قدامت کے پنجے سے چھڑانا چاہتے ہیں۔

مولانا عبدالحلیم شرر سنہ ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کو واجد علی شاہ کے خاندان سے بڑی وابستگی تھی۔ ان کے والد حکیم تفضل حسین صاحب بادشاہ کے ساتھ مٹیا برج کلکتہ میں جا رہے تھے۔

شرر نو برس کی عمر میں لکھنؤ میں کچھ ابتدائی تعلیم پا کر کلکتہ گئے مٹیا برج میں اپنے والد اور مختلف اساتذہ سے معقولی۔ ادبی منطقی اور طبی کتابیں پڑھیں بچپن ہی سے اخبار بینی کا شوق تھا۔ اخبار اودھ کو نامہ نگار کی حیثیت سے خبریں لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ ۱۹ سال کی عمر میں کلکتہ سے لکھنؤ آئے۔ اور مولوی عبدالحی سے کتب درسیہ ختم کیں۔ ۲۰ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ اس وقت ان کو حدیث کا کچھ ایسا شوق ہوا کہ دہلی آ کر مولوی محمد نذیر حسین محدث دہلوی سے تکمیل کی۔ پھر انگریزی شروع کی اور نہایت محنت سے

اس میں بھی بقدرِ ضرورت دستگاہ پیدا کر لی۔

اسی زمانے میں منشی احمد علی کسمنڈوی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اودھ پنچ وغیرہ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان کے شوق دلانے سے شرر بھی بعض اخبارات کو مضمون بھیجنے لگے۔ اُن کے مضامین میں بجائے سیاسیات کے ادبی رنگ زیادہ ہوتا تھا۔ ۱۸۸۰ء میں منشی نولکشور نے ان کو اپنے اخبار میں لے لیا۔ نوعمری کا زمانہ تھا طبیعت زوروں پر تھی۔ نہایت زور شور سے مضامین لکھنے شروع کئے جن میں فلسفہ کے ساتھ معنی آفرینی اور ادبی مذاق خوب ہوتا تھا۔ ان مضامین سے ان کی بہت شہرت ہوئی۔ حیدر آباد اور مختلف ریاستوں نے بُلایا۔ لیکن انہوں نے ریاستی مُلازمت پسند نہ کی۔ انہی دنوں انہوں نے رُوح پر ایک عالمانہ مضمون لکھا جس کا کچھ حصّہ اخذ کرنے کے لئے سر سید نے منشی نولکشور کے ذریعے اُن سے اجازت مانگی۔

انہوں نے اپنے دوست مولوی عبد الباسط کے نام سے محشر نام ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا۔ اس کا رنگ عبارت اس قدر دلکش تھا۔ کہ ہر طرف دُھوم مچ گئی۔ اٹھارہ اُنیس نمبروں میں محض صبح کا سماں دکھایا۔ اس میں فارسی کی تشبیہیں اور استعارے تھے۔ لیکن بندشیں انگریزی تھیں۔ گویا انگریزی خیالات کو اُردو فارسی کا لباس پہنایا تھا۔ انہوں نے قافیہ بندی۔ رعایت لفظی اور جا بجا اشعار چسپاں کرنے سے بھی پرہیز کیا۔ شروع میں اس طرز عبارت کو نباہنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ لیکن تھوڑی مُدّت میں ان کی عبارت نے ایک خاص طرز اختیار کر لی۔ اور یہ طرز ایسی مقبول ہوئی۔ کہ ساری اخباری دُنیا پر چھا گئی۔ شرر کے وہ مضامین جو اودھ اور محشر میں نکلے دستیاب نہیں ہوتے۔ ورنہ ہندوستان ان کی بہت زیادہ قدر کرتا۔

منشی نولکشور نے نامہ نگاری کی حیثیت سے مولٰنا کو حیدر آباد بھیجا۔ کچھ مُدّت بعد وہاں سے واپس آنا چاہتے تھے۔ لیکن منشی صاحب اجازت نہ دیتے تھے۔ آخر ۱۸۸۲ء میں انہوں نے یہ سلسلہ ختم کر دیا اور وہاں سے چلے آئے۔

اس زمانے میں ان کا سب سے پہلا ناول دلچسپ نکلا۔ اس میں دقتوں اور حالتوں کا سماں باندھا تھا۔ چونکہ یہ رنگ بالکل نیا تھا۔ اس لئے اکثر جگہ اُلجھا ہوا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ہندوستانی خاندان زیادہ تر کن اسباب سے برباد ہوتے ہیں۔ سال بھر بعد اس کا دوسرا حصّہ

شائع ہوا۔ یہ پہلے حصّے کے عیوب سے پاک تھا۔ اور اس کے رنگ میں پختگی آگئی تھی۔
دو سال بعد بنکم چیٹرجی کے ناول "درگیش نندنی" کا انگریزی ترجمے سے ترجمہ کیا۔ اور اس میں بہت سی خوبیاں پیدا کیں۔

اب اُردو داں طبقہ مولانا کے مضامین کا بیحد مشتاق ہو گیا۔ مولوی بشیر ایڈیٹر البشیر اور منشی نثار حسین نثار مالک پیام یار کے اصرار سے ۱۸۸۷ء میں مولانا نے "دلگداز" جاری کیا۔ اس ماہوار رسالے میں ان کے اپنے مضامین نہایت عمدہ ہوتے تھے۔ کسی خیال کو بغیر قافیہ بندی تشبیہ اور استعارے کے دلچسپ بنانا ان ہی کا حصّہ تھا۔ حقیقتاً اُردو کا خزانہ اس وقت تک ایسے مضامین سے خالی تھا۔
۱۸۸۸ء سے دلگداز میں ان کے مسلسل ناول نکلنے لگے۔ ملک العزیز ورجنا حسن انجلینا منصور موہنا وغیرہ میں انہوں نے مورخانہ شان سے قدیم واقعات کو ناول کے رنگ میں دکھایا۔ یہ ناول اسقدر مقبول ہیں کہ بیسیوں ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

شرر کے ناولوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مُصنّف نے اسلامی تاریخ کا بہت گہری نظروں سے مُطالعہ کیا ہے۔ تاریخی ناولوں میں واقعات کی تحقیق کے ساتھ ساتھ سیدھے سادے الفاظ میں خیال آرائی غضب کی ہے۔ آخری ناولوں (ایام عرب اور فلورا فلورنڈا) میں عرب کی زمانہ جاہلیت کی سوسائٹی اور اسپین کے اسلامی دور کو ایسی خوش اسلوبی سے دکھایا ہے۔ کہ پڑھتے پڑھتے جی سیر نہیں ہوتا۔ فردوس بریں میں ایران کے باطنی فرقے کی جنّت اور ان کی فریب کاریوں کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔
۱۸۹۰ء میں مولانا نے "مہذّب" اخبار نکالا۔ اس میں علمائے اسلام کے سوانح عمری مسلسل لکھے جاتے تھے۔ یہ پرچہ مُسلمانوں میں بہت مقبول تھا۔ ۱۸۹۱ء میں وہ دلگداز اور مہذّب کو بند کر کے حیدر آباد گئے اور وہاں دو سو روپے پانے لگے۔ ۱۸۹۵ء میں نواب وقار الامرا بہادر نے اپنے چھوٹے لڑکے کو مذہبی تعلیم دینے کے لئے انگلستان بھیج دیا۔ شرر انگلستان میں تقریباً چودہ پندرہ مہینے رہے۔ اس مُدّت میں انہوں نے فرانسیسی زبان اس قدر سیکھ لی کہ ڈکشنری کی مدد سے ترجمہ کر لیتے تھے
۱۸۹۸ء میں انہوں نے حیدر آباد سے دلگداز پھر جاری کیا۔ اور اس میں سکینہ بنت حسینؑ کے حالات لکھنے شروع کئے۔ اس سے مُسلمانوں میں جوش پیدا ہو گیا۔ نظام گورنمنٹ نے ان کو ہدایت کی کہ اس سلسلہ کو بند کر دیں۔ اس مضمون کے ساتھ انہوں نے رسالہ بھی بند کر دیا۔ ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ آکر

انہوں نے پھر دلگداز جاری کیا۔ اور سکینہ بنت حسینؓ کا بقیہ حصہ پورا کیا۔ حقیقت امر یہ ہے کہ شرر نے اس کتاب کے لکھنے سے بڑی دریدہ دہنی سے کام لیا ہے۔ ایک مسلمان کے قلم سے نبی زادی کی شان میں اس قسم کی گستاخیاں غضب ہیں۔

شرر حیدرآباد سے اجازت لے کر لکھنؤ آرہے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں ان کو واپس بلا لیا گیا۔ اور وہ دلگداز بند کرکے حیدرآباد چلے گئے۔ اب ان کے ہمدرد وقار الامرا ریاست سے علیحدہ ہو کر انتقال کر چکے تھے۔ اور ہوم سیکرٹری عزیز مرزا صاحب کیس اور تعینات ہو گئے تھے۔ مسٹر ڈاکر منتظم فنانس مولانا کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ اور نئے مدار المہام مہاراجہ کشن پرشاد ان سے ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ آخر ۱۹۰۴ء میں وہ لکھنؤ چلے آئے اور ادب اردو کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ دلگداز پھر جاری کیا اور وہ ان کی تمام زندگی نکلتا رہا۔

شرر کی طرز تحریر اردو کے مجددوں میں سرسید نہایت سادہ اور زوردار عبارت لکھنے والوں میں تھے وہ مشکل سے مشکل مضمون ایسی نفاست سے ادا کرتے تھے۔ کہ عالم و عامی آسانی سے سمجھ جاتے تھے مولانا آزاد کی زبان میں بے تکلفی۔ روانی اور اس کے ساتھ شاعرانہ تشبیہیں اور استعارے نہایت اعتدال کے ساتھ ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے ہاں روانی اور بے تکلفی خوب ہے۔ لیکن متانت پیدا کرنے کے لئے وہ جابجا انگریزی عربی فارسی ثقیل الفاظ لے آتے ہیں۔ سرشار کی تحریروں میں کوئی جدت نہیں۔ ہاں ظرافت بہت ہے۔ وہ لکھنؤ کی اعلیٰ اور ادنےٰ طبقے کی زبان بڑی چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں۔

شرر نے ان سب سے علیحدہ ہو کر ایک جداگانہ طرز اختیار کی۔ انگریزی انشاپردازی کی خوبصورت بندشوں کو اردو میں داخل کیا۔ لیکن تشبیہات اور استعارات وہی ایشیائی رکھے خیالی مضامین میں انگریزی انشاپردازوں کی سی جدت آفرینیاں کیں۔ اور انشاپردازی کے لئے ایک نیا راستہ تیار کر لیا۔ انہوں نے ایسے ایسے مضامین لکھے ہیں کہ اب ان پر کوئی شخص قلم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ "غریب کا چراغ"۔ "لالہ خورد"۔ "دیہات کی لڑکی" سے ان کے زور طبع کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے ان کی طرز تحریر باوجود سادگی متین محققانہ بلکہ فلسفیانہ ہے۔ شاعرانہ خیال آفرینی کے لحاظ سے تخیلات کا دریا ہے۔ انسانی جذبات پر وہ اس قدر قادر ہیں۔ کہ

— ہر چیز کی تصویر کو آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔
تاریخی ناول لکھ کر مولٰنا نے عام پبلک کو تاریخ سکھا دی۔ تاریخی مضامین وہ گہری تحقیق اور کاوش کے بعد لکھتے تھے۔ ان کی اسلامی عہد کی "تاریخ سندھ" اور "تاریخ ارض مقدس" بڑی تحقیق کی کتابیں ہیں۔

رسم و رواج کے مخالف، تقلید سے گریزاں اور عقائد میں اہلحدیث کی طرف مائل تھے۔ آزادیٔ خیال اور تحقیق کی بنا پر بعض مسائل میں اہلحدیث سے بھی علیحدہ تھے۔ علما ان کے اکثر خلاف تھے۔ بعض نام نہاد تاریخی حوالوں سے انہوں نے ثابت کیا تھا۔ کہ امام حسینؑ کے صاحبزادے امام زین العابدین نے حضرت شہر بانو کا عقد اپنے غلام زبید سے کر دیا تھا۔ اور دوسرا واقعہ وہی سکینہ بنت حسینؑ کے سوانح عمری کا تھا۔ پھر انہوں نے پردے کی مخالفت میں ۱۹۰۰ء میں "پردۂ عصمت" نام رسالہ نکالا۔ اس کے اجرا سے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ ۱۹۰۷ء میں انہوں نے "اتحاد" پندرہ روزہ جاری کیا۔ اس کا مقصد ہندو مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنا تھا۔

(۱) اس مدت میں دلگداز کئی دفعہ بند ہو کر جاری ہوا۔ | ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۶ء تک |

(۲) ۱۹۱۲ء میں مولٰنا محمد علی مرحوم نے اپنے اخبار "ہمدرد" کی ادارت کیلئے ان کو دو سو روپے ماہوار پر دہلی بلایا۔ لیکن وہ چند مہینے دہلی میں رہ کر اخبار نکلنے سے پہلے لکھنؤ واپس چلے گئے۔

(۳) ۱۹۱۸ء میں حضور نظام نے اپنے سوانح عمری لکھنے کے لئے حیدرآباد بلایا۔ لیکن بعد میں سوانح عمری کی بجائے تاریخ اسلام لکھنے کو کہا۔ اس کام کے لئے ان کو لکھنؤ میں ایک معقول رقم ماہ بماہ بھیج دی جاتی تھی۔ یہ تاریخ تین حصوں میں لکھی گئی ہے۔ اس کی پہلی جلد شائع ہوتے ہی عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہو گئی۔

مولانا شرر نے تقریباً آٹھ نو رسالے اور اخبار نکالے۔ اور ایک سو دو کتابیں لکھیں۔ ان کے مضامین جو دلگداز میں چھپا کرتے تھے۔ آٹھ جلدوں میں مضامین شرر کے نام سے لاہور میں شائع ہوئے ہیں۔

| رسوا | مرزا محمد ہادی صاحب بی۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، شعر گوئی میں مرزا اوج مرحوم کے شاگرد ہیں۔

جوانی میں ان کو مرزا غالب کا رنگ مرغوب تھا۔ مگر اب وہ نازک خیالیاں اور عبارت آرائیاں پسند نہیں ہیں۔ کلام صاف سادہ اور لطیف تخیل سے معمور ہے۔ اس لئے ان کو مومن کا پیرو کہا جا سکتا ہے۔ آجکل مرزا صاحب دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازم ہیں۔

مرزا صاحب کا ناول "امراؤ جان ادا" نہایت اعلیٰ درجے کا ناول ہے۔ اس میں سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ پلاٹ اور کیریکٹر نہایت منظم اور نمایاں ہیں۔ کسی بیان میں مبالغہ نہیں۔ ہر چیز کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔ اس کو لکھے ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں۔ لیکن اب بھی وہ ممتاز ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ مثنوی نوبہار۔ صبح امید۔ مرقع لیلیٰ مجنوں (ڈرامہ) ذات شریف (ناول) انکی قابل قدر تصانیف ہیں۔

حکیم محمد علی طبیب تخلص، ایک مشہور ناول نگار تھے۔ لیکن ان کو اعلیٰ درجے کا ناول نگار نہیں کہا جا سکتا اپنے زمانہ کے مذاق سے بیخبر ہونے کے علاوہ اس سوسائٹی کے جزئیات سے بھی واقف نہ تھے جس کو وہ اپنے ناولوں میں بیان کرتے ہیں۔ فطرت انسانی اور جذبات لطیف سے بھی پوری طرح آگاہ نہ تھے۔ ان کی عبارت میں یکرنگی ضرور ہے۔ مگر پندو نصائح سے غیر دلچسپ اور بے اثر بن جاتی ہے۔

عبرت حسن سرور۔ دیول دیوی۔ گورا۔ رام پیاری۔ جعفر و عباسہ۔ اختر حسینہ۔ نیل کا سانپ وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔ ان میں سے بعض ناول انگریزی ناولوں کا ترجمہ ہیں۔

راشد الخیری ناول نویسی میں ان کو مولوی نذیر احمد مرحوم کا جانشین کہنا چاہئے۔ ان کے مضامین عموماً عورتوں کی تعلیم و ترقی اور ان کی دکھوں بھری زندگی کے متعلق ہوتے ہیں۔ چونکہ عبارت نہایت دردانگیز لکھتے ہیں، اِس لئے مصورِ غم کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کی تصانیف بکثرت ہیں جن میں صبح زندگی۔ شام زندگی، نوحہ زندگی۔ عروسِ کربلا۔ زہرہ۔ سراب مغرب وغیرہ مشہور ہیں۔

عموماً عبارت تصنّع سے پُر ہوتی ہے۔ جب پڑھنے والا ان کی طرز تحریر سے ایک دفعہ واقف ہو جاتا ہے۔ تو ان کی دوسری تصانیف پڑھنے میں کوئی خاص لُطف نہیں آتا۔ ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ محدود معلوم ہوتا ہے اِس لئے ہر کتاب میں ہر پھر کر انہی الفاظ اور محاورات وغیرہ کا اعادہ ہوتا ہے۔

نیاز فتحپوری نیاز محمد خاں فتحپور میں (۱۸۸۴ء میں) پیدا ہوئے۔ گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرکے مدرسہ اسلامیہ فتحپور۔ مدرسہ عالیہ رام پور اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی۔ حدیث مولنا عین القضاۃ لکھنوی سے پڑھی۔ ایف۔ اے تک پرائیویٹ تعلیم حاصل کی۔ اور ترکی زبان کسی تُرک سے سیکھی۔

نیاز مختلف روزانہ اخباروں میں کام کرتے رہے ہیں۔ اب تقریباً دس پندرہ سال سے اپنا رسالہ "نگار" نکالتے ہیں۔ نگار پہلے بھوپال سے جاری کیا تھا۔ آجکل اس کا دار الاشاعت لکھنؤ میں منتقل کر لیا ہے۔

نیاز کی طرز تحریر سب سے علیحدہ ہے۔ وہ نظم نما نثر کو پسند کرتے ہیں۔ جب یہ رنگ اعتدال سے بڑھ جاتا ہے۔ تو پڑھنے والا بے لطف ہوتا ہے۔ انہوں نے ٹیگور کی گیتا نجلی کا نہایت شاندار ترجمہ کیا ہے۔ "کیوپڈ اور سائیکی" اور "مریخی سیاح کی ڈائری" ان کی طبع زاد کتابیں ہیں۔ گہوارۂ تمدن اور شاعر کا انجام بھی نہایت دلچسپ اور عمدہ تصانیف ہیں۔ گہوارۂ تمدن میں عورتوں کے ترقی تمدن میں حصہ لینے کی بحث ہے۔ ان کا مجلہ نگار نہایت عمدہ ادبی رسالہ ہے۔ لیکن ذاتیات کی بحث اور مذہبیات کا مضحکہ اڑانے سے اب اس کی پہلی سی قدر نہیں رہی۔

خواجہ حسن نظامی خواجہ حسن نظامی دلی میں ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے - حضرت نظام الدین اولیاؒ کے خواہر زادے ہیں۔ ابتدا ہی سے اخبارات میں مضامین لکھنے کا شوق تھا۔ کچھ عرصے تک گورنمنٹ کو ان پر شکوک رہے۔ اور مدتوں ان کی نگرانی ہوتی رہی۔

خواجہ صاحب ہندوستان کے بہت بڑے صوفیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان کا حلقہ اثر بہت زیادہ وسیع ہے - تصانیف بے شمار ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ نہایت معمولی معمولی مضامین کو نہایت دلکش اور مؤثر طریقے سے نبھاتے ہیں۔ اور نئے نئے الفاظ وضع کرتے ہیں عبارت نہایت سادہ اور دلکش ہوتی ہے۔ فقرے بالکل چھوٹے چھوٹے اور عام فہم ہوتے ہیں لیکن خیالات میں گہرائی نہیں ہوتی۔ ان کے اس قسم کے مضامین پڑھ کر لطف خوب آتا ہے مغربی نقطہ نظر سے ان کا لٹریچر صحیح معنوں میں لٹریچر ہے۔ آپکی تصانیف میں کرشن بیتی۔ یزید نامہ۔ محرم نامہ اور غدر دہلی کے افسانے بہت مشہور ہیں۔

منشی پریم چند اصلی نام دھنپت رائے ہے۔ لیکن ادبی دنیا میں منشی پریم چند کے لقب سے مشہور ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۸ / اکتوبر ۱۹۳۶ء کو فوت ہوئے۔ ان کے والد منشی عجائب لال بنارس کے قریب موضع پانڈے پور میں رہتے تھے۔ سات برس کے تھے۔ کہ والدہ کا انتقال ہوا۔ اور پندرھویں برس میں باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ سات آٹھ سال فارسی پڑھ کر بنارس سے انٹرنس پاس کیا" اور محکمہ تعلیم میں ملازمت کر لی۔

منشی صاحب نے ۱۹۰۱ء سے "زمانہ" میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ ۱۹۰۴ء میں ایک ہندی ناول پریما لکھا۔ ۱۹۱۲ء میں جلوۂ ایثار اور ۱۹۱۸ء میں بازار حسن کے دونوں حصے تصنیف کئے۔ اردو کی طرح ہندی میں بھی ان کو کمال حاصل ہے۔ سیوا سدن۔ پریم آشرم۔ رنگ بھوم اور کایا کلپ ان کے

ہندی کے مشہور ناول ہیں۔ جن کے اُردو میں بھی ترجمے ہو چکے ہیں۔

منشی صاحب کو چھوٹے چھوٹے افسانے لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ وہ ہندوستانی دیہاتوں کے ہو بہو نقشے اور کسانوں کے سچے واقعات نہایت عمدگی سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مبالغہ بالکل نہیں ہوتا۔ عبارت میں زور۔ استعاروں اور تشبیہوں میں لطافت ہوتی ہے۔ جذبات اور نفسیات کے زبردست ماہر معلوم ہوتے ہیں حقیقی ظرافت اور درد ان کے کیریکٹروں کو جیتی جاگتی تصویریں بنا دیتے ہیں۔

زندگی کے آخری سالوں میں منشی صاحب ہندی کی طرف زیادہ متوجہ رہے۔ اس لئے اُردو والوں تک ان کے خیالات ترجمہ ہو کر پہنچتے تھے۔ ان کی تصانیف میں پریم پچیسی (دو حصے) اور پریم بتیسی (دو حصے) جن میں چھوٹے چھوٹے افسانے ہیں۔ بہت مقبول ہیں۔

سُدرشن موجودہ زمانہ میں سُدرشن بھی بہت اچھا لکھنے والوں میں سے ہیں۔ پہلے لاہور میں رہتے تھے، وہ متعدد ہندی اُردو رسالوں کے ایڈیٹر رہے۔ منشی پریم چند کی بہت سی خصوصیات ان میں موجود ہیں، لیکن ان سے کم درجے پر ہیں۔

سُدرشن بے شمار کتابوں کے مُصنّف اور مُترجم ہیں۔ جو پنجاب میں عام طور پر مقبول ہیں، "محبت کا انتقام" پہلے ہندی میں لکھا تھا۔ پھر اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس پر پنجاب گورنمنٹ نے پانسو روپیہ انعام دیا۔ کچھ دنوں "چندن" نام اُردو رسالہ بھی نکالتے رہے۔ لوگ اس کو بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ چند سال سے سُدرشن کلکتے میں جا رہے ہیں اور ڈرامہ نویسی کا کام کر رہے ہیں۔

دیگر ناول نگار ناول نگاروں کی بیحد کثرت ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل لوگ مشہور ہیں:۔

(۱) حامد اللہ افسر میرٹھی۔ عمدہ شاعر اور نقاد ہیں۔ افسانے بھی بڑی مہارت سے لکھتے ہیں (۲) مجنوں گورکھپوری (۳) احمد حسین خاں ایڈیٹر شباب اُردو (۴) ایم۔ اسلم (۵) حکیم احمد شجاع (۶) مولوی ظفر عمر صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس ممالک اودھ جاسوسی قصے لکھنے میں خاص طور پر مشاق ہیں۔ نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری ان کے مقبول ناول ہیں (۷) پنجاب کے رسائل میں اکثر تعلیم یافتہ خواتین کے لکھے ہوئے دلچسپ افسانے اور قصے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

(۱۹)

اُردو ڈراما

ڈراما غیر مُلکی صنف ہے۔ یہ اُنیسویں صدی میں اُردو میں داخل ہوا۔ ہماری زبان میں ڈراما نگاری کافی ترقّی کر چکی ہے۔ لیکن پھر بھی ترقّی کی بہت کچھ گنجائش باقی ہے۔

ڈرامے کی عمومیت

نقالی کا شوق انسان میں فطری ہے۔ خواہ کوئی قوم مہذّب ہو یا غیر مہذّب نقالی کا جذبہ اس میں ضرور ہوتا ہے۔ اِسلام نے اس فطری جوش کو بدعت کے خوفناک لفظ سے دبا دیا یہی وجہ ہے۔ کہ فارسی اور عربی سے اس قسم کے نمونے اُردو میں نہیں آئے۔ لیکن اہل فارس اس جذبے کو زیادہ مُدّت تک نہیں دبا سکے۔ شروع میں انہوں نے مذہبی رنگ میں ڈراما کو اختیار کیا۔ یعنی واقعات کربلا کی نقالی جس کو پیشن پلے کہتے ہیں ان کے ہاں رائج ہوئی۔ انگلستان اور یورپ والوں نے ڈرامے کو تبلیغ کا ذریعہ قرار دیا۔ اور مریکل پلے اور مسٹری پلے کے ذریعے اپنے پیغمبروں کے مُعجزے اور قدیم مسیحی رسُوم کی تبلیغ کرنی شروع کی۔ اسی طرح سنسکرت اور ہندی میں بھی مذہبی ڈرامے موجود ہیں۔ جو اب تک کیف آور موسیقی اور عُمدہ اخلاقی نتائج کی وجہ سے عوام کی تفریح کا باعث ہوتے ہیں۔

سنسکرت اور ہندی ڈرامے نے اُردو پر کیوں اثر نہ کیا؟

یہ نہایت تعجّب خیز بات ہے۔ کہ اُردو پر سنسکرت ڈراموں کا اثر کیوں نہیں پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ سنسکرت ڈرامے کا عملی دَور گذر چکا تھا گویا وہ محض کتابوں میں محفوظ تھا۔ شروع میں بدھ مت اور جین مت والے ڈراموں کو ناپسند کرتے تھے۔ لیکن ڈرامے کو تبلیغ کا کامیاب طریقہ دیکھ کر انہوں نے اس کو اختیار کر لیا۔ بُدھ مت کا ڈراما راجہ ہرش اور اشوک کے زمانے میں بہت ترقّی کر گیا۔ جب بودھ مت کو زوال اور برہمنوں کو عروج ہوا تو مُلک میں غیر اقوام کے حملوں سے مُفلسی اور بے اطمینانی پھیل چکی تھی۔ اِس لئے ڈرامے کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹ گئی۔ جب ادنیٰ لوگوں نے ڈرامے کی کمپنیاں کھولیں تو ڈرامے کی رہی سہی عزّت بھی جاتی رہی بلکہ ایکٹروں کو بھی ذِلّت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ بلکہ نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں

پڑنے سے فحش کی حد تک پہنچ گیا۔

اسی زمانے میں جب سنسکرت ڈراما محض کتابوں میں محفوظ تھا۔ اور ہندی ڈراما بہت ذلیل حیثیت اختیار کر چکا تھا، اُردو ترقی کے مدارج طے کر رہی تھی۔ چنانچہ سنسکرت ادیبوں کی غفلت اور فارسی داں مسلمانوں کے سنسکرت نہ جاننے سے سنسکرت نظم اور ڈرامے کا اُردو پر کوئی اثر نہ پڑ سکا۔

اُردو ڈرامے کے عناصر خمسہ | علامہ عبداللہ یوسف علی (آئی سی۔ ایس) نے اُردو ڈرامے کے مندرجہ ذیل عناصر قرار دیئے ہیں:۔

(۱) قدیم سنسکرت ڈراما (۲) ہنود کے خالص مذہبی ناٹک یا مریکل پلے اور دیوتاؤں کے حالات (۳) سوانگ اور نقلیں وغیرہ جو ادنیٰ قسم کے لوگوں میں رائج ہیں (۴) اسلامی نظمیں اور قدیمی روایات (۵) زمانۂ حال کا انگریزی ڈراما اور یورپین سٹیج کی ترقیاں۔

(۱) سنسکرت ڈراما | اگرچہ سنسکرت ڈرامے کا اُردو پر بہت کم اثر پڑا۔ لیکن اب محض مشہور ناٹکوں کا ترجمہ اُردو میں ہو گیا ہے۔ اور ان کو سٹیج پر بھی دکھایا جاتا ہے۔ تھوڑی مدّت سے سنسکرت ڈرامے کے پُرانے قواعد بھی استعمال میں آنے لگے ہیں۔ مثلاً ڈراما شروع ہونے سے پہلے ایک شخص معہ اپنی بیوی کے سٹیج پر آتا ہے۔ اور ڈراما کا مختصر پلاٹ بیان کرتا ہے۔ مسخرے کا پارٹ بھی ضرور ہوتا ہے لیکن اچھے ڈراموں میں اصل کھیل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ہندو مریکل پلے | اِس قسم کے ناٹکوں نے موجودہ اُردو ڈرامے کے لئے بہت کچھ مواد فراہم کیا ہے۔ بلکہ اُردو ڈراما کی ابتدا انہی ہندی ناٹکوں سے ہوئی ہے۔ قدیم زمانے سے ہنود رام اور کرشن کے مشہور واقعات کو ناٹک کی صورت میں دکھایا کرتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عوام اپنی مذہبی روایات کو بھول نہ جائیں۔ یہ ناٹک عوام کے دلوں پر بہت گہرا اثر کرتے تھے۔ اس طرح سے کرشن اور رادھا کے عاشقانہ واقعات اُردو ڈرامے کا جزو بن گئے۔ بنگالی اور ہندی شاعری بھی اسی رنگ سے رنگین ہے عوام کی دلچسپی کے لئے بہت سی دیسی کمپنیاں دیہات میں اسی قسم کے مذہبی کھیل دکھاتی پھرتی تھیں۔ غالباً انہی جماعتوں سے واجد علی شاہ بادشاہ نے ناٹک کا پہلا سبق سیکھا تھا۔ اپنے محل میں وہ خود کنہیا اور ان کی محلیں گوپیاں بنا کرتی تھیں۔ غرض یہ ناچ اور گانا جو اُردو ڈرامے کا جزو لازم ہے انہی منڈلیوں کی نقل ہے، اور ممکن ہے کہ فرنچ اپیرا کا بھی اس پر اثر ہو۔ کیونکہ واجد علی شاہ کے

زمانے میں ان کے انگریز دوستوں کی بدولت فرنچ اپیر الپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

سوانگ اور نقلیں وغیرہ سوانگ بہت قدیم زمانے سے ہندوستان میں مقبول ہیں۔ یہ ہندوؤں کے تہواروں اور شادیوں کے موقع پر جلوس اور باجوں کے ساتھ نکلتے ہیں۔ ان کو ابتدائی قسم کی بھانڈ نقالی سمجھنا چاہیئے مگر عنصر ظرافت (کومک) ان میں ضرور پایا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں اکثر نقال مسخرے امیروں کا دل خوش کرنے کیلئے ان کی ملازمت میں رہتے تھے۔ نقالی اس زمانہ میں ایک مشکل فن تھا جس کی تکمیل کیلئے ناچنا اور گانا بھی ضروری تھا۔ ملکہ ایلزبیتھ کے زمانہ میں انگلستان میں بھی یہی رسم تھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ملکہ ایلزبیتھ کے زمانے کے مسخرے ہی ترقی یافتہ ڈرامے کے اصلی پیشرو ہیں۔

ہندوستان میں نقالوں کی جماعتیں "طائفہ" کے نام سے مشہور تھیں۔ یہ شادی بیاہ کے موقعوں پر اپنے گانوں اور نقلوں وغیرہ سے سامعین کو محظوظ کرتی تھیں۔ انہی نقلوں سے آجکل کے کامک ڈرامے ماخوذ ہیں۔

اسلامی نظمیں اور روایات یہ اردو ڈرامے کا عنصر غالب ہیں۔ نظم اردو عاشقانہ رنگ اور ڈرامانگاری کے لئے خاص موزونیت رکھتی ہے۔ اور نثر بھی رزم بزم جذبات نگاری غرض ہر موقع پر نہایت پرزور طریقے سے کام دے سکتی ہے۔

انگریزی سٹیج اردو سٹیج آجکل کے انگریزی ڈراموں کے ترجموں سے بھری ہوئی ہے۔ گویا انگریزی سٹیج کا اردو ڈرامے پر بہت زیادہ اثر ہے۔ تھیئٹر کی ساخت۔ پردے۔ لباس۔ نشستوں کا انتظام۔ تماشے کی تقسیم وغیرہ انگریزی ڈرامے ہی کے اصولوں پر عمل میں آتے ہیں۔

اردو ڈرامے کی دو قسمیں (۱) طبع زاد ڈرامے بہت کم ہیں۔ اور جس قدر ہیں وہ سیاسی معاشی اور سماجی مبحث پر ہیں۔
(۲) ترجمے بکثرت ہیں، اور ان میں اندھا دھند مغربی تقلید ہے۔

تراجم کے ماخذ (۱) سنسکرت ڈرامے (۲) یورپین ڈرامے (۳) فارسی قصے (۴) دیسی زبانوں کے افسانے جو خاص کر بنگلہ۔ مرہٹی اور زیادہ تر ہندی سے ماخوذ ہیں۔

قصوں کے مضامین حسب ذیل ہیں:۔

(۱) پوران اور ہندو دیومالا (۲) فارسی عربی قصے (۳) ہندوستان کی مشہور روائتیں اور قصے، (۴) انگریزی قصے (۵) مسائل حاضرہ مثلاً سیاسی یا معاشی اصلاح وغیرہ وغیرہ۔

اُردو ڈرامے پر شاہی درباروں کا اثر

سب سے پہلا اُردو ڈراما "اندر سبھا" ہے جس کو امانت شاگرد ناسخ نے تصنیف کیا تھا سیکسینا صاحب نے لکھا ہے۔ کہ یہ کتاب واجد علی شاہ بادشاہ کے حکم سے لکھی گئی تھی لیکن امانت کی ایک تحریر برآمد ہوئی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے۔ کہ یہ ڈراما کسی شاگرد کی فرمائش پر تصنیف ہوا۔

ایک ہندی شاعر "نواز" نے فرّخ سیر کے زمانے میں شکنتلا ناٹک کا برج بھاشا میں ترجمہ کیا۔ مگر اس کو ڈراما سمجھنا غلطی ہے۔ کیونکہ وہ دوہوں کی صُورت میں ہے، اور صحیح ترجمہ بھی نہیں۔ کیریکٹر اور ایکشن جو ڈرامے کی جان ہیں، اس میں کہیں نام کو نہیں پائے جاتے۔

شاہی زمانے میں نقالوں اور بہروپیوں کا بہت زور تھا مشہور ہے۔ جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا۔ تو رنگیلے پیا اس وقت راگ رنگ میں مصروف تھے کسی شخص کی ہمّت نہ پڑتی تھی۔ کہ ان کے عیش میں خلل انداز ہو۔ آخر ایک نقال نے ایک نقل کے ذریعے انہیں اس خطرے سے آگاہ کیا۔ اس زمانے کے نقال اپنے ہنر میں بڑے مشّاق تھے۔ وہ ہر بات کو نہایت خوبصورت طریقے سے ایکٹنگ کے ذریعے پیش کرتے تھے۔ یہی حالت واجد علی شاہ بادشاہ کے دربار کی تھی۔ ان بادشاہوں کے دربار عیش و عشرت میں کوہ قاف کا سماں پیش کرتے تھے۔ اُردو ڈرامے نے ایسے ہی درباروں میں جنم لیا عیش پرست اُمرا مسرّت اندوزیوں کے نئے نئے طریقے سوچتے تھے چنانچہ ایک فرانسیسی نے "اپیرا" کی تجویز پیش کی جو منظور کر لی گئی۔ اس کام کے لئے ہندوستان کے حسین ترین انسان پہلے ہی سے موجود تھے

یہ مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا کہ یورپ والوں نے اُردو ڈرامہ کی ترقّی میں کوئی حصّہ لیا یا نہیں ہندوستان کے مشہور ڈراما نویس محمّد عمر و نور الٰہی نے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ کہ یورپین لوگوں نے ڈراما کو ترقّی دی۔ قرائن سے اِس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ کہ ڈرامے کو زمانہ حال کے مُطابق بنانے میں یورپ والوں نے کچھ نہ کچھ ضرور مدد دی ہو گی۔ لیکن مولانا شرر اور پروفیسر مسعود حسن کی قطعی رائے ہے۔ کہ فرانسیسیوں نے اس میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔

اندر سبھا امانت

امانت نے ۱۸۵۲ء میں اندر سبھا لکھی۔ یہ ایک کامیڈی ہے جس میں گانا اور ناچ بھی ہے۔ اس لئے اسے موسیقی دار کامیڈی کہنا چاہئیے۔ یہ بھی اوپیرا کی ایک قسم ہے۔

سیکسینا صاحب نے لکھا ہے۔ کہ قیصر باغ میں اندر سبھا کے لئے ایک سٹیج تیار ہوئی

بادشاہ خود راجہ اندر بنے اور حسین لڑکیوں نے پریوں کا پارٹ ادا کیا۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔ کہ واجد علی شاہ کو رہسوں کا بڑا شوق تھا۔ لیکن وہ مختلف پارٹ مختلف لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اور کنہیا کا پارٹ بجائے مرد کے ہمیشہ عورتوں کو دیتے تھے۔ وہ خود کبھی کنہیا نہیں بنے۔ اس لئے یہ بھی بعید از قیاس ہے کہ وہ کبھی راجہ اندر بنے ہوں۔

اندر سبھا کا پلاٹ بہت معمولی ہے لیکن وہ شائع ہوتے ہی بیحد مقبول ہوا۔ اس کی دُھنیں اور گتیں بڑے بڑے اُستادوں نے قائم کی تھیں۔ لباس اور پردے بھی نہایت پُر تکلف تھے۔ اس کی مقبولیت دیکھ کر مداری لعل نے بھی ایک اندر سبھا لکھی۔ یہ ادبی حیثیت سے امانت کی اندر سبھا سے بہتر نہیں ہے۔ ہمیشہ سے اندر سبھا کو اور تماشوں سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اِس لئے اس کا ترجمہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہوا۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں اس کے چالیس مختلف نسخے موجود ہیں۔ ۱۸۹۲ء میں جرمنی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا تھا۔

اُردو ڈراما اور پارسی ہندوانی تماشوں کو دیکھ کر چند نوجوان پارسیوں کے دل میں خیال آیا کہ رُستم اور سہراب وغیرہ کے قدیم ایرانی قصے بھی سٹیج پر دکھائے جائیں۔ چنانچہ چند امیر کاروباری پارسیوں نے دہلی۔ کلکتہ اور بمبئی میں انگریزی تھیٹروں کی نقل پر کچھ کمپنیاں قائم کیں۔ سب سے پہلی کمپنی سیٹھ پسٹن جی فرام جی کی تھی سیٹھ صاحب اُردو میں خوب شعر کہتے اور رنگ اور پیرویں تخلص کرتے تھے۔ یورپ کی کمپنیاں دیکھے ہوئے لوگ ان پارسی کمپنیوں کے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے۔

اوریجنل تھیٹریکل کمپنی اس کمپنی کے بانی فرام جی تھے۔ وہ خود بھی بہت عمدہ ایکٹ کرتے تھے خورشید جی بالی والا۔ کاؤس جی کھٹاؤ۔ سہراب جی اور جہانگیر جی ان کے مشہور ایکٹر تھے۔ اس وقت ڈرامے ایسی اُردو میں لکھے جاتے تھے۔ جو ہر طبقے کے لوگ آسانی سے سمجھ سکیں۔ نیز اندر سبھا کی تقلید میں منظوم ہوتے تھے۔ تاکہ کانوں کو خوش آیند معلوم ہوں۔

رونق بنارسی اور میاں حسینی ظریف اس کمپنی کے ڈراما نگار تھے۔ رونق بمبئی میں رہتے تھے۔ انگریزی سے بھی ترجمہ کرتے تھے۔ "انصاف محمود شاہ" انہوں نے ۱۸۸۲ء میں گجراتی زبان میں لکھا۔ ظریف کے بہت سے ڈرامے ہیں۔ جن میں سے نتیجۂ عصمت۔ خدادوست۔ چاند بی بی بلبل بیمار بہت مشہور ہیں۔ جب فرام جی کا انتقال ہو گیا۔ تو بالی والا اور کاؤس جی نے اپنی اپنی کمپنیاں علیحدہ قائم کر لیں۔

وکٹوریہ ناٹک کمپنی وکٹوریہ کمپنی خورشید جی بالی والا نے جاری کی تھی۔ سن اجرا معلوم نہیں لیکن ۱۸۷۷ء کے دہلی دربار میں موجود تھی۔ خورشید جی خود مشہور اور صاحب کمال ایکٹر تھے۔ کامک پارٹ بہت خوب ادا کرتے تھے۔ ان کو سٹیج پر دیکھ کر لوگ ہنستے ہنستے لوٹ ہو جاتے تھے۔ رستم جی، مس خورشید، مس مہتاب، مس میری فنٹن اس کمپنی کے مشہور ایکٹر تھے۔ مس میری یورپین تھیں۔ لیکن ہندوستانی چیزیں خوب گاتی تھیں۔ اس کمپنی نے انگلستان جا کر بہت کافی مالی نقصان اٹھایا۔

طالب بنارسی منشی ونایک پرشاد طالب بنارسی وکٹوریہ کمپنی کے ڈراما نویس، شعر گوئی میں راسخ دہلوی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ڈراما کی زبان اور مضامین کو بہت ترقی دی۔ لیل و نہار، وکرم ولاس۔ دلیر دل شیر۔ نازاں۔ نگاہ غفلت۔ ہریش چندر۔ گوپی چند وغیرہ ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔

الفرڈ تھیٹریکل کمپنی وکٹوریا کمپنی کے مقابلے میں کاؤس جی کھٹاؤ نے الفرڈ کمپنی جاری کی۔ برخلاف خورشید جی کے کاؤس جی المیہ پارٹ کرنے میں کامل الفن تھے۔ ان کو لوگ ہندوستان کا ارونگ کہتے تھے۔ انہیں مرض ذیابیطس لاحق ہوا اور ۱۹۱۴ء میں لاہور میں انتقال کیا۔ منچیر شاہ۔ گلزار خاں، مادھو رام۔ ماسٹر موہن۔ ماسٹر منچیر جی۔ مس زہرہ اور مس گوہر وغیرہ اس کمپنی کے مشہور اداکار تھے۔ کاؤس جی کے بعد ان کے بیٹے جہانگیر جی نے چار پانچ سال کمپنی چلا کر کلکتہ کے تاجر مسٹر میڈن کے ہاتھ بیچ دی۔ مسٹر میڈن کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوا۔

احسن لکھنوی الفرڈ کمپنی کے سب سے پہلے ڈراما نگار احسن لکھنوی تھے۔ سید مہدی حسن نام تھا۔ نواب مرزا شوق مصنف "زہر عشق" کے نواسے تھے۔ احسن کامل ڈراما نگار۔ خوش گو شاعر اور نہایت عمدہ موسیقی دان تھے۔ ان کے ڈراموں کی زبان نہایت با محاورہ اور صاف ہے۔ فیروز گلنار، چندراولی۔ دلفروش۔ بھول بھلیاں۔ بکاؤلی۔ چلتا پرزہ۔ ان کی ڈراماتی تصانیف ہیں۔ واقعات انیس ادبی کتاب ہے۔ اس میں میر انیس کے سوانح عمری نہایت عمدگی سے لکھے ہیں۔

بیتاب دہلوی احسن کے بعد کمپنی کی ڈراما نگاری پنڈت نرائن پرشاد بیتاب کے سپرد ہوئی۔ وہ فن شعر میں سردار محمد خاں طالب تلمیذ غالب کے شاگرد تھے۔ کبھی کبھی اپنا کلام نظیر حسین سخا کو بھی دکھاتے تھے۔ طالب کمپنی کے باقاعدہ ملازم تھے۔ اور بمبئی میں رہتے تھے۔ ایک رسالہ "شیکسپیئر" بھی نکالتے تھے۔

اس میں مشہور ڈراموں کے ترجمے چھپا کرتے تھے۔ قتل بے نظیر۔ مہابھارت۔ زہری سانپ۔ فریب محبت۔ رامائن۔ گورکھ دھندا۔ پتنی پرتاپ۔ کرشن سداما۔ ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ قتل بے نظیر ان کا سب سے پہلا اور مقبول ڈراما ہے۔

بیتاب ڈرامانویسی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ مہابھارت میں انہوں نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے دلچسپ واقعات نہایت عمدگی سے دکھائے ہیں۔ ان کے ہندی دوہے اور گیت نہایت شیریں۔ جذبات عمیق اور کیریکٹر زبردست ہیں۔ وہ اصول ڈرامانگاری کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کے تماشوں کی شہرت زیادہ تر اس وجہ سے بھی ہوئی کہ حسین ترین اور مشہور عورتیں ان میں کام کرتی تھیں۔

اعتراضات (۱) دروپدی کا سری کرشن کی خون آلود انگلی کے لئے اپنی ساڑھی پھاڑنا خلاف تہذیب ہے (لیکن یہ عمل محبت اور اعتقاد کا ثبوت ہے) (۲) جنت اور دوزخ نہایت بھونڈے طریقے سے دکھائے ہیں (۳) نثر مقفی کی بہتات ہے۔ جو بعض وقت بہت بری معلوم ہوتی ہے (۴) ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بکثرت ہیں۔ اور وہ کانوں پر گراں گذرتے ہیں (۵) اشعار کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ مثلاً غصے کے وقت شعر پڑھنا خلاف فطرت معلوم ہوتا ہے (۶) بعض ایسی باتیں لکھدی ہیں۔ جو سناتن دھرمیوں کو ناگوار معلوم ہوتی ہے (شاید اس لئے کہ وہ آریہ کمپنی کے ملازم تھے)

نیو الفرڈ کمپنی یہ کمپنی محمد علی ناخدا نے جاری کی تھی۔ مشہور کامک ایکٹر سہراب جی اس کے مینجر تھے سہراب جی بعد میں حصہ دار بھی ہو گئے تھے۔ یہ کمپنی ادھر ادھر پھر کر احمد آباد میں مقیم ہو گئی۔ عباس علی جو بعد میں جوبلی کمپنی میں چلے گئے۔ اور امرت لال کیشو اس کے مشہور ایکٹر تھے۔ امرت لال اور مس گوہر میں بہت محبت تھی۔ یہ دونوں بھی پارسی ناٹک منڈلی مملوکہ فرام جی میں چلے گئے اور امرت لال اس کمپنی کے مینجر ہو گئے۔ انہوں نے چند آدمیوں کی شرکت سے اپنا ڈراما امرت نکالا۔ افسوس کہ ان کا انتقال بے اعتدالیوں کی وجہ سے عین جوانی میں ہو گیا۔

آغا حشر کاشمیری آغا حشر کشمیری الاصل تھے۔ ان کا خاندان بنارس میں شالوں کی تجارت کرتا ہے حشر امرت سر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بہت سے ڈرامے نیو الفرڈ کے لئے تصنیف اور ترجمہ کئے اس کمپنی سے قطع تعلق کے بعد انہوں نے اپنی شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی جاری کی جو نقصان اٹھا کر

سیالکوٹ میں بند ہو گئی۔ اس کے بعد حشر کلکتہ میں میڈن کے ہاں معقول تنخواہ پر فلم ایکٹر ہو گئے اور وہ اس کے لئے آخر تک کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ شہیدِ ناز۔ مرید شک۔ اسیر حرص۔ ترکی حور، خوبصورت بلا۔ سفید خون وغیرہ اردو ڈرامے اور سور داس۔ سیتا بن باس۔ گنگا ترن ان کے ہندی ڈرامے بہت مشہور اور مقبول ہیں۔

آغا حشر کو لوگ اردو کا مارلو کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے ڈراموں میں مارلو کی خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ وہ اپنے کیریکٹروں میں جذبات بہت کثرت سے دکھاتے ہیں، اور نثر و نظم دونوں کے استاد ہیں۔ ان کا انداز بیان اس جگہ خوب معلوم ہوتا ہے۔ جہاں دو مخالف کیریکٹروں کا مکالمہ کراتے ہیں۔

آغا حشر کے ڈراموں میں عیب وہی ہیں۔ جو مارلو کے ہاں ہیں۔ یعنی جذبات کی بہت شدت ہوتی ہے۔ رنگوں میں تال میل کا خیال نہیں رکھتے۔ دو مختلف پلاٹ قائم کرتے ہیں۔ جن سے توجہ منتشر اور خاتمہ میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر جگہ شعر کو ایکٹ پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ طرز اصول ڈراما کے خلاف ہے۔ کبھی کبھی بازاری مذاق بھی شامل کر لیتے ہیں۔ جس سے سین کا اثر جاتا رہتا ہے۔ بعض واقعات میں بیجا عجلت کھیل بگاڑ دیتی ہے۔ مگر باوجود ان تمام عیوب کے وہ ہندوستان کے بہترین ڈراما نگار تھے۔ تاریخ وفات ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء۔

دوسری کمپنیاں (۱) اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی گذشتہ صدی کے آخر میں قائم ہوئی۔ ۱۹۰۱ء میں لاہور میں جل گئی۔ مگر اپنے مالک آردشیر جی کی بدولت پھر جاری ہوئی۔

(۲) جوبلی کمپنی دہلی کو دہلی کے کسی امیر شخص نے عباس علی ایکٹر کے زیر اہتمام جاری کیا تھا۔ عباس علی گلرو زینہ اور جام جہاں نما میں پارٹ کرتے تھے۔

(۳) بھارت دیا کل کمپنی میرٹھ۔ اس میں بدھ بھگوان کا ڈراما خوب ہوتا تھا۔ تھوڑے عرصے بعد احمد آباد میں ٹوٹ گئی۔

(۴) لائٹ آف انڈیا اور (۵) امپیریل کمپنی۔ ان میں حافظ محمد عبداللہ اور مرزا نظیر بیگ اکبر آبادی کام کرتے تھے۔ جشن پرستان۔ انجام ستم۔ ستم ہامان وغیرہ ڈرامے حافظ صاحب نے لکھے۔ اور مرزا نظیر بیگ نے نل دمن۔ بہار عشق۔ فسانۂ عجائب۔ ماہی گیر وغیرہ تصنیف کئے۔

آخر اُنیسویں صدی کے مشہور ڈرامانویس	مذکورہ بالا ڈرامانویسوں کے علاوہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں ذیل کے مُصنفین کے مفصلہ ذیل ڈرامے موجود ہیں۔ غلام حسین ظریف کا انجام سخاوت

(۱۸۸۹ء) محمد عبدالوحید قلیس کے انجام نیک و بد اور جلسہ پرستان۔ فقیر محمد تیغ کے انجام اُلفت اور بے نظیر و بدرِ منیر۔ فیروز شاہ خاں کا بھول بھلیاں۔ احمد حسین وآفر کا بلبل بیمار۔ میر امانت اللہ میر عبدالماجد و مقصود علی۔ امداد علی کا البرٹ بل (اُردو کا سب سے پہلا سیاسی ڈراما) اور جہانگیر ترجمہ ہیملٹ۔

شروع بیسویں صدی کے بعض ڈرامانویس	(۱) منشی غلام علی دیوانہ مُصنّف تائید یزدانی۔ جہرجیا الگزنڈر کمپنی میں تھے، (۲) منشی محمد ابراہیم محشر انبالوی شاگرد آغا حشر۔ آتشیں ناگ۔ نگاہ ناز اور خود پرست

کے مُصنّف ہیں (۳) منشی رحمت علی مُصنّف دردِ جگر و باوفا قاتل پہلے البرٹ کمپنی کے مینجر تھے۔ اب پارسی تھیٹریکل کمپنی کے ڈائرکٹر ہیں (۴) دوارکا پرشاد اُفق رام ناٹک جیسے مشہور ڈرامے کے مُصنّف ہیں (۵) مرزا عباس مُصنّف نورجہاں و شاہی فرمان (۶) آغا شاعر دہلوی مُصنّف حورِ جنّت (۷) لالہ کشن چند زیبا اور (۸) لالہ نانک چند ناز۔ یہ دونوں بھائی اکثر ڈراموں کے مُصنّف ہیں۔ ان کے ڈراموں میں غیر مانوس ہندی الفاظ کی کثرت ہے (۹) لالہ کنورسین ایم اے چیف جسٹس ہائیکورٹ کشمیر سابق پرنسپل لاء کالج لاہور ڈراما کے مشہور نقاد اور برہمانڈ ناٹک کے مُصنّف ہیں۔ اس ڈرامے میں آسمانی ستاروں کے کیریکٹر دکھائے ہیں (۱۰) بشمبر سہائے بیاکل مُصنّف بدھ دیو۔ یہ مشہور ڈراما ان عیبوں سے پاک ہے۔ جو اُردو ڈراموں میں عموماً پائے جاتے ہیں، مُصنّف مذکور بھارت بیاکل کمپنی کے رُوح رواں تھے۔ جو میرٹھ میں قائم ہوئی تھی۔ ایک زمانہ میں یہ کمپنی شمالی ہند میں بہت مشہور تھی۔ اس کے ایکٹر اکثر پڑھے لکھے اور اعلیٰ طبقے کے لوگ تھے۔ علی اظہر اس کے مشہور ایکٹر تھے۔ منشی جانیشر پرشاد مائل دہلوی ایڈیٹر رسالہ زبان نے چند گیت اور تیغ ستم اسی کمپنی کے لئے لکھے تھے (۱۱) حکیم احمد شجاع بی۔ اے اسسٹنٹ سیکرٹری لیجسلیٹو اسمبلی پنجاب نے باپ کا گناہ۔ بھارت کا لال۔ جانباز وغیرہ لکھے (۱۲) سید امتیاز علی تاج بی۔ اے مُصنّف انارکلی و دُلہن وغیرہ (۱۳) سید دلاور علی شاہ مُصنّف پنجاب میل۔ یہ معمولی ڈراما ہے، (۱۴) احمد حسین خاں مُصنّف حُسن کا بازار (۱۵) رادھے شیام۔ اکثر مذہبی ڈرامے لکھتے ہیں، (۱۶) سُدرشن۔ بہت سے مشہور اور مقبول ڈراموں کے مُصنّف ہیں۔

ادبی ڈرامے اُردو میں ادبی ڈراموں کی بہت کمی ہے۔ بہرحال حسب ذیل ڈرامے قابل ذکر ہیں:۔

میکفرسن و لوسی، اور قاسم و زہرہ مؤلفہ شوق قدوائی۔ شہید وفا مُصنّفہ شرر۔ وکرم اروسی ترجمہ عزیز مرزا۔ رُوس و جاپان مؤلفہ مولانا ظفر علی خاں۔ تسخیر فرانس اور جولیس سیزر (شیکسپیئر) مترجمہ سید تفضل حسین نصیر۔ معشوقہ فرنگ مترجمہ جوالا پرشاد برق۔ بیداری مؤلفہ حکیم اظہر ایڈیٹر تحریک، محمد عُمر و نور الٰہی صاحبان، ناٹک ساگران کی مشہور تصنیف ہے۔ اس میں تمام مُلکوں کے ڈرامے کی تاریخ لکھی ہے جو کسی قدر نامکمل ہے۔ ذیل کے دلچسپ ڈرامے ان کی تصانیف ہیں:۔

(۱) رُوح سیاست (ابراہیم لنکن پریسیڈنٹ امریکہ کے حالات (۲) جان ظرافت (ترجمہ مولیر) اس میں کنجوسوں کا خُوب خاکہ اُڑایا ہے (۳) قزاق (ترجمہ شلر) (۴) بگڑے دل (ترجمہ مولیر) (۵) ظفر کی موت (ترجمہ میٹرلنک)

سوشل ڈرامے (۱) زود پشیمان مُصنّفہ عبدالماجد دریا آبادی۔ اس میں کم عُمری کی شادیوں کی قباحتیں دکھائی ہیں (۲) راج دُلاری اور مُراری دادا مُصنّفہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی ایم۔ اے یہ ڈرامے اصلاح معاشرت کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان میں مرد عورتوں کے صحیح خیالات اور انکی کمزوریاں نہایت خُوبی سے دکھائی ہیں (۳) میوۂ تلخ مُصنّفہ شرر۔ اس میں پردے کی سختی کی خرابیوں کو نہایت عُمدگی سے دکھایا ہے۔ موجودہ زمانے میں معاشرتی مسائل پر اکثر ڈرامے لکھے جاتے ہیں جن میں عموماً مغربی تہذیب کا خاکہ اُڑایا ہے۔

سیاسی ڈرامے سیاسی ڈراما سب سے پہلے منشی اُمراؤ علی نے البرٹ بل (۱۸۹۳ء) پر لکھا اور ایک ڈرامے میں کانگرس کے مقاصد کو دکھایا۔ ان میں کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ ترک موالات کے زمانے میں بہت سے سیاسی ڈرامے لکھے گئے جن میں سے اکثر ممنوع قرار دیئے گئے۔ ان میں منشی کشن چند زیبا کا زخمی پنجاب خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اُردو ڈرامے کی ترقی میں مختلف لوگوں نے کیا حصہ لیا اُردو ڈرامے کی بُنیاد اندر سبھا سے پڑی تھی۔ مگر اس میں پلاٹ کی تقسیم اور کیریکٹر کی تنظیم نہیں تھی۔ اس کے بعد ظریف نے جدید رنگ کے ڈرامے کی بُنیاد ڈالی۔ انہوں نے اپنے ڈرامے محض دلچسپی اور تفریح کے لئے لکھے اور اس مقصد میں وہ پورے کامیاب ہوئے۔ ان کے پلاٹ۔ کیریکٹر۔ نظم۔ نثر وغیرہ ادبی

حیثیت سے بے وقعت ہیں۔ لیکن پھر بھی انہوں نے ڈرامے کی ترقی اور اشاعت میں بہت کوشش کی۔

حافظ عبداللہ اور نظیر بیگ نے ظریف کی پیروی میں اپنے تماشوں میں دو دو پلاٹ الگ الگ قائم کئے۔ طالب اور احسن نے ڈرامے کی زبان کو درست کر کے دونوں پلاٹوں کو ایک کر دیا۔ اور اسی میں بعض کیریکٹروں سے مسخرے کا کام لیا۔ شروع میں معمولی گفتگو مقفیٰ نثر میں ہوتی تھی۔ گفتگو کو زوردار کرنے کے لئے شعر بھی استعمال ہوتے تھے۔ اور گیت زیادہ تر ہندی میں تھے۔ اب ڈراما میں کیریکٹر سازی۔ جذبات نمائی اور اختتام قصہ پر بھی توجہ دی جانے لگی۔ گویا اب ڈراما اُپیرا کی حد سے نکل کر ڈرامے کی شکل میں آگیا۔

طالب نے سب سے پہلے ہندی الفاظ کی جگہ فارسی الفاظ استعمال کئے۔ حشر نے پھر وہی دو پلاٹوں کی طرز اختیار کر لی۔ بیتاب کے ڈرامے بہترین کہے جا سکتے ہیں ان کے نقائص کو بشمبر سہائے نے اپنے ڈراما بدھ دیو میں دور کیا۔ ان کی زبان میں ہندی الفاظ کی کثرت ہے، خیالات پاکیزہ اور انداز بیان دلکش ہے۔ مسٹر کنور سین نے برہمانڈ ناٹک میں ستاروں کے کیریکٹر دکھائے۔ کیفی نے سوشل مضامین پر ڈرامے لکھے۔ اب سیاسی ڈراموں کا بھی رواج ہو رہا ہے۔ اور یہ زیادہ تر بنگالی ناٹکوں کے ترجمے ہیں۔

ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ بدھ مت کے ساتھ سنسکرت ڈراما بھی زوال پذیر ہو چکا تھا۔ نیز سنسکرت کے ناٹکوں کے جو ترجمے انگریزی میں مسٹر ولیم۔ پروفیسر ولسن اور مونیر ولیمس وغیرہ کئے تھے۔ وہ انگریزی سے ناواقفیت کے باعث اُردو دانوں کے لئے بیکار تھے۔ سیکسینا صاحب لکھتے ہیں۔ کہ "اردو ڈراما کا صحیح وجود اس وقت ظہور میں آیا۔ جب اہل مغرب کا اثر اس ملک پر ہونے لگا۔ اس زمانے میں سنسکرت کے انگریزی ترجموں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا۔" سیکسینا صاحب کے اس بیان سے بہت سے محققین کو اتفاق نہیں۔ گذشتہ صفحوں میں مجملاً اس پر بحث ہو چکی ہے۔

ابتدائی ڈراموں کے نقائص

تھیٹریکل کمپنیاں پارسیوں نے کاروباری حیثیت سے جاری کی تھیں، اس وقت تماشے کی عمدگی کا خیال کسی کو نہ تھا۔ کسی پرانے قصے یا افسانے کو توڑ مروڑ کر

کچھ اشعار اور مذاق کی باتیں شامل کر کے ڈراما بنالیا جاتا تھا۔ڈراما نگار بھی کچھ ایسے پڑھے لکھے نہ تھے۔وہ عام طور پر ادنیٰ درجے کے ایکٹر تھے۔جو عوام کے مذاق کو دیکھ کر تُک بندی کر لیتے تھے۔ان کے ڈراموں کی عبارت پھُس پھُسی تھی۔اور اشخاص ڈراما بجائے نثر کے ادنیٰ درجے کی نظم میں باتیں کرتے تھے۔پلاٹ اور کیریکٹر کا کہیں پتہ ہی نہ چلتا تھا ایکشن بالکل ناہموار ہوتا تھا۔نیز مذاحیہ اور المیہ یک جا کر دیا جاتا تھا۔اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی یہ ڈرامے گرے ہوئے ہوتے تھے۔ایکٹریسیں زیادہ تر رنڈیاں ہوتی تھیں، اور ناممکن الوقوع باتیں دکھادی جاتی تھیں۔لطف یہ ہے کہ عوام ان ڈراموں سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔

کچھ عرصے بعد انگریزی ڈراموں کی طرف عوام متوجہ ہوئے۔اب شیکسپیئر کے ڈرامے خاص طور پر پسند کئے جانے لگے۔ان کی مقبولیت اس قدر بڑھی کہ ایک ڈرامے کے چار چار پانچ پانچ ترجمے ہو گئے۔ان میں انگریزی ناموں کی جگہ ہندوستانی نام ڈال دیئے جاتے تھے لیکن انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے اکثر ترجمے بالکل غلط ہوتے تھے۔ علامہ عبداللہ یوسف علی لکھتے ہیں۔کہ اُردو ڈرامے نے انگریزی ڈرامے کی اندھا دُھند تقلید کی۔چنانچہ انگریزی ڈراموں کی طرح وہ بھی پُرانی رسم و رواج پر بڑی بیباکی سے کاری ضرب لگانے لگے۔اس تقلید کی بدولت انگریزی دُھنوں سے ہندوستانی موسیقی کو بھی سخت نقصان پہنچا۔

انگریزی اثر کے علاوہ ایکٹروں کا غیر تعلیم یافتہ ہونا اور ادنیٰ درجے سے تعلق رکھنا، ڈراما نویسوں کی معمولی لیاقت۔تماشائیوں کا اچھے بُرے میں امتیاز نہ کرنا۔اور تھیئٹر کے مالکوں کا انہی کو خوش کرنا جن سے زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔یہ تمام خامیاں اُردو ڈرامے کیلئے بہت نقصان دہ ثابت ہوئیں۔

موجودہ ڈراموں میں اصلاح اور ترقی

موجودہ زمانہ میں اُردو ڈراما بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔پُرانے قصّوں کے علاوہ اب نہایت دلچسپ اور نئے قصّے سٹیج پر آرہے ہیں، پولیٹیکل اور سوشل ڈرامے بھی بہت مقبول ہیں۔ڈراموں کی اخلاق آموزی میں نمایاں

فرق ہے۔ نفسیات کی طرف زیادہ توجہ ہے۔ غرض ڈرامے میں بحیثیت مجموعی پہلا سا بے تکاپن نہیں رہا۔ خیالات۔ الفاظ۔ نظم۔ نثر۔ گیت۔ ابتدا۔ انجام۔ کامک۔ تنظیم اور تقسیم وغیرہ میں معتدبہ ترقی ہو رہی ہے۔ گویا جدید اور قدیم ڈراموں میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

لیکن ان عام ترقیوں کے باوجود اصلاح کی بہت گنجائش ہے۔ مثلاً الفاظ میں بجائے ڈینگ کے معنویت اور اصلیت ہونی چاہیئے۔ عام طور پر ڈراموں میں مقفیٰ عبارت ہوتی ہے۔ اس کی جگہ اب صاف اور سلیس عبارت کی ضرورت ہے۔ پلاٹ کی ترتیب اور تنظیم میں بھی بہت کچھ اصلاح کی گنجائش ہے۔ مذاق نہایت پاکیزہ اور شائستہ ہونا چاہیئے ڈراما نویسی نا اہلوں کے ہاتھ میں خراب ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے۔ کہ وہی لوگ ڈرامے لکھیں، جو اس کام کے حقیقت میں اہل ہیں۔ ایسے ڈرامے دُوسری زبانوں سے ترجمہ کرنے چاہئیں۔ جو ڈرامے کا صحیح معیار قائم کریں۔ سنسکرت کے اعلیٰ ڈراموں کو ترجمہ کیا جائے۔ جن سے گزشتہ زمانے کی ڈراما نویسی کی حقیقت معلوم ہو۔ کیونکہ ایک زمانہ میں سنسکرت ڈرامہ ہندوستان میں ترقی کر کے بلند ترین مدارج پر تھا۔ نیز دُوسری زبان کے ڈراموں سے ہم کو وہی چیزیں اخذ کرنی چاہئیں جو ہماری سوسائٹی سے میل کھائیں، اور یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ ترجموں کی بہتات سے طبع زاد تصانیف کو نقصان نہ پُہنچے۔ ضرورت ہے کہ زمانۂ حال کی خرابیوں کی اصلاح کے لئے دلچسپ سوشل ڈرامے تصنیف کئے جائیں۔ اور ان کا مواد اپنی سوسائٹی سے اخذ کیا جائے۔ اس فن اور ایکٹروں کو عزّت کی نظر سے دیکھا جائے۔ اور رسماً اور مذہباً نکتہ چینی نہ کی جائے۔ امیر لوگ اس فن کی سرپرستی کریں۔ سیکسینا صاحب لکھتے ہیں کہ "ڈرامے کی بعض ذلیل باتیں رسم پردہ اُٹھنے پر ہی دُور ہو سکتی ہیں، کیونکہ موجودہ صُورت میں سچے جذبات عشق کا اظہار ناممکن ہے"۔

علّامہ عبداللہ یُوسف علی فرماتے ہیں۔ اُردو ڈراما بہت زوردار ترقی کے آثار پیدا کر چکا ہے۔ اس میں ایک زبردست وسیلہ قومی ترقی کا نظر آتا ہے۔ اب ہمارے ہاں تاریخی اور سیاسی ڈراما نگاری کی بہت ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کیونکہ اسی میں

ڈرامے کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ ڈرامے کی ترقی کے لئے وہ تجویز کرتے ہیں۔ کہ شیکسپیر کے ڈراموں کی تقلید کی جائے۔ کیونکہ انہی کی تقلید سے اردو ڈرامے کا عروج ممکن ہے۔

(۲۰)

۱۹۴۶ء

زبان اُردو کی خاص خوبیاں اور اُسکے متعلق قیمتی آراء

فصیح اور شیریں زبان اس بات پر سب کو اتفاق ہے۔ کہ اردو نہایت فصیح بلیغ اور شیریں زبان ہے اس میں خیالات اور حسیات کے نازک ترین فرق کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ اس میں دنیا بھر کی زبانوں کے بیشمار الفاظ شامل ہیں۔ اس میں دوسری زبانوں کا ذریعۂ تعلیم بننے اور ادب تمدن اور تہذیب کی ضروریات کو نہایت موزونیت اور عمدگی سے پورا کر سکنے کی قابلیت موجود ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کا ثبوت ہندو مسلمانوں نے اپنی قومی زبانوں کو چھوڑ کر اس زبان کو اختیار کیا ہے۔ اس لئے یا ہمی اتحاد کا بہترین عملی ثبوت ہے۔

ہندوستان کی عام زبان صحیح معنوں میں تمام ہندوستان کی زبان یہی زبان ہے۔ اکثر علاقوں میں جہاں اردو نہیں بولی جاتی وہاں سمجھی ضرور جاتی ہے۔ ہندوستان کی کسی اور زبان کو یہ قبولیت حاصل نہیں۔ اکثر غیر ممالک میں بھی اس کو لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے اردو کو ہندوستان کی "لنگوا فرانیکا" کہنا بجا ہے۔

ایک وسیع زبان اردو ایک نہایت وسیع زبان ہے۔ اس میں بے شمار زبانوں کے الفاظ بکثرت شامل ہیں۔ جن سے نئے الفاظ و محاورات و اصطلاحات بنانے میں آسانی ہو گئی ہے۔ آئے دن مناسب تغیر اور تبدل کے بعد دوسری زبانوں کے الفاظ اس میں شامل ہو رہے ہیں۔ سیکسینا صاحب لکھتے ہیں "افسوس ہے۔ کہ آجکل عربی سے زیادہ الفاظ لئے جا رہے ہیں۔ جن سے زبان غیر مطبوع ہوتی جاتی ہے" یہی الزام ہندی والوں پر عائد ہوتا ہے۔

یورپین محققین کی رائیں (۱) جے بیمس مُصنّف "انڈین فلالوجی" "اُردو ایک وسیع فصیح معنی خیز جامع نہایت ترقی کرنے والی زبان ہے اور یہ شائستہ صُورت اس وسیع بولی کی ہے جو ہندوستان میں رائج ہے"۔[۱]

(۲) گارساں دی تاسی مشہور فرنچ مستشرق۔ "اُردو ہندوستان میں اسی طرح بکثرت استعمال میں آتی ہے جس طرح یورپ میں فرنچ۔ ہندوستان کی عدالتوں میں علمی ادبی تصانیف میں، راگ راگنیوں میں اور عام گفتگو میں اُردو ہی کام آتی ہے۔ اہل یورپ سے بھی اسی میں بات چیت کی جاتی ہے بعض کا خیال ہے۔ اُردو کو ہر مقام کے ہندو نہیں سمجھ سکتے۔ مگر یہی حالت ہر مُلک میں ہر زبان کی ہے۔ اُردو کو عدالتوں اور دفتروں سے نکالنے کے لئے یہ وجہ معقول معلوم نہیں ہوسکتی"۔

(۳) جارج کیمبل مُصنّف "انڈیا ایز اٹ مائٹ بی"۔ "میرے نزدیک یہ نہایت ہی مناسب ہے کہ ہندوستانی کو تمام سکولوں کی زبان قرار دیا جائے کیونکہ عام زبان کے بغیر کام چلنا مُشکل ہے۔ انگریزی کو ہندوستان کی عام زبان بنانا محال ہے۔ اُردو ہندوستان کی عام زبان کہلائے جانیکی مستحق ہے کیونکہ تمام ہندوستانی اور انگریز اس کو سمجھتے اور بولتے ہیں۔ اس میں خاص خُوبی یہ ہے کہ دُوسری زبانوں کے الفاظ وہ اس طرح جذب کرلیتی ہے۔ کہ اس کے اپنے الفاظ معلوم ہوتے ہیں"۔

(۴) مسٹر ونسنٹ سمتھ مُصنّف ہسٹری آف انڈیا۔ "اُردو زبان انگریزی سے اپنی سادگی قواعد صرف ونحو کی نرمی اور کثرت الفاظ کے اعتبار سے بہت مشابہ ہے، اور ضرور اس قابل ہے کہ تمام مطالب عام اس سے کہ وہ ادبی ہوں یا فلسفیانہ یا سائنٹفک اس میں ادا کئے جاسکیں"۔

نام نہاد کم مائگی اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ اُردو کے پاس کوئی قابل فخر سرمایۂ ادب ہے، نہ اس کی ترقی اور ارتقا کی کوئی خاص تاریخ۔ جب اس کا مقابلہ کلاسیکل (قدیم) اور متمدن مغربی زبانوں سے کیا جاتا ہے۔ تو اس کی بے مائگی اور بے حقیقتی پوری طرح معلوم ہو جاتی ہے۔

ان اعتراضات کا جواب یہ ہے۔ کہ اُردو کوئی قدیم زبان نہیں۔ کسی جدید ادب سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قدیم زبانوں کی طرح ادبی خزانوں سے مالا مال ہو، خلاف عقل ہے۔ اس کی ادبی زندگی فارسی سے الگ رہ کر بہت کم گذری ہے۔ یورپین محقق اس کی طرف کم متوجہ ہوتے رہیں،

---

[۱] جرنل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی جلد ۳۵ ۱۸۶۶ء۔

اور ہندوستانی ان سے بھی کم۔ اگر اردو اسی طرح ترقی کرتی رہی تو تھوڑے عرصے میں وہ دُنیا کی بہترین زبانوں سے مقابلہ کرسکے گی۔ اب بھی ہندوستان کی کوئی اور زبان اس کی مدِ مقابل نہیں

اقسامِ ادب | اُردو ادب دو قسموں میں تقسیم ہوسکتا ہے (۱) مستقل تصانیف (۲) تراجم۔

(۱) مستقل تصانیف | مستقل تصانیف نظم و نثر ناول اور ڈراما پر مشتمل ہیں۔ نظم اُردو کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اور نہایت ہی پُر لُطف ہیں۔ اس میں پند و نصائح۔ اخلاق۔ حُسن و عشق کے افسانے، مرثیے حمد و نعت۔ بادشاہوں اور رئیسوں وغیرہ کی مدح اور ذم۔ زمانہ حال کی نیچر کی نظمیں، غرض دُنیا زمانے کے مضامین شامل ہیں۔

(۲) تراجم | دُنیا کی بہترین نظم و نثر کی کتابیں روزانہ اُردو میں ترجمہ ہو رہی ہیں۔ اس طرح اُردو کا سرمایہ بہت بڑھ رہا ہے۔ مثال کے طور پر ہم ذیل کے نام پیش کرسکتے ہیں۔

ہندوستانی کتابوں میں مہابھارت۔ رامائن۔ شکنتلا۔ میگھ دوت۔ وکرم اُروسی۔ رِتو سنگھار۔ ٹیگور کی کتابیں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ شیکسپیئر کے ڈرامے۔ شیریڈن۔ ڈینٹی گوئٹے۔ لانگ فیلو۔ سودے۔ شیلی۔ بائرن۔ ورڈزورتھ اور ٹینی سن کی مشہور نظمیں اُردو کا جامہ پہن چکی ہیں۔ افسانوں اور ناولوں میں رینالڈز۔ سکاٹ۔ میری کاریلی اور کانن ڈائل کے ترجمے بہت مقبول ہیں۔ تھوڑے عرصے سے سیٹون سن۔ رائڈر ہیگرڈ۔ آسکر وائلڈ۔ برناڈ شا۔ اور ایچ۔ جی ویلس کو بھی لوگ پسند کرنے لگے ہیں۔ نثاروں میں مکالے کارلائل، سمائیلس اور لیک کی تصانیف کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ فلسفہ اور فلسفیات میں افلاطون اور ارسطو کی اکثر کتابیں۔ چانکیا کے اقوال۔ سنیکا کے فلسفیانہ خیالات۔ برکلے کے مقالات، بیکن۔ ہیوم۔ کینٹ۔ مل۔ سپنسر جیمس۔ سٹاؤٹ کی اکثر و بیشتر تصانیف اُردو میں آچکی ہیں۔ تاریخ اور سوانح عمریوں میں پلوٹارک کی یونانیوں اور رُومیوں کی مشہور کتابیں۔ راسن بیری۔ ڈوزی۔ والیس۔ ایبٹ۔ گرین۔ ونسنٹ سمتھ۔ الفنسٹن۔ مالکم۔ گبن وغیرہ کی مشہور کتابوں کے ترجمے اُردو میں موجود ہیں۔

سیاسیات اور معاشیات میں ارسطو۔ مل۔ بیل۔ مورلی۔ لارڈ کرزن۔ ہزینی۔ شوسٹر۔ بلنٹ۔ سیلی۔ ولسن۔ پالک۔ سجوک۔ جیونس۔ مارشل۔ ماری سن وغیرہ کی تصانیف کے تراجم

قابل ذکر ہیں۔ فلسفیانہ تاریخوں میں گیزو۔ بکل۔ لیبان۔ لیکی۔ ڈریپر کی کتابیں ترجمہ ہو گئی ہیں۔ فلسفہ تعلیم میں اسپنسر۔ بین۔ فروبیل۔ پستالوزی۔ ہربرٹ۔ مانٹیسوری کی کتابیں اور اور سائنس میں ڈریپر۔ ڈارون۔ ہیکل ہکسلی۔ لائل۔ گیکی۔ ٹنڈل۔ بوسی۔ کیلون۔ میکسول۔ کروک اور سر آلیور لاج کی جدید تحقیقات اردو میں منتقل ہوئی ہیں۔ قانون انجینری اور طب کی کتابیں بھی حسب ضرورت ترجمہ ہو رہی ہیں۔

مذہبی لٹریچر اہل عرب اور فارس کا پورا اسلامی ادب اور سنسکرت اور ہندی کا ایک معتدبہ حصہ ترجمہ ہو چکا ہے۔ مذہبی کتابوں میں قرآن۔ گیتا پران۔ مہابھارت اور رامائن کے بیشمار ترجمے ہیں۔ اسی طرح ہر مذہب کے اکابروں اور بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کے مفصل حالات بھی اردو میں آرہے ہیں۔

ادب اردو کے سرچشمے یوں تو ہندوستان میں سینکڑوں انجمنیں اردو ادب کی ترقی اور اشاعت کے لئے قائم ہیں۔ لیکن (۱) عثمانیہ یونیورسٹی اور اس کا دارالترجمہ (۲) انجمن ترقی اردو دہلی اور (۳) دارالمصنفین اعظم گڑھ وغیرہ ادب اردو کے قابل فخر سرچشمے ہیں۔

ہندوستانی اکیڈیمی قائم شدہ ۱۹۲۷ء حکومت ممالک متحدہ نے اپنے صوبے میں اردو ہندی کی ترقی کے لئے ہندوستانی اکیڈیمی قائم کی ہے۔ اس کے خاص مقاصد حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مفید مضامین پر بہترین کتابوں کے لئے مقابلے کے انعامات تجویز کرنا۔

(۲) مفید اردو ہندی کتابوں کے ترجمے اپنے تنخواہ دار مترجموں سے کرانا اور ان کو اپنی صرف پر چھپوانا۔

(۳) اردو ہندی کی ترقی کی غرض سے عمدہ تصانیف اور تراجم کے لئے انجمنوں۔ یونیورسٹیوں یا مستحق اشخاص کو مالی امداد دینا۔

(۴) قابل اہل قلم کو اکیڈیمی کی اعزازی ممبری کے لئے منتخب کرنا۔

ہندوستانی اکیڈیمی کا قیام سر ولیم میرس گورنر ممالک متحدہ کی ادبی دلچسپی کی بدولت عمل میں آیا۔ اور وزیر تعلیم رائے راجیشوربلی صاحب اور منشی دیانرائن نگم نے اس سکیم کو بہت جانفشانی سے تیار کیا۔ یہ اکیڈیمی اپنے سامنے درخشندہ مستقبل رکھتی ہے۔ گورنمنٹ

اور بہت قابل حضرات پوری ہمدردی سے اس کی سرپرستی کر رہے ہیں۔

اُردو کا رسم الخط حیدر آباد دکن میں اُردو کے رسم الخط کی اصلاح کے لئے ایک مُدت سے بڑی بڑی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اس غرض سے اکثر کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ اگرچہ ابھی تک کوئی تجویز عمل میں نہیں آئی۔ لیکن اُمید کی جاتی ہے کہ ماہرین کی توجہ ایک نہ ایک دن موجودہ رسم الخط کی خرابیوں کو ضرور رفع کر دے گی۔

(ماخوذ)

شیخ مُبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور نے عالمگیر الیکٹرک پریس تحصیل بازار لاہور میں
باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر چھپوائی